شاہراہِ ادب

سی۔ آر۔ رنجن ایم۔ اے

عطر چند کپور اینڈ سنز

دہلی۔ انبالہ۔ آگرہ۔ ناگ پور۔ جے پور

قیمت تین روپے

فہرست مضامین

حصہ نثر

حصۂ نظم

دیباچہ

اہل نظر سے مخفی نہیں کہ اور دیسی زبانوں کی طرح اُردو بھی ہماری ہی زبان ہے۔ آریہ زبانوں یعنی سنسکرت اور بھاشا سے اس کا جنم ہوا ہے۔ اس کی صرف و نحو اور بناوٹ سب ہندوستانی ہے۔ یہ سرزمین ہندوستان کی پیداوار ہے۔ اور اس کی تعمیر میں مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کا زیادہ حصہ ہے۔ ہرچند کہ سیاسی اُلجھنوں کے باعث ہمارا ایک پرجوش طبقہ اس کی مخالفت پر کمربستہ ہے۔ ہم اس طرز عمل کو زیبا اور مناسب نہیں کہہ سکتے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہماری اس روش کے لئے ہمارے مسلمان دوست بہت حد تک ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے عربی اور فارسی الفاظ کی بیجا بھرمار سے اُردو زبان کا بھلا نہیں کیا۔ بلکہ اپنے اس طریق کار سے اُسے قبول عام کی سند سے محروم کر دیا ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں اُردو عوام کی زبان نہیں رہی ہے اور غیر زبانوں کی اس قدر دست نگر ہو کر رہ گئی ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں رہی۔ مسلمانوں کی اس غلط اور متعصبانہ روش کا ردِ عمل یہ ہوا ہے کہ دوسری جانب سے اُردو میں سنسکرت

اور بھاشا کے مشکل اور ادق الفاظ کی بھرتی شروع کر دی گئی ہے۔ جس کا مضحکہ خیز نتیجہ یہ ہوا کہ دو قسم کی زبانیں بن گئی ہیں۔ ایک عربی اردو جس میں "بھوک ہڑتال" کی بجائے "مقاطعہ جوعی" استعمال کرتے ہیں۔ جسے صرف مولوی صاحب ہی سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری سنسکرتی اردو جس میں "اندر آنے کی اجازت نہیں" کی بجائے "پردیش ادھکار نہیں" لکھتے ہیں جو صرف شاستری جی کو سمجھ آسکتی ہے۔ بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں گمراہ روشوں کو ترک کر دیا جائے۔ افراط و تفریط کا غلط راستہ چھوڑکر اعتدال کا صحیح راستہ اختیار کیا جائے۔ اور ایک آسان، رواں، سیدھی سادھی و سہل سلیس زبان کی تعمیر کی جائے۔ جسے عوام بول اور سمجھ سکیں، جس کا نام ہندوستانی ہو، اور جو ملک کی قومی زبان بن سکے۔

یہی تھا تصور مہاتما گاندھی جی کا ہندوستانی یعنی ہندوستان کی ملکی زبان کے متعلق اور اسی خیال کو دستور ساز اسمبلی کے صدر سری ماولنکر جی نے ۲۷ مارچ ۱۹۵۴ء کو پارلیمنٹ میں مندرجہ ذیل الفاظ میں دوہرایا۔

"اردو، ہندی کا جھگڑا محض سیاسی ہے
اگر تعصب کو ترک کر کے صرف لسانی
حیثیت سے اس پر غور کیا جائے تو

بہت سی تلخیاں دور ہو جائیں۔ محض نام کا پابند ہونا حماقت ہے۔ ہندوستان کی زبان کے لیئے ہندوستانی نہایت موزوں نام ہے۔ ایک مشترکہ زبان کی بنیاد عصبیت اور اکھل کھرے پن پر نہیں رکھی جاسکتی

شاہراہ اُردو کے حصۂ نثر میں مضامین کی کی ترتیب زبان کے ارتقائی اور تدریجی نما کے لحاظ سے نہیں کی گئی ہے۔ میٹریکیولیشن کے درجہ کے لیئے کسی زبان کے نصاب کی تدوین میں اس امر کی پابندی بے معنیٰ اور غیر ضروری ہے۔ مضامین کی ترتیب میں صرف ان کی ہنگامی اہمیت۔ اخلاقی نوعیت اور ادبی جنسیت کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ تقدیم وتاخیر سے ان کی ادبی اہمیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شروع کے چند مضامین اُردو زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج کل جب کہ ہمارے ملک میں ملکی زبان کے تعین کا معاملہ درپیش ہے۔ ہم نے ان مضامین کے ذریعہ اُردو زبان کو اپنی کہانی اپنی زبانی بیان کرنے کا موقع دیا ہے۔ تاکہ وہ اس سلسلے میں اپنے حقوق کو اچھی طرح پیش کرسکے۔ اور اپنی وکالت آپ کرسکے۔

اس حصے میں مضامین کے انتخاب میں دو تین باتیں پیش نظر رکھی گئیں ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ منتخب شدہ مضامین کی زبان معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس، سادہ، شستہ اور رواں ہو۔

اور غیر زبانوں کے غیر ضروری اختلاط سے پاک صاف ہو۔ نفسِ مضمون کے لحاظ سے وہ مضامین چنے گئے ہیں جو اخلاقی اور اصلاحی اور معلوماتی پہلو رکھتے ہیں جو ہندوستان کے تہذیب اور تمدّن، اس کی معاشرت اور قومی روایات کے آئینہ دار ہیں۔ زیادہ تر مضامین اُن مسلم الثبوت اہلِ قلم کے لئے گئے ہیں جن کا مرتبہ باعتبار فضل و کمال ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ نیز جہاں مختلف ذوقوں کے ممتاز مشاہیر کی نثر کے نمونے لئے گئے ہیں، مضامین کے اندر تنوع اور افادیت کو بھی پوری طرح ملحوظ رکھا گیا ہے۔ متین اور سنجیدہ ادب کے جواہر ریزے بھی شامل ہیں اور مزاح کا عنصر یعنی ظرافت کی چاشنی اور زبان کے چٹخارے کا رنگ بھی۔

حصہ نظم میں شعراء کی ترتیب تاریخی لحاظ سے ہوگئی ہے۔ طلباء کو شعر کی ہر صنف سے روشناس کیا گیا ہے۔ شاید ہی کوئی چوٹی کا شاعر قدیم یا جدید رہ گیا ہو۔ جس کے کلام کا انتخاب نہ لیا گیا ہو۔ غزل کی نسبت نظم پر زیادہ زور دیا گیا ہے جو اس درجے کے طلبا کے لئے زیادہ مفید اور موزوں ہے۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے زیادہ تر وہ نظمیں منتخب کی گئی ہیں جو اخلاقی اور نیچرل شاعری کی حامل ہیں۔ جو جذباتِ فطرت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ جن میں مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ جن

کا پس منظر ہندوستان اور ہندوستان کی معاشرت ہے۔
مجھے رنج ہے کہ چند مشکلات کے باعث میں مزید
اور جدید اہلِ قلم کے کلام سے منتخبات نہیں لے سکا۔ میں
ان حضرات سے جن کے مضامین نظم و نثر اس مجموعے
میں شامل کیے گئے ہیں معذرت چاہتا ہوں کہ فرداً فرداً
ہر صاحب مضمون سے اجازت نہ لے سکا۔ اور امید کرتا
ہوں کہ وہ مجھے معاف فرمائیں گے ؛

میں نے مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا جیل میں لکھا
ہوا ایک مکتوب تبرکاً شاملِ نصاب کیا ہے۔ اگرچہ اس
کی ادبیت۔ شعریت اور وجدانیت اس درجے کے طلبا
کی دسترس سے کہیں بڑھکر ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں
وہ برہم ہو کر یہ نہ فرمائیں ع

شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد

مؤلف

حصۂ نثر

زبان اُردو کی تاریخ

مولوی محمد حسین آزاد

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے - لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کیساتھ ہی آئی ہو - اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے - اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے تم خیال کرو گے کہ شاید اس میراث قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی - اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا - اور یہیں پھلا پھولا ہوگا - لیکن نہیں - ابھی سراغ آگے چلتا ہے - سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب بدنام رہا - مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھبا رہا ہے - چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اُسے غیر قوموں کی گھوڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے - پس دانائے فرنگ کہ ہر بات کا پتہ پتال تک نکالنے والے ہیں - انہوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے - کہ یہاں کے اصلی باشندے اور

لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ
کل ملک پر قبضہ کر لیا۔ یہ فتحیاب غالباً جیحوں سیحوں
کے میدانوں سے اُٹھ کر اور ہزارے شمالی پہاڑ اُلٹ
کر اس میدان میں آئے ہوں گے۔ اس زمانے
کے گیت اور پرانی پرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم
کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے
صورت کے وجیہہ۔ رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور
اس زمانے کی حیثیت بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے
موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمین گیر
ہو گئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجب نہیں
کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ
بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں
نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب
لیا۔ ایران میں تاج کیانی پہ درفش کاویانی لہرایا۔ اپنے
مذہب کا نادر طریقہ لے کر چین کو نگارخانہ بنایا۔
یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ روما کی
عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اندلس پہنچ کر چاندی
نکالی۔ یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلیاں
نکالتے تھے نکال لئے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں
سے دہقانی کھودتے تھے لعل بے بہا نکال
لائے تھے تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور اُن
کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے
پنجاب میں قطعہ قطعہ کی زبان کہیں کچھ اور کہیں

بالکل اختلاف رکھتی ہے - یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے - اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس ہند کی نامی زبانیں وہ ہونگی - جن کی نشانی تامل - اوڑیا اور تلگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں - بلکہ اس حالت میں بھی ان کی شاعری اور انشاء پردازی کہتی ہے - کہ ہم بھی کسی لذیذ میوے کی ہیں اور سنسکرت سے اسے لگاؤ تک نہیں ؂

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اتر کر پہلے تو پنجاب میں ہی ڈیرے ڈالے ہوں گے - پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے - اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے - کچھ بھاگے ہوں گے - وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے - کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے - اور وہی شودر کہلائے ہوں گے چنانچہ اب تک بھی اُن کی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ اور کسی بدن کی ہڈی ہیں ؂

مدتِ دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جلے رہے ہونگے یہی سبب ہے - کہ ایران کی تاریخ میں مہ آباد اور اس کے زمانے کی تقسیم برہما کے زمانے سے اور اس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے

اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے۔ یہاں بدھ نے
نہیں توڑا۔ وہاں زرتشت کے مذہب نے آتے
جلا کر خاک کیا۔ مگر ہندوؤں نے بدھ کے بعد پھر اپنے
حال کو سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے ؛

چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ الگ
رہنا دور کے نہ رہنے والوں کو عذر کے لباس میں
نظر آیا۔ مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بُری بات نہ تھی۔ اسی
کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ الگ
چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہوگا۔ ماں باپ دونوں کی
طرف سے خالص ہوگا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتا بتا
سکیگا۔ جو دوغلا ہوگا۔ اس کا سلسلہ الگ ہو جائیگا
اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں۔ تو تمام
نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے
تو ڈھونڈے نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان سخت قیدوں
نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے
چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے
تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ اٹھ بیٹھ بات چیت
رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان
دوغلی ہو جائیگی۔ اس واسطے کہا کہ ہماری زبان زبان
الٰہی ہے۔ اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے
چنانچہ اس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے
جانچ کر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آ سکتا
اس کی پاکیزگی نے بغیر نقطہ کو اپنے دامن پر

ناپاک دھتیا سمجھا اور ہوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا - اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہیگی برخلاف ایرانی بھائیوں کے - اُن کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی ۔

اسکی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت[1] رکھا - جس کے معنی آراستہ پیراستہ صفی [?] منزہ - مصفا - مقدس جو چاہو سمجھ لو - اس کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ بندگان دین ہی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں - بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے -- اس زبان کا نام دیوبانی ہوا - یعنی زبان الٰہی - زبان شاہی وید کے سنہ ترتیب جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے - چودہ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں - اس وقت اِن فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو - جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں - اُن کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آ کر کچھ اور ہو گئے ہوں گے - اس لئے

---

۱ - سن [?] مکمل اور کیرت [?] بنائے ہوئے کو کہتے ہیں - سنسکرت مہذبوں کی بنائی ہوئی تھی - پراکرت کے معنی ہیں جو طبیعت سے نکلے - پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں - جو طبیعت (نیچر) نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیں -

گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی جیسے اسلام کے بعد اردو چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی - مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتہ بتاتی ہیں - ان کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے جھلکتے نظر آتے ہیں - مگر بگڑے ہوئے ہیں - دیکھا! پراکرت کے معنی ہیں طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے - چنانچہ ہیم چندر لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے - اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں - پس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے - کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے - ہر بات کو خوب سمجھتے تھے - اور جو کچھ انہوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے ۞

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی - مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی - پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے - کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں - اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں ۞

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی - پھر بھی منوسمرتی جو ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی - اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے ۞

اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا۔ کہ دفعتہً ۵۴۴ برس قبل مسیح میں بُدھ مذہب کے بانی شاکیہ منی پیدا ہوئے وہ مگدھ دیش سے اُٹھے تھے۔ اس لئے وہیں کی پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ اِن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم۔ حکومت۔ رسم و رواج دین آئین سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔ اور مگدھ دیش کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کُتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب کی زبان ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے اور یاوا بلند کر دیا۔ کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں اُن کی بھی اور قادر مطلق بودھ

کی زبان بھی یہی ہے - اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں - خدا کی قدرت دیکھو جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی - اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی ؂

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً پانسو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا - اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی - شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی - راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی - آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اجالا ہے - اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی - کیونکہ اس عہد میں جو کالیداس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے - سبھا میں دیکھو بادشاہ - امرا اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے - تو پراکرت میں کہتا ہے ؂

گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے

ہیں - اس وقت بھی ہر قطعہ میں اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی - اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی کہ دفعتہ زمانے کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا - یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا - اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا - اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا ۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و اوستا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں - مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی ۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے - اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو - کہ اس پر وہاں کیا گذری - اول تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو - پھر یہ بھی کوئی تھوڑے تعجب کی بات نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گذرے - اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلابات پڑتے رہے - باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں ۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جاکر بسی ہوگی -

اوّل تو مدت تک اُن کے مذہب۔ رسم و رواج
اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر
اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا
پھوٹا پتا ملتا ہے۔ تو زرتشت کے وقت سے ملتا
ہے۔ جسے آج تقریباً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس
نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردہ میں توحید کے
مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے
بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو
برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں
تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور
ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا جو مصیبت
بودھ کے ہاتھ بید شاستر پر پڑی تھی۔ وہاں
وہی مصیبت ژند و اوستا پر آئی۔ چنانچہ جس آگ
نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں
سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے
گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ
میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی۔ وہ یونان
کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے راکھ
ہو کر اڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے
ورق ورق برباد کئے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ
الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب
کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا۔ تو انکی زبان نے
زبانوں پر بھی زور دکھایا ہوگا۔ تھوڑے سے ہی دنوں

میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا - وہ ایران
جسے ہزارہا برس سے ملک گیری کے نشان سلامی
اتارتے تھے - اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار
میں سر جھکاتے تھے - ۵۰۰ برس تک ظفریابوں کے
کے قبضہ میں دبا رہا - اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ
ڈھونڈ کر فنا کی گئیں ؂

سنہ ۲۲۶ء میں پھر تن بے جان میں سانس آیا اور
ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی
ان بادشاہوں نے ملک و سلطنت کی قدامت کے ساتھ
بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا - گرے ہوئے
آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے
پرانے اوراقِ پریشان ہاتھ آئے - بہم پہنچائے
انہی کی کوششوں کی کمائی تھی جو پھر ساڑھے
چار سو برس بعد علمِ اسلام کے آگے قربانی ہوئی
اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ
بھولنا چاہیئے - کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی
کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان
کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا - کہ بمبئی - سورت
گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے
روشن ہیں - جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ اُن تصنیفات کا
بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں نذرِ آتش ہوئیں - کتب
مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت
کرتیں بلکہ اُن کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی

ہیں - جو چار برن ہندوؤں میں ہیں - وہی ایران میں تھے - اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی - حیوانات بے آزار کا مارنا گناہِ عظیم تھا - تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا - آتش - آب - خاک - باد - ابر - بجلی گرج - ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانتے تھے - جس کے اظہار عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے - یادِ الٰہی کے زمزمے تھے جن کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے - یہ وہی لفظ ہے - جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے - کیونکہ اس میں بھی یادِ الٰہی کے گیت ہیں - فارسی مروجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں - کہ سنسکرت سے بھی ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں :-

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پِتر	برادر	بھراتر
پور	پُتر	دختر	دوہتر
مادر	ماتر	انگشت	انگشت
زانو	جانو	پا	پاؤ
باد	بھار	بیم	بھے
بوم	بھوم	خاشاک	گشیا
اسپ	اشو	خر	کھر

ایرانی مذہب پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا - جو کہ یہاں دو سو برس بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل

گئی تھی - بہر حال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی - یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی الفاظ مِلا جلا کر گزارہ کر لیتے تھے ؂

اُدھر سنسکرت تو دیو بانی یعنی زبان آسمانی تھی اس میں ملیچھوں کو دخل کہاں ؟ البتہ برج بھاشا نے اس بن بلائے مہمان کو جگہ دی - دھرم دان ہندو سالہا سال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفر رہے - مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے - کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں - جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں - غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا - لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے - دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے - اور اس کے کئی سبب ہیں - اوّل تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں - (۲) اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں - کہ اُنہیں انہیں کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں - ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے - پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے - اس صورت میں گویا

قانون زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے۔ کہ
یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز
نہیں۔ (۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے
ہیں۔ وہ اس لطف کو جانتے ہیں۔ کہ جب دو غیر
زبان والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں۔ تو کبھی کام
کاج کی شدت مصروفیت میں کبھی اسی عالم میں
ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی
آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے
کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جاتے پڑتے ہیں۔
کہ بے اس کے گذارہ نہیں ہوتا۔ (۴) پھر جب
ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہو جاتے ہیں تو اکثر پیار
اور محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک
دوسرے کے لفظ کو بول کر جی خوش ہوتا ہے۔ جس
طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح
اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں
سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے
رہنے کو جگہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اُن کی زبان مہمان
لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔ (۵) بڑی بات یہ ہے کہ
فتحیابوں کے اقبال کی چمک اُن کی بات بات کو
بلکہ لباس۔ دستار۔ رفتار۔ گفتار کو بھی ایسی آب
و تاب سے جلوہ دیتی ہے۔ کہ وہی سب کی
آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لوگ
اسے فقط اختیاری نہیں کرتے بلکہ اس وجہ

بھی کرتے ہیں - پھر اس میں بہت سے فوائد بھی
عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں ۔

اس زمانے کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں
آج نہیں ملتیں - جن سے وقتاً بوقتاً اس کی
تبدیلیوں کا حال معلوم ہو - البتہ جب سنہ ۱۱۹۳ء میں
شہاب الدین غوری نے راۓ پتھورا پر فتح
پائی تو چند کوی ایک نامی شاعر نے پرتھی راج
راسا لکھا - اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان
مذکور نے کتنا جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا
ہر صفحے میں کئی کئی لفظ نظر آ گئے ہیں - ساتھ ہی
یہ بھی معلوم ہوتا ہے - کہ اس وقت بھی یہاں کی
بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی - میں نمونہ تصنیف
مذکور کا لکھتا ہوں :-

५७ छन्द उठि मइला प्रिथीराज साहि आरोह निवाजीय ।

५ छन्द—परवरदिगार पैगाम । रदूलल्लाह करीम हैवार सरमान
जलालदीन आया सुरिताण सहाबदीन अलहदयाया
मुसलमानदीन दाम सामद तियतलीफ हैर कहन लागौ
पातिसाह सैतान दरगहै देव सैदीवान छुवया आदब
निवैर मंडयां खलक आलम अलीई जीवहै महुबास
पीहि हजरीते मुवारकेज खास मरदां मेलसिंघ
बालबाह सांई देग मामूर रचाहै । इतने मलिक को
फरमान पेस कजल किआसं कैलास रोह पंथार गबर ।

५९ छन्द—पाव बाजि प्रिथीराज पांह दीनि सुलिताण कवि
सकाइ तिहि वाव पदि अंगुलि सुलितानं ।

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں۔ مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے کھلتا ہے۔ مگر حرف شناس آدمی بھی اتنا جان سکتا ہے۔ کہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں۔ محل یہ ورد گار۔ پیگام (پیغام) کریم۔ سرطان (یعنی سلطان) بات شاہ۔ (بادشاہ) دیوان۔ خلک (خلق) عالم۔ حضرت (حضرت) ملک۔ پھرمان (فرمان) سلام ۔

ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ ان کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو مطلب بناتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات و لوازمات کا اس ایک لفظ سے سننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا۔ تو بھی جو صفات اور اس کے لوازمات نیک یا بد۔ رحم یا عدل: دور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے۔ وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کے اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سینکڑوں لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی

شخص اپنے دوست سے کہتا ہے "لاٹ صاحب چھ بجے سٹیشن پر پہنچینگے - پروگرام کے مطابق شہر کی سیر کریں گے - پانچ بجے آنا وہیں تماشہ دیکھیں گے" اب خواہ میچ خواہ بگڑے - مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنی سننے والے کو سمجھا رہے ہیں - کئی کئی سطروں میں ترجمہ کیے جائیں - تو بھی حق مطلب بجا نہ لا سکیں گے - آخر پندرھویں صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا اتنا ہوا کہ اول کایتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتروں میں داخل ہوئے اور اب ان لفظوں کو ان کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا - رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے یہ نوبت ہوئی کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلےٰ درجے کے اہل دربار نے جبہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں کو خدا حافظ کہا اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے - ادھر ہندو شرفا، بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے - بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے *

اب جس قدر ممکن ہے - عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں - امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) میں فوت ہوئے - ان کی ایک غزل نظم اردو کی تاریخ میں دیکھو - جس کا پہلا مصرع

ع — ہے

ز حال مسکیں مکن تغافل در آئے نیناں بن آئے بتیاں

اس سے نہیں کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بین اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں۔

بابا برادر آؤ رے بھائی بنتیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں بتاتے ہیں:

لودھ پھٹکڑی مردہ سنگ ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنک
افیون چنا بھر مرچیں چار اُرد برابر تھوتھا ڈال
پی سوتا کے پانی میں پوٹلی پرکے ترت پیڑ نینوں کی ہرے

نظم اردو کی تاریخ میں اُن کی چند پہیلیاں ہیں کہہ مکرنیاں۔ دو سخنے۔ اصل میں نے کچھ دیئے ہیں، انہیں دیکھو۔ اور خیال کرو۔ کہ بحریں دوہروں کی ہیں۔ مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں۔ مگر عہد بعہد کی زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں ان پڑھ تھے۔ مگر رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوتیں تو کئی جلدیں ہوں۔ ان کے دوہروں میں

فارسی عربی کے لفظوں کو دیکھو :-

دین گوا یو دنی سے دُنی نہ آئیو ہاتھ، پیر کلہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ
کبیر سریہ سرائے ہے کیوں سوئے سکھ چین، کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گورو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہیں۔ اگرچہ خاص قطعات پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے اُن کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں اتنے کسی کے کلام میں نہیں۔ اور چونکہ سنہ ۹۰۰ھ ۱۵۰۰ء کے بعد فوت ہوئے۔ اس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دوہرا :-

سانس ماس سب جیو تمہارا تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ و عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں جپ جی کے دو فقرے دیکھو :-

دادن جاوکس انیک بار تو سدا سلامت جی نرنکار

مسلمان بھی اس زمانے میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمدؐ جائسی ایک شاعر ہوا۔ اس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیمانہ سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے

جادوٗ فارسی عربی کا لفظ نہیں مِلتا۔ مطلب اِس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ مِل سکتی ہے۔ اِس لیئے نمونہ نہیں لکھتاؔ

ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا۔ اور چانپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا محاصرے کے وقت رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مِل گیا اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزائن بے حساب سمیت) ہمایوں کے قبضے میں آیا سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا۔ کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا۔ اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اسے ایسا چاہتا تھا۔ کہ سونے کے پنجرے میں رکھا تھا۔ اور ایک دم جدا نہ کرتا تھا وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے۔ تو رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا "پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"۔ سب کو تعجب ہُوا اور ہمایوں نے کہا۔ رومی خاں چکنم کہ جانور است ورنہ زبانش مے بریدم"۔ اس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ غرض اِس نقل سے یہ ہے کہ اِس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ

ضرور چڑھے ہوئے تھے - جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا - جانور تھا جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا ؎

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پہنڈت بھی تھے - فقیر بھی تھے - شاعر بھی تھے - اُنہوں نے راماین کو بھاشا میں اچھی طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی - اِن کے دوہروں میں بہت اور کتاب کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں - دوہرہ راماین :-

سنکاٹے سیوک کل چہنہ سودی رگھرپ   گھر تمہ تہ دین دیا کر بر ڈیرا دیو لگائے
گھر لیو اس بچن ہٹ بولے   فتی بھنگ کلہ بجی کھولے
رام انیک گریب نواجے   لوگ بید بر برد بکھانے
گنی گریب. گرام نر ناگر   پنڈت موڑ ملین اوجاگر
بابا کو بابا ملے کہ کر سبھے بانھر   تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

انہی دنوں میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص و عام کیا - اِن کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا ؎

بابا دھام دنتا دھن دھنتا   باندھیوں ہوا اس ساج (یعنی ساز)
سنت سبھی جانت ہوں   تو نہ آیو باج (یعنی باز)
کھیت بہت کا ہے تم تاسنے   سبق تئی آواج (یعنی آواز)
دلیو نہ جات پالہ اُتر آئے   چاہت چڑھیں جہاج (یعنی جہاز)

دیکھیے پاند اناند سرو کولا نہارہ ج برج راج
تنئیں کرت کست بوجھ تم سوں سدا گریب نواج غریب نواز

خیال کرو کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دوہروں میں فارسی لفظ بول جاتے ہیں۔ تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

اخیر میں حسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدردانی سے ظاہر ہوئی۔ اُنہوں نے ایک ایک اشرفی دوہرہ گودی اور گنوان پنڈتوں کو انعام دے کر دہلی اور نواح میں شوق پھیلایا۔

اِس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا۔ جن کے باپ دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے۔ اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑتی ہوگی تازہ ولایت آدمی بھی اِن کی بلا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ اِن زبانوں کی نثر تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ سنہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاص بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ

کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے - اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے - شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی - عربی لفظ اُن کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے - اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا - اتنا ہی روز بروز فارسی نے ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین عروج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دارالخلافت ہوئی - بادشاہ اور ارکانِ دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے - اہل سیف - اہل قلم - اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے تھے کی بیں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں - اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے - وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا - اسے فقط شاہجہان کا اقبال کہنا چاہیئے - کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اُردو کی طرف منسوب و مشہور ہو گئی - ورنہ جو نثر و نظم کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی

زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا - چند کوی کا کلام
مل گیا - اس میں الفاظ موجود ہیں - محمود کے
وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی
ضرور ہوں گے -

بیانہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا
کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی کی تحریک یا ارادہ
سے نہیں ہوا - بلکہ زبان مذکورہ کی طبیعت ایسی
ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جاتی ہے
سنسکرت آئی اس سے مل گئی - عربی - فارسی
آئی اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا - اب انگریزی
الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس
کے انتظار میں بیٹھی تھی ۔

اسی زبان کو ریختہ بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف
زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے - جیسے دیوار کو
اینٹ - مٹی - چونا - سفیدی وغیرہ سے ریختہ کرتے
ہیں - یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہیں گری پڑی پریشان
چیز - چونکہ اس میں لفظ پریشان جمع ہیں - اس
لئے اسے ریختہ کہتے ہیں - یہی سبب ہے - کہ
اس میں عربی - فارسی - ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے
الفاظ شامل ہیں - اور اب انگریزی بھی داخل

---

۱ - پہلے شعرا اردو کو ریختہ کہتے تھے - میر عصر علی کی تقریر
میں دیکھو - صفحہ ۵۲ - مرزا رفیع فرماتے ہیں :

ع - شعر بے معنی سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ - اور دیکھو صفحہ ۱۰۸ -

ہوتی جاتی ہے - اور ایک وقت ہوگا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی - چنانچہ میں ایک خاندانی زادے کی گفتگو لکھتا ہوں - جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے - یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے - نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے - فقط دوستانہ بے تکلف باتیں ہیں "بڑے آغا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا - ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا - کمریاں - کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں کنٹر اور گلاس بھی ولائتی تھے - کرسیاں - میزیں چقیں باریک خوش رنگ تھیں - میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں - منجھلے آغا بولے جانے بھی دو - جس مال نے مالک سے وفا نہ کی ہم سے کیا وفا کرے گا - آتے ہوئے ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں - کھبے مرزا جان چلے آتے ہیں - شکرم ٹھیرا کر بڑے تپاک سے ملے - بڑھاپے نے بچارے کا رنگ و روپ سب کھو دیا - وہ شکل ہی نہیں وہ صورت ہی نہیں کیسے گورے چٹے سجیلے جوان تھے - لوگ تصویریں اترواتے تھے - میں نے کہا - میاں ہم نے تو جانا تھا - تم دکن سے خوب چاق چوبند سرخ و سفید ہو کر آؤ گے - تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے - غضب کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے -

ٹھنڈا سانس بھر کر بولے۔ ہائے جوانی"۔

فارسی عربی الفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ پنچ۔ چاق۔ شاق۔ آکا ترکی ہیں۔ میز[1] نامعلوم۔ نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا اطالی ہے۔ ڈپٹی ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنسٹر۔ گلاس انگریزی ہیں۔ چٹا۔ کھبا پنجابی ہے۔ مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھبا پنجابی میں عام ہے۔ خاص صفت کے ساتھ بولتے ہیں۔ بھانڈا پھوڑنا اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اردو میں بولتے ہیں۔ پنجابی میں کھینچ کر باندھنے کو یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر پکڑو بھننا۔ بھنانا توڑنا اور تڑوانا ہے۔ اور اسی سبب سے پنجابی میں روپیہ کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اردو میں پہلے معنی متروک ہو گئے اور دوسرے معنی رہے وہ بھی زبر کو پیش کر کے کہ جاؤ۔ روپے کے ٹکے بھنا لاؤ۔ اور اس اصلیت کا سراغ یوں لگا کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں۔ اور اردو میں بھی چنتے

[1] میز دری زبان میں ترجمہ ٹیبل کا ہے۔ مگر اردو کو یہ لفظ فارسی مروجہ سے نہیں ملا۔ صاحب لوگوں سے پہنچا ہے۔

نہیں - صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا - دوپہر کو دیکھو تو برکت ! یعنی سب پیسے اُٹھ گئے ؛

کسوٹی - گھسنا - مرادف فرسودن - اردو میں بالکسر ہے - پنجابی میں اِس طرح بولتے ہیں - کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے - اور ہ کا تلفظ عجیب ہے کہ انہی کے لہجے کے لئے خاص ہے - بہر حال ہے کس وٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا - اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہو گیا ؛

ڈوپ - سجیلا - جوبن - گنوایا برج بھاشا ہے
اِن کے علاوہ لفظ مرہ کی باتوں پر خیال کرو - یوسف ہارون - موسیٰ - عیسیٰ وغیرہ عبرانی ہیں - کیمیا فیلسوف - اصطرلاب یونانی ہیں - اُڑد یعنی ماش تامل ہے - ننھا یعنی خورد گجراتی ہے - بڑا جو کڑھائی میں تلتے ہو تلگو ہے - گدام ملایا کی زبان ہے - تماکو امریکہ کا لفظ ہے - یورپ کے رستے ہو کر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا ؛

اردو میں اس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی - جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو - میر جعفر زٹل کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانے کا نمونہ گنتا - مگر زٹل کا اعتبار کیا ؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلص ایک بزرگ نے وہ مجلس لکھی - اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں - اور

غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے۔" پھر دِل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی۔ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے۔ اور گوہر مراد رشتۂ اُمید میں نہ آوے۔ ہلذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہُوا مستمع۔ پس اِس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابانِ تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دِل افگادہ پر اہتزاز میں آئی۔ یہ بات آئینۂ خاطر میں مُنہ دکھائی"۔

میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے افسوس کہ اس وقت موجود نہیں۔ اِس کا اندازہ بالکل یہی ہے۔ لیکن چند فقرے سوداؔ کے ایک دیباچہ سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں :۔

نثر مرزا رفیع۔ "ضمیر منیر پہ آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے۔ جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ۔ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعۂ سنجان لغزنگاہ کردن۔ تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفرین رہوں۔"

قیمت و قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم
ورنہ دنیا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغِ اسیر نہیں۔ کہ ہو بیچ قفس کے۔ جس وقت زبان پہ آیا فریاد بلبل سے بے واسطے گوش داد رس کے۔ غرض جیسے اہل سخن کا تو منصفی زینت لب ہے۔ سر رشتۂ حسن و معانی کا۔ اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گزندِ زہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے ؟

اس تصنیف سے تخمیناً بیس برس کے بعد جب کہ میر انشا اللہ خان اور مرزا جانجاناں مظہر کی دلی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس گفتگو کے چند فقرے بھی قابلِ غور ہیں۔ سید انشاء مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں :-

"ابتدائے سن صبا سے تا اوائلِ ریعان۔ اور اوائل ریعان سے الی آلان اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبہ عالیہ نہ سجدے تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں"

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں :-

"اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے تجھیں ایسے

اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے
لیکن میر غفر غینی کے نام سے ایک تحفۃ گو
سے بلہ انشاء نے دریائے لطافت میں لکھی ہے اسے
پڑھ کر تعجب آتا ہے۔ کہ اس صاحب کمال
نے یہ زبان کس فصاحت کے سانچے میں ڈھالی
تھی۔ کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین و آسمان
کا فرق ہے۔ شاید مرزا جان جاناں اور سودا
وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہو گی۔ تقریر کا انداز
کچھ اور ہو گا۔

بہر حال اس وقت تک انشاپردازی اور ترقی
وسعت زبان اردو کی فقط شعراء کی زبان پر تھی
جن کی تصنیفات۔ غزلیں عاشقانہ اور قصیدے
مدحیہ ہوتے تھے۔ اور غرض ان سے فقط اتنی
تھی کہ امراء و اہل دول سے انعام لے کر گذارہ
کریں۔ یا تفریح طبع یا یہ کہ ہمچشموں میں تحسین و
آفرین کا فخر حاصل کریں وہ بھی فقط نظم میں۔ نثر
کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی۔ کیونکہ
کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی
مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ تھوڑے عرصے میں کچھ
قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم
سبب اس کی عام فہمی تھی۔ کہ ہر شخص سمجھتا
تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ وا
لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد عطا حسین خان تحسین

نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھ کر نوطرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۷۹۸ء مطابق ۱۲۱۳ ہجری میں ختم ہوئی ۔

ادھر تو یہ ہونہار لڑکا شہر کے جلسوں میں اور امراء کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ ادھر داناے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا۔ نظر بازہ تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اُردو اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں آرائش محفل لکھی۔ میر امن دہلوی نے ۱۸۰۳ء ۱۲۱۷ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اُردو لکھی۔ ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں شری للوجی لال کوی نے پریم ساگر[1] لکھی۔ اور بیتال پچیسی[2] جو محمد شاہ کے زمانے میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارہ خنر

---

[1] ۔ پریم ساگر سمت ۱۸۶۰ میں بھاشا ہوئی ۔

[2] بیتال پچیسی ۱۸۰۵ء میں مظہر علی ولا نے اردو میں لکھی ۔

کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا - کہ میر انشا اللہ خان
پہلے شخص ہیں - جنھوں نے ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو
لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے ۔

عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام ہمی دیکھ
کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر
پر رکھا - یعنی ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر
صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں کیا۔ بعد
اس کے مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے
عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے ۔

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع
ہوئے - چند سال کے بعد کل دفتروں میں اسی سنہ
میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں
اردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا - اور یہ اس
زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم
سے نکلا ۔

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اردو اس لیاقت
سے کہ ملکی زبان بھی ہے - دفتری زبان بھی
بھی ٹھیری - اردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو
پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔
تب سرکار نے مناسب سمجھا - کہ اس
ملک کے لوگوں نے انہی کی زبان میں انگریزی
علوم و فنون سکھائے جائیں - چنانچہ ۱۸۴۲ء
سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے -

اور ضرورت علمی کے الفاظ بہم پہنچانے لگی - خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اس کی وسعت کا میدان کیا - البتہ آپ امید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلے میں کوئی درجہ پائے +

اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا - باوجود اس کے ابتک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطرخواہ ادا کر سکے - یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے - اس کا سبب یہ ہے - کہ اکثر عام اور ہزاروں مسائل علمی ممالک فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانۂ سلف میں بالکل نہ تھے - اس واسطے عربی - فارسی - سنسکرت - بھاشا وغیرہ جو کہ اردو کے بزرگ ہیں ان کے خزانے میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں - اور اس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے - خصوصاً جبکہ ہندو مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں +

اُردو، ہندی، ہندوستانی

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو

آج کل میں اکثر رسالوں، اور اردو کی تصنیفات میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس امر پر زور دیا جاتا ہے۔ کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی یا پنجاب میں یا کہیں اور تاریخی نقطۂ نظر سے اگرچہ یہ بحث نہایت دلچسپ ہے۔ لیکن زبان اور ادب کی ترقی پر مجھے اس کا اثر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ علمائے ادب کو اختیار ہے۔ کہ اپنی تحقیقات سے اس کا مولد خواہ دکن قرار دیں خواہ دہلی مگر اِس واقعے سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اِس ڈیڑھ دو سَو برس کے عرصے میں جو کچھ ترقی اُردو زبان یا اُردو ادب میں ہوئی ہے۔ وہ دہلی یا لکھنؤ میں ہوئی ہے، گو مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ کہ پچھلے بیس سال میں حیدر آباد نے اُردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ پچیس برس پیشتر تک جب کوئی شخص اردو کا تذکرہ کرتا تھا۔ تو اس سے مراد زیادہ

تر اُردو شاعری سے ہوتی تھی - لیکن اس پچیس برس میں شاعری کے علاوہ اور اصناف میں بھی اُردو میں خاصی ترقی ہوئی ہے - اب کچھ کتابیں تاریخ یا فلسفے یا اور مضامین پر اُردو میں نکل گئی ہیں - اور اُن کو پڑھ کر اُردو کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے - اسی طور پر ہمارے شاعروں کا بھی کچھ ڈھنگ بدل رہا ہے - پہلے تو ان کو ہوسے بمیاں، چاہ زنخداں اور گل و بلبل وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی - لیکن اب شکر ہے - کہ ہمارے شاعروں کی توجہ اور طرف مبذول ہوئی ہے - ایران میں اس تیس چالیس برس کے اندر شاعری کا ڈھنگ بالکل بدل گیا - اور عصر جدید کے شعرا نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر اپنے تخیل میں آزادی حاصل کر لی ہے - اپنے ملک کی اصلاح میں اور اپنے وطن کی حوصلہ افزائی میں جو ایران کے شعراء نے حصہ لیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا - اگرچہ ابھی تک اُردو شعرا پر تغزل کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہے - لیکن بتدریج وہ بھی بدل رہے ہیں - غالبؔ نے ستر اسّی برس پیشتر انہیں قیود کو محسوس کر کے غالباً یہ شعر لکھا تھا -

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مری زبان کے لئے

اگر وسعتِ زبان کی ہماری طرف سے سمجھ بوجھ کے کوشش کی گئی تو میرے خیال میں ہمیں پچیس برس کے اندر اردو ادب میں کافی ذخیرہ پیدا ہو جائے گا۔ جس کے ذریعے سے انتہا تک اسی زبان میں تعلیم دینا ممکن ہو جائے گا۔ میرا عرصے سے عقیدہ رہا ہے۔ کہ کسی ملک کی تعلیم بغیر زبان میں نہیں ہو سکتی، نہ کوئی شخص غیر زبان میں کمال حاصل کر سکتا ہے۔ ملٹن کے سے شاعر نے جو لاطینی زبان کا استاد تھا۔ جب پیراڈائز لاسٹ" لکھنے کا ارادہ کیا تو آخرکار اس نے یہی تجویز کیا کہ اپنی ہی زبان یعنی انگریزی میں اسے نظم کرنا چاہیئے۔ چنانچہ جو شہرت ملٹن کو اپنی زبان میں "پیراڈائز لاسٹ" لکھنے کی وجہ سے ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد تیس یا پنتیس کروڑ آدمیوں میں صرف چند لاکھ کی ہے لیکن بڑے سے بڑے ہندوستانی کو ہر وقت یہ خوف رہتا ہے۔ کہ انگریزی بولنے یا لکھنے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ ایسے شخص ہندوستانیوں میں جن کو انگریزی زبان پر پوری قدرت حاصل ہو۔ یا جو محاورے اور ترتیب و بندشِ الفاظ میں غلطی نہ

کہہ تے ہوں - بہت کم ہیں - اور ہمیشہ کم رہیں گے
ہر زبان کا تعلق سوسائٹی کے نظام سے ہوتا
ہے - جب ہمارا طرز و طریق زندگی ہندوستانی
ہے - تو بہت سے الفاظ اور محاورے انگریزی
زبان کے ایسے ہیں جن کا اثر ہم پر ویسا نہیں
ہو سکتا جو انگریزوں پر ہوتا ہے - اِسی طرح اگر
بجائے انگریزی کے ہندوستان میں فارسی یا عربی کا
عام طور پر رواج ہوتا - تو اس کا بھی ویسا اثر
ہندوستانی طبیعت پر نہ ہوتا - جیسا کہ ایرانیوں
اور عربوں پر ہوا کرتا ہے - چنانچہ اس کا تجربہ
ہندوستان کو ہو چکا ہے ٭

اسلامی عہدِ حکومت میں فارسی اور عربی کا
بہت کچھ زور ہندوستان میں رہا - لیکن ہندوستانی
مسلمانوں کو بھی بہ حیثیت زبان دانی کے کبھی کچھ
رُتبہ حاصِل نہیں ہوا - جو ایرانی اور عرب ادیبوں
کو ہُوا ہے - ایک مرتبہ اِس مضمون پر مجھ سے
پروفیسر براؤن سے کیمبرج میں گفتگو ہوئی تھی -
میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اُن سے یہ پوچھا کہ
آپ کے تجربے میں ایران میں کِس ہندوستانی
شاعر کی قدر کی گئی ہے - اُنھوں نے صرف امیر خسرو
کا نام بتایا - اور اس پر بھی یہ کہا کہ گو خسرو ہندوستانی
تھے - یعنی یہ کہ ہندوستان میں رہے اور وہیں اُنھوں
نے انتقال کیا - لیکن نسل اُن کی ہندوستانی نہ تھی

مگر فارسی اور عربی کو چھوڑ کر جب سے اُردو کی بنیاد پڑی ہندوستانیوں نے جو اُردو میں کمال حاصل کیا ہے اس پر کسی غیر ملک والے کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے - میرؔ - سوداؔ - ذوقؔ غالبؔ - مومنؔ - آتشؔ - ناسخؔ - انیسؔ و دبیرؔ اُردو کے مالک تھے - اُنھوں نے جن ترکیبوں اور محاوروں کی بنیاد ڈال دی خواہ وہ فارسی اور عربی کے لحاظ سے صحیح ہوں یا غلط - وہ اردو میں مروج ہو گئے - بہ حیثیت بانیان زبان ان کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہتے اُردو ترکیبوں کو قائم کرتے - اِن کی زبان ٹکسالی زبان ہو گئی - ان کے محاورے یا ترکیبوں سے اختلاف کرنا یا تجاوز کرنا غلطی میں شمار ہوتا ہے - اسی طریقے سے عصرِ موجودہ کے جو اساتذہ ہیں اُن کو بھی پورا اختیار ہے کہ نئے خیالات و محسوسات کو مناسب طریقے سے اُردو میں ادا کریں - ممکن ہے کہ بعض اوقات اُن پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہو - مگر رفتہ رفتہ ہم اِن کی ایجادوں کے بھی عادی ہو جائیں گے اور اِن کی ترکیبیں بھی زبان میں داخل ہو جائیں گی -

خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زبان اپنی ملکیت ہے اِس کو جس طرح ہم چاہیں استعمال کر سکتے ہیں - اور اس میں حسبِ ضرورت جو ترقی چاہیں کر سکتے ہیں - کسی شخص غیر کی رائے یا اجازت کے ہم محتاج نہیں

ہماری زبان ہمارے محسوسات و جذبات کی ترجمان ہے - جو نہ انگریزی ہو سکتی ہے - اور نہ کوئی دوسری زبان - میں اسی وجہ سے ہمیشہ اس کا کوشاں رہا کہ اردو کی ترقی ہو - مگر میں اس سے ناواقف نہیں ہوں - کہ جب اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے - کہ ہندی کی کیوں نہ ترقی ہو؟ میں نہ ہندی کا بد خواہ ہوں - اور نہ دشمن، گو اکثر ہندو اصحاب کا یہ خیال ہے کہ مجھ پر اردو یا فارسی کا اس قدر رنگ جما ہوا ہے - کہ میں قریب قریب نیم مسلمان ہوں - میں نے نہ کبھی یہ کہا اور نہ اس کی کوشش کی کہ ہندی کی ترقی نہ ہو - مگر واقعہ یہ ہے کہ پانچ برس کی عمر سے جب میری تعلیم شروع ہوئی ہے - مجھے اردو اور فارسی کا شوق رہا ہے - اور اکثر انھیں زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں - اٹھاون برس کی عمر میں نئے نئے شوق ذرا پیدا ہونے دشوار ہوتے ہیں - اگر کسی کو یہ شکایت ہے - کہ میں نے ہندی اور سنسکرت کیوں نہیں پڑھی تو اس کا جواب وہ جہاں تک کہ میرے عالم طفولیت کا زمانہ ہے - میں نہیں بلکہ میرے بزرگ ہو سکتے تھے - اور میرا خیال یہ ہے کہ میری عمر کے اکثر ہندوؤں کی یہی کیفیت ہے پچاس برس پیشتر اس صوبے میں کم سے کم ان

ان اطراف میں جہاں میں پیدا ہوا اور میری تعلیم ہوئی - متوسط درجے کے ہندوؤں میں عام طور پر یہی رواج تھا کہ اردو اور فارسی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی تھی - خواہ اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اُردو اور فارسی زبان ذریعہ معاش تھی ، خواہ کوئی اور وجہ ہو لیکن واقعہ یہی ہے کہ دہلی میں جہاں میرے بزرگ رہتے تھے - اور اس کے قرب و جوار میں جہاں میری تعلیم ہوئی یہی رواج تھا - اسی رواج کے مطابق میری بھی تعلیم ہوئی - مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ہندو ادب سے بالکل ناواقف ہوں - یا میں نے واقفیت حاصل کرنے کی اپنے فرصت کے اوقات میں کوشش نہیں کی - میرا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی ہندوستانی اپنے تئیں ہندوستانی کہنے کا مستحق نہیں ہے - تا وقتیکہ وہ ہندو اور اسلامی تہذیب و ادب سے تھوڑی بہت واقفیت نہ رکھتا ہو - میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اکثر یہ شکایت کرتا ہوں کہ اُنہوں نے ہندو تاریخ اور ہندو تمدن سے واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی - اگرچہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد مل سکتی تھی جنہوں نے ہندو ادب میں بھی ایک خاصہ درجہ پیدا کر لیا تھا - تھوڑے دنوں کی بات ہے - ایک

مسلمان نوجوان مجھ سے ملنے آئے۔ اُنھوں نے تاریخ میں ایم۔اے پاس کیا تھا۔ یونان، روم اور یورپ کی تاریخ سے اُنھیں خاصی واقفیت تھی لیکن ہندو زمانے سے وہ بالکل ناواقف تھے اور اس کا اُنھوں نے اقبال بھی کیا۔ اسی طرح اکثر ہندو ایم۔اے بھی ایسے ملیں گے۔ جن کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن سے مطلق واقفیت نہیں ✦

جب ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندو کو یہ تعلیم دی گئی ہو کہ مسلمان ہندوستان کو لوٹنے کے لیے آئے تھے۔ محمود غزنوی نے سترہ حملے کئے مسلمان بُت شکن تھے۔ اُنھوں نے آکر جابرانہ طور پر یہاں چھ سو برس تک حکومت کی تو کسی کو کیوں تعجب ہو کہ وہ مسلمانوں سے دل میں نفرت رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی مسلمان بچے کو شروع ہی سے یہ تعلیم دی جائے کہ ہندو جتنے ہیں بُت پرست ہیں، یا ان کے دینیات میں بجز تعصب کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ مسلمانوں کے زیر حکومت چھ سو برس رہ چکے ہیں۔ اور اب مسلمانوں سے تاریخی انتقام لینا چاہتے ہیں تو کیا تعجب ہے اگر مسلمان ہندو سے نفرت کرے اِس چالیس برس کے اندر جس طرح کے بیج ہم نے بوئے ہیں۔ اسی طرح کے درخت اور اسی طرح کے

پھل ہمارے سامنے آرہے ہیں اور اس پر ہر شخص کو دعویٰ نیشنلزم کا ہے۔
آج کل یہ تماشہ ہو رہا ہے۔ کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اٹھ گئی ہیں۔ بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ عام جلسوں میں یہاں یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورد نوش جائز رکھتے ہیں۔ مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھ واسطہ ہی نہیں تھا۔ اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے۔ لیکن چشم مروت رکھتے تھے ممکن ہے کہ یہ بے اعتمادی اس آزادی اور پولیٹکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم سب دم بھرتے ہیں۔ جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں۔ وہیں ایک زبان کا مسئلہ ہے اپنے دل کے بہلانے کے لئے اب ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی کے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پہ چالیس یا پچاس برس پیشتر اس لفظ "ہندوستانی" کا استعمال جائز ہوتا۔ لیکن اس وقت تو میرے خیال

میں اس لفظ کے استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہے یا ایک دوسرے کو دھوکا دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں۔ اُردو کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اُردو میں فارسی اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں۔ اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ ہندی میں غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ بھر دئے جائیں۔ میں میرے لئے یہ مان لینا غیر ممکن ہے۔ کہ ایسی اُردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندوستانی کا لقب دے سکتے ہیں۔ مجھ کو تو اس کا خوف ہے کہ اگر یہی لیل و نہار ہے تو وہ زمانہ دُور نہیں جب کہ اُردو داں کو ہندی داں سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ہوگی اور اسی طرح اس کا برعکس۔ اگر واقعی ہم لوگوں نے یہ طے کر لیا کہ اسی طریقے سے اُردو اور ہندی کی علیحدہ علیحدہ ترقی ہو اور جو کچھ نتائج ہوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرأت کے ساتھ ہم اس کو مان لیں کہ اُردو والوں کو اُردو کی ترقی کا استحقاق حاصل ہے اور ہندی والوں کو ہندی کی ترقی کا۔ میرے خیال میں اگرچہ یہ بہتر ہوتا کہ ہندوستانی یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام طور پر ہندو اور مسلمان سمجھ جانے رائج ہوتی۔ لیکن اگر یہ ناممکن

ہو گیا ہے تو ہم کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ
کہ غیر مانوس عربی اور فارسی کے الفاظ اردو
سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ ہندی
سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ
ہوا کہ ایک وصیت ایک ہندو صاحب نے ایک
وکیل صاحب کی معرفت میرے پاس بھیجی میں نے
اسے دو مرتبہ سُنا۔ ہندی میں لکھی ہوئی تھی ستر
فی صدی الفاظ میں نہیں سمجھ سکا ایسے ایسے
قانونی الفاظ سنسکرت کے اس میں لکھے گئے
تھے۔ جو میں نے اپنے اٹھائیس برس کے
تجربے میں کبھی نہیں سُنے تھے۔ آخر کار جب اس
کا ترجمہ انگریزی میں میرے سامنے پیش کیا گیا۔
اس وقت میں قانونی رائے دے سکا۔ ایسی
ایسی دستاویز کو میں کیا کہوں۔ اردو۔ ہندی یا
ہندوستانی؟

میں اگرچہ سیاسی معاملات کے متعلق بہت کم
عرض کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن جو کچھ میں نے اوپر
اشارہ کیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ زبان کا
بہت کچھ تعلق سیاسی نظام سے ہوتا ہے۔ یورپ
کے بعض ممالک میں پولینڈ یا اسپین وغیرہ میں
جو زبان کے متعلق آپس میں جھگڑے ہوئے
ہیں اور اِن سے جو نتائج پیدا ہوئے۔ اِن
سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ مگر وہاں تو

سلطنت کے آخری دور میں شعراء نے اس بچے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور پال پوس بڑا کیا - بہت کچھ صفائی پیدا کی - اور نئی تراش خراش سے آراستہ کیا - مغلیہ سلطنت کے زوال پر سمندر کے راستے ایک نئی قوم ہندوستان پر مسلط ہوئی - جو ہندو مسلمانوں سے بالکل غیر تھی - اس قوم نے اس کی انگلی پکڑی - اس نے انگلی پکڑتے اس کا پہنچا پکڑا اور دربار سرکار میں اس کی رسائی ہو گئی - رفتہ رفتہ رفتہ سے فارسی کو نکال باہر کیا، اور خود اس کی کرسی پر جلوہ گر ہوئی - آخر ہندوستان کی قدیم راجدھانی اس کا جنم بھوم اور دوآبہ اس کا وطن ہوا - اب دور دور پھیل چلی ہے - اور ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے تک چلے جایئے - ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے بلکہ ہندوستان کے باہر تک جا پہنچی ہے - اب سب سے بڑھی چڑھی بات یہ ہے کہ یہ تین مختلف جلیل القدر قوموں یعنی ہندو مسلمانوں اور انگریزوں کی چہیتی ہے - اور ان تینوں کی متفقہ کوششوں کی عظیم الشان یادگار ہے - تینوں نے اسے سیکھا - پڑھا - لکھا - تینوں نے اس کی ترقی میں مقدور بھر کوشش کی - اور اسے تینوں کی بدولت اس رتبے کو پہنچی - کہ دنیا

کی جدید زبانوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہوئی ۔

اردو ہندی نژاد ہے ۔ اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت ہے ۔ برج بھاشا اور فارسی کے میل جول سے بنی ہے ۔ اس میں جو سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ ہیں ۔ وہ زمانہ دراز کے استعمال اور زبانوں پر چڑھ جانے سے ایسے ڈھل گئے ہیں کہ اصل الفاظ میں جو بھدا پن اور کرختگی اور تلفظ اور لہجے کی دقت تھی ۔ بالکل جاتی رہی ۔ اور چھٹ چھٹا کر پاک صاف سیدھے سادے رہ گئے ۔ جس سے زبان میں لوچ ۔ گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی ۔ اردو کے ہندی نژاد ہونے میں کچھ شبہ نہیں ۔ کیونکہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسماء و صفت میں ہوا ہے ۔ ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہے تمام حروف فاعلی ۔ مفعولی اضافت نسبت ربط وغیرہ ہندی ہیں ۔ ضمیریں سب ہندی ہیں ۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کے اضافہ نے مختلف صورتوں میں اس کی اصلی خوبی میں اضافہ کر دیا ہے ۔ ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے اور عربی فارسی الفاظ میں شان و شوکت اور زبان کے لئے ان دونوں عنصروں کا ہونا ضروری ہے ۔ عربی فارسی الفاظ نے نہ صرف لغتا ہی بلکہ خیالات میں

بھی وسعت پیدا کر دی ہے۔ جس سے اس
کا حسن دو بالا ہو گیا اور وہ زیادہ وسیع اور
کار آمد بن گئی۔ مگر اصل بنیاد جس پر وہ قائم
ہے۔ ہندی ہی ہے۔ محض غیر زبانوں کے اسماء
و صفات کے اضافے سے اس کے ہندی ہونے
میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً آج کل بہت
سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن
اس سے زبان کی اصلیت و ماہیت پر کچھ اثر
نہیں پڑ سکتا۔ ایک دوسری بات اردو زبان میں
یہ ہے۔ کہ وہ اس اصول پر قائم ہے۔ جو
تمام جدید زبانوں میں اس وقت پایا جاتا ہے۔
یعنی صورت ترکیبی سے حالت تفصیلی کی طرف
اس کا رجحان ہے۔ قدیم زبانوں میں یہ بڑی
دقت تھی کہ ایک ہی لفظ کو ذرا ذرا سے
فرق اور پھیر سے مختلف صورتوں میں لے
آتے تھے۔ اب دوسرے الفاظ کی مدد سے
مرکب صورتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور وہ دقتیں
جاتی رہی ہیں۔ اردو کو بھی اس قید سے آزادی
مل گئی ہے۔ غرض یہ زبان مختلف حیثیتوں سے
ایسی قبول صورت ہو گئی ہے۔ کہ اس کی ترقی
میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ اسکی صفائی۔ فصاحت
اور صلاحیت اردو۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی اور
انگریزی کے مختلف مفید اثرات اس امر کا

یقین دلاتے ہیں کہ وہ دنیا کی ہونہار زبانوں میں سے ہے۔ اور ایشیا میں ایک روز اس کا ستارہ چمکے گا ٭

ہماری اسپرانٹو

شیخ سر عبدالقادر

یورپ میں آج کل ایک نئی زبان کا بہت چرچا ہے۔ جسے اسپرانٹو کہتے ہیں۔ شاید دنیا میں یہ پہلی مصنوعی زبان ہے جو کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ گو زبانوں کی جڑ کو دیکھیں تو سب زبانیں کم و بیش مصنوعی ہیں۔ ان کی ابتدائی حالت میں چند انسانوں نے ضرور یہ قرار دیا ہوگا کہ زبان و لب کی فلاں حرکات سے فلاں معنی لئے جائیں۔ مگر یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ کون سی زبان کس زمانے میں اس حالتِ ابتدائی میں تھی۔ بلکہ عام طور پر ہر قوم کی زبان اس قوم کی زندگی کے ساتھ وابستہ معلوم ہوتی ہے۔ جب سے اس قوم کی زندگی شروع ہوتی ہے۔ اسی وقت سے اس کی زبان اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ حالات کے تغیر کیساتھ تغیر پاتی ہوئی بتدریج بڑھتی جاتی ہے۔ اور اہلِ بصیرت کے لئے یہ زندہ تاریخ ہوتی ہے۔ مگر ایسا کم سننے میں آیا ہے کہ کوئی شخص زبان ایجاد کرے یا چند آدمی مل کر ایک زبان گھڑ لیں اور اس کے قواعد منضبط کریں اس کے بعد اس کی اشاعت کی کوشش کریں۔ اور اس کی بنائی ہوئی زبان مقبول ہو جائے۔ اختلاف السنہ سے جو مشکلات سیر و سیاحت اور تجارت کے راستے میں

پیش آتی ہیں۔ ان سے بچنے کے ایک مشترکہ زبان ایجاد کرنے کی کوشش کئی مرتبہ یورپ میں ہو چکی ہے۔ مگر ناکام رہی۔ پھر آخری کوشش جو اسپرانٹو کے نام سے مشہور ہے۔ ایک روسی عالم کی محنت کا نتیجہ ہے علامہ موصوف نے روسی۔ فرانسیسی۔ انگریزی۔ جرمنی اور اطالین زبانوں کی آمیزش سے یہ زبان پیدا کی ہے اور اس کے صرف و نحو کو بالکل باقاعدہ اور آسان بنا دیا ہے۔

استثنائی قواعد اس میں داخل نہیں کئے۔ جن سے طالب زبان کو دقت ہو۔ اور اس کا اسپرانٹو نام رکھا یہ اطالین زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "اُمید" چونکہ اس کے بانی اور اُسکے معاونوں کے نزدیک اس سے یہ اُمید بندھتی ہے کہ یورپ کی مشترکہ زبان ہونے میں کامیاب ہوگی۔ اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ اس کے ساتھ ایک رعایت اس نام میں اور رکھی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس زبان میں قاعدہ کلیہ ہے کہ سب اسماء حروف واؤ پر ختم ہوں۔ اور اس لئے اس نام سے زبان کی ماہیت پر بھی کچھ روشنی پڑتی ہے۔

جب یہ زبان پہلے پہل ایجاد ہوئی تو اکثر لوگ اس کی ہنسی اڑاتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کبھی اس طرح بھی زبانیں بنی ہیں اور پھیلی ہیں زبانیں قدرتی طور پر بنتی اور قدرتی اسباب سے بڑھتی ہیں۔ مگر آفریں ہے اس کے بانی اور اس کے ہمراہیوں کی ہمت اور تدبیر پر اُنہوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ اور یورپ

کے ہر بڑے شہر میں اسپرانٹو بولنے والوں کی ایک کثیر تعداد پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہاں اور پیرس اور لندن کی بڑی بڑی دوکانوں پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہاں اسپرانٹو بولی جاتی ہے۔ اس کے بانیوں کا یہ منشا نہیں کہ یہ موجودہ زبانوں کی جگہ چھین لے وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قوم اپنے گھر میں اپنی زبان اور اپنے علم و ادب کو ہی ترجیح دے گی۔ اور اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی زبان چھوڑ کر اس مشترکہ زبان کو اختیار کر لے گی بے سود ہے۔ اگر وہ چاہتے یہ ہیں کہ یہ مشترکہ زبان ان سب مختلف زبانوں والی قوموں میں ایک مفید واسطہ بن جائے اور خصوصاً تجارتی کاروبار میں سہولت کا باعث ہو تاکہ اسپرانٹو جاننے والا یورپ کے ہر حصے میں اپنا کام نکال لے۔ علم لسان کے علما کے علاوہ پہلے جس طبقے نے اس زبان کی طرف توجہ کی وہ تجارت پیشہ لوگ تھے کیونکہ انھیں اس کے اختیار کرنے اور اس کی اشاعت کرنے میں صریح فائدہ نظر آیا اس کے بعد ان کی مثال کے اثر اور ان کی شبانہ روز سعی کی بدولت اور لوگ بھی ماننے لگے کہ اس زبان کو پھیلانا چاہیئے۔ اب ان لوگوں کو یہاں تک کامیابی ہو گئی ہے۔ کہ لنڈن اور پیرس کے اکثر مدارس میں یہ زبان داخل درس ہو گئی ہے۔ اور ان لڑکوں کو جو تجارتی کاروبار میں پڑنا چاہتے ہیں۔ تاکید ہے کہ وہ یہ زبان ضرور سیکھیں

علاوہ ازیں اس کے حامی ہر برس ایک عظیم الشان کانفرنس یورپ کے کسی مشہور مقام میں کرتے ہیں۔ اور وہاں ہر ملک کے رہنے والے جمع ہوتے ہیں اس جلسے کی کاروائی سب اسی زبان میں ہوتی ہے اور اراکین ایک دوسرے سے اسپرانٹو میں بات کرتے ہیں۔ اب اگر اس کے حامی اسی سرگرمی سے کام کرتے رہے جو آج تک ان کا شعار رہی ہے۔ تو وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ اور اسے آخر یورپ کی زبان عمومی بنا کے چھوڑیں گے۔

اسپرانٹو والوں نے کئی وسائل اس زبان کے مقبول بنانے کے لئے استعمال کئے ہیں جا بجا اسپرانٹو کی انجمنیں قائم کی ہیں ان انجمنوں کے جلسے وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں اور ان میں اسپرانٹو کی مشق ہوتی ہے۔ اور اس کے ذریعے مختلف اللسان لوگ آپس میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ سارے یوروپ کی زبانوں کی مشہور اور مقبول نثری کتابوں کا اس زبان میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ کیونکہ یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ لطیف سے لطیف خیالات بھی اس میں ادا ہو سکتے ہیں۔ ہر دلعزیز گیتوں کا ترجمہ بھی اسپرانٹو میں کیا گیا ہے۔ اور موسیقی کے بعض استادان فن اپنی اپنی دلکش آواز سے ان گیتوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ کئی رسالے اسپرانٹو میں نکلنے لگے ہیں۔ اور اسپرانٹو کے ہوا خواہ بعض اخبارات میں اپنے تجارتی اشتہارات اس زبان میں چھپواتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کی

نگاہیں اس کے الفاظ سے آشنا ہو جائیں اور بیگانگی دور ہو جائے اسپرانٹو کے معاونوں کی سرگرمی کا یہ حال ہے کہ سفر میں ہوں یا حضر میں جہاں کسی نئے شخص سے ملاقات ہوئی پہلا سوال یہ کرتے ہیں۔ آپ اسپرانٹو جانتے ہیں۔ اگر اُس نے اسپرانٹو کا نام سُنا ہے تو اس کے متعلق باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں سُنا تو مختصر سا حال اس کے آغاز اور اس کی ترقی کا سُنا کر اُسے اس کی طرف توجہ کرنے کا شوق دلاتے ہیں۔ اسپرانٹو پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے گئے ہیں۔ اور وہ اِن لوگوں کے پاس اکثر موجود رہتے ہیں۔ اور نئے شائقین میں بانٹے جاتے ہیں +

یہ ہے ایک مختصر سا خاکہ اِن کوششوں کا جو یورپ کی مختلف اللسان قوموں میں رابطۂ اتحاد اور سہولت تجارت پیدا کرنے کے لئے ہو رہی ہیں اور باوجودیکہ ایک نئی زبان کا عدم سے وجود میں لانا ایک کٹھن کام ہے۔ اسپرانٹو کے حامی کمر ہمت باندھے ہوئے مصروفِ سعی ہیں۔ اور کامیابی کے امیدوار یہاں تک کہ اُنھوں نے اس نئی زبان کا نام ہی "زبانِ اُمید" رکھا ہے۔ اس خاکِ پاکِ ہند میں جو ہمارا وطن ہے ایک زبانِ اُمید موجود ہے جو یورپ کی اسپرانٹو سے بہت سی باتوں میں ملتی اور بعض اعتبارات سے فضیلت رکھتی ہے مگر افسوس کہ ہم اس سے غافل ہیں اور ان امکانات سے بےخبر ہیں۔ جو اس کی ترقی میں پنہاں ہیں۔

ہماری اسپرانٹو وہی زبان ہے۔ جسے کوئی اُردو کوئی ہندی اور کوئی ہندوستانی زبان کہتا ہے۔ ہم نام کے پابند نہیں ہمیں کام سے کام ہے۔ جو نام کسی کو بھلا معلوم ہو اس نام

سے اُسے یاد کرے - مگر اس کوشش میں رہے - کہ چار دانگ عالم میں ہندوستان کی "اس خداداد اسپرانٹو" کا چرچا ہو جائے - اُردو کو میں خداداد اسپرانٹو اس لیے کہتا ہوں کہ یہ یورپین بھن کی طرح یہ ایک تازہ انسانی ایجاد نہیں ہے - بلکہ صدیوں میں اِن قدرتی اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی ہے - جن سے دُنیا بھر کی زبانیں پیدا ہوئی اور بڑھی ہیں اور یہی سب سے بڑی فضیلت ہے - جو ہماری اسپرانٹو کو یورپ کی اسپرانٹو پر حاصل ہے اسی لیے اُردو پھیلانے کا کام بہ نسبت اسپرانٹو کے زیادہ آسان ہے کیونکہ ابھی کل کی بات ہے کہ اسپرانٹو بولنے والوں کا وجود ہی نہ تھا اور ہندوستانی بولنے والے ہمارے ملک میں صدیوں سے چلے آتے ہیں - یورپ میں اسپرانٹو کا فقط اس کی ذاتی کامیابی کی توقع کے سبب امید نام رکھا گیا ہے مگر ہندوستان میں ہندوستانی زبان کی کامیابی ملک کی کامیابی ہے اور ملک کی بہتری اور اہل ملک کی بہتری اور اہل ملک کے اتحاد کی اُمید کا صرف یہی ایک پہلو ہے کہ ہم از کم سب ہم زبان تو ہوں - اختلافات مذہبی تو کسی کے ہٹائے ہٹنے والے نہیں مگر ایک ملک میں ایک حکومت کے زیر سایہ رہتے ہوئے اور نقل و حرکت کے ذرائع کی کثرت کے باوجود ملکی زبان کا ایک نہ ہو سکنا اور اس کی اشاعت میں کوتاہیاں نہایت قابل افسوس ہیں *

کئی زبانوں کا مجموعہ مرکب ہونے میں اُردو کو اسپرانٹو کے ساتھ پوری مشابہت ہے اور بڑی خوبی یہ

ہے کہ ابھی اور الفاظ کی آمیزش کی گنجائش اس میں موجود ہے۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں کی موجودہ بولیاں جو اپنی اپنی جگہ قائم رہنے والی ہیں۔ ایک دوسرے سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں اور خصوصاً ہندوستانی کے الفاظ ان میں بہت سے شامل ہیں۔ جو انگریزی الفاظ اب ہندوستان کی زبانوں میں مل کر جزو زبان بن گئے ہیں ان سے یہ مشترک حصہ ان سب زبانوں کا اور بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں اردو کا عام رواج پا جانا سب کی آسانی کا باعث ہے۔ اور بغیر بہت غیر معمولی تردد کے ممکن ہے کہ لوگ اس طرف مائل ہوں۔ یورپ جس کے لئے ایک زبان پیدا کرنے کی کوشش ہو رہی ہے دس بارہ دول کا مجموعہ ہے۔ جہاں ہر حکومت میں زبان جدا طرز حکومت جدا اور قانون جدا ہے۔ ایک حکومت کے باشندوں کی اغراض اکثر اوقات دوسری حکومت کے باشندوں کی اغراض کے خلاف ہیں اور ایک سلطنت اور دوسری سلطنت میں رقابت موجود ہے۔ مگر ان لوگوں کی وسعت خیال اور روشنی دماغ دیکھئے کہ ایسے بڑے اختلافات کو بھی مٹانے یا ان کے دبانے کے لئے ایک نیا رشتہ یگانگت پیدا کرنے کی فکر میں ہیں اور ہماری کوتاہ اندیشی کو دیکھئے کہ ایک ملک۔ ایک حکومت اور مشترکہ ضروریات اور اغراض کے باوجود فکر ہم زبانی سے غافل ہیں۔ حالانکہ ہمارے راستے میں وہ مشکلات بھی نہیں جو ان کے راستے میں ہیں ۔

ہندوؤں کا تعلق اُردو سے

مولوی عبدالحلیم شررؔ

علم الالسنہ یعنی فیلالوجی نے دنیا میں عجیب عجیب کرشمے دِکھائے ہیں اُس عہد کے واقعات نظر کے سامنے کر دِیئے۔ جب کہ سلف کو بعد والی نسلوں کی اطلاع کے لئے اپنے کارناموں کے زندہ رکھنے کی کوئی تدبیر نہیں معلوم تھی۔ نوعِ انسان کے بچپن کے سفروں اور آغاز شعور انسانی میں آدمیوں کی نقل وحرکت اور سیر وسیاحت کے حالات ہمیں اُسی زندگی بخش فن سے معلوم ہوئے۔ ہمارے مجہول العہد بزرگوں کے نقش قدم جو قدیم الایام کی جلا وطنیوں اور صحرانوردیوں سے صفحۂ زمین میں جابجا بن گئے تھے۔ اُنھیں ہم نے اِس جدید علمی عینک کی مدد سے دیکھ لیا۔ اور اُسی کی مدد سے روز بروز بعید سے بعید اور گہرے سے گہرے واقعات کا اِنکشاف ہوتا جاتا ہے۔

مگر سب سے بڑی برکت و نعمت وہ انکشاف ہے جو اس عینک کے ذریعے سے ہمیں خود اپنی زبان کے اندر نظر آئے ہیں۔ ہماری زبان سچ پوچھئے تو ایشیا کی اس سراپا عظمت قوم کے تفرق و اتصال کی زندہ تاریخ ہے۔ جس کی شاخیں نکلیں پھلیں پھولیں۔ ملیں۔ ہٹیں۔ بڑھیں۔ لڑیں ٹکرائیں

اور پھر ایک ہو گئیں ٭

اسی اُم السنہ کے طفیل میں فی الحال یہ طے شدہ تاریخی مسئلہ ہے کہ قدیم الایام میں تمدن انسانی کا سب سے ممتاز اور عظیم الشان درخت جو تاریخ میں آریہ کے نام سے مشہور ہے۔ وسطِ ایشیاء کے ایک مردم خیز خطے میں پھلا پھولا اور جب اس کی ایک ابتدائی قلم اس سے کاٹ کے ارضِ مغرب اور یونان و روم کی سوادِ میں نصب ہو چکی تو اور زیادہ پھیکا اور اس کی دو زبردست شاخیں بڑھنے اور پھیلنے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک مشرق کی طرف بڑھ کے ہندوستان پر سایہ فگن ہوئی اور دوسری مغرب میں پھیل کے مملکت عجم کی بہار بن گئی۔ ان دونوں شاخوں نے یہاں تک فروغ پایا کہ قدیم درخت کا اصلی تنہ فنا ہو کے صفحۂ ہستی سے غائب ہو گیا اور ان دونوں ممتاز سرسبز شاخوں نے ہندوستان و ایران کی زمینوں میں اپنے لئے نئے نئے تنے پیدا کر لئے۔ اب مقامی آب و ہوا کے اثر نے ان کو ایک دوسرے سے جدا اور مختلف خصوصیات سے متصف کرنا شروع کیا۔ اور دونوں میں جدا جدا خصائص و تشخصات پیدا ہو گئے ٭

آریہ قوم کی ان دو شاخوں کے ایک ہونے اور اس کے بعد پھر ملنے کی سچی تاریخ ہماری اردو زبان ہے۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا دراصل ہزاروں

سال کی مفارقت کے بعد ان دونوں شاخوں کا ہم آغوش ہوتا تھا ٭

کہا جاتا ہے کہ مسلمان عرب سے آئے اور وہ آریہ قوم سے نہیں - بلکہ باغ عالم کے ایک دوسرے درخت کی شاخ ہیں جو بنی سام کا درخت کہلاتا ہے اور شجرِ آریہ سے پہلے دنیا میں سرسبز ہو چکا تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے - تاجران عرب ظہور اسلام سے پہلے بھی جنوبی ہند کے مشرقی و مغربی سواحل پر آ آ کے بستے رہے - اور بعد میں بھی ان کے آنے اور توطن اختیار کرنے کا سلسلہ جاری رہا - اس کے علاوہ جب پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے ملک سندھ فتح کر لیا تو کثرت سے عربی خاندان آ آ کے سندھ، کچھ - کاٹھیاواڑ اور گجرات میں سکونت پذیر ہو گئے - یہ فی الحقیقت عربوں اور بنی سام کا آنا تھا ٭

لیکن مسلمانوں کا وہ آنا جس نے ہندوستان پر گہرا اثرِ تمدنی ڈالا - جس سے ہندوستان کی موجودہ معاشرت بھی اور اس کی موجودہ زبان پیدا ہوئی - اس کا آغاز سچ پوچھئے تو محمود غزنوی کے حملوں سے ہوا - یہ عربوں کا آنا نہ تھا بلکہ ایرانیوں - اور فارسیوں کا آنا تھا جو دراصل اُسی قدیم آریہ شاخ کے پھل پھول تھے - محمود غزنوی خاص عجمی نژاد اور آل ساسان کی نسل سے تھا اور اسکی فوج میں علی العموم وہی لوگ تھے جو ایرانی تھے یا تورانی

جن کو ایرانی اپنا ہم نسب اور ہم نژاد بتاتے تھے غزنویوں کے بعد غوری سلاطین اسلام کا عہد شروع ہوا وہ بھی گو مذہباً مسلمان تھے۔ لیکن بلحاظ انساب تورانی تھے۔ پھر غلاموں کا عہد آیا۔ اور وہ بھی تورانی تھے چند روز کے لیئے سیّدوں کا کمزور زمانہ رہا اور پھر حکومت عجمی الاصل خاندانوں کے ہاتھ میں آگئی لودی تغلق اور مغل یہ سب تورانی اور اہل عجم کے بنی عم تھے۔ بہر حال ہندوستان میں مسلمانوں کا جو متمدن دربار قائم ہوا۔ اور جس نے ہندوستان کی سوسائٹی کو اپنے رنگ میں رنگا وہ سامی نہیں آریہ دربار تھا۔ اور اس میں مطلق شک وشبہ نہیں کیا جاسکتا کہ اگرچہ یہ لوگ دین اسلام کے پیرو ہونے کی وجہ سے عربوں کی عزت کرتے اور عربی معاشرت کے دلدادہ تھے۔ مگر بذات خود آرین تھے اور ان کا آنا آریہ قوم کی دو شاخوں کا ملنا تھا۔

فی الحال کوشش کی جاتی ہے کہ پرانہ رشتہ زندہ کر کے یورپ والوں کو اہل ہند کا بھائی ثابت کیا جائے اور مسلمان ایک غیر قوم بتائے جائیں جس کو آریہ قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی اور اس میں اپنا جداگانہ دربار قائم کیا وہ بنی سام نہیں آریہ تھے۔ عربی نہیں فارسی بولتے ہوئے ہندوستان میں آئے تھے اور اہل ہند سے بمقابل اہل یورپ کے زیادہ قریب کا رشتہ رکھتے تھے

اس کے ماننے میں ہمیں عذر نہیں کہ ایران کے آریوں کو ہندوستان میں آنے سے پہلے عربی اثر نے مغشوش کر دیا تھا۔ لیکن ایرانیوں سے زیادہ یورپ کے آریوں کو کولٹ ہن۔ گاتھ اور تاتاری قومیں مغشوش کر چکی تھیں۔ بہر حال اس میں ذرا بھی شک نہیں کیا جا سکتا کہ اہلِ یورپ کی نسبت یہ عجمی۔ فاتح ہندوؤں کے زیادہ قریبی رشتہ دار تھے ؎

لیکن سامی و آریہ دونوں نسلوں کے تازہ وارد مسلمانوں نے گو کہ پہلوں کی زبان عربی اور دوسروں کی فارسی تھی۔ اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی یہاں کی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی اور اس ملک کی زبان کو نہایت سرگرمی اور ذوق و شوق سے حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اہلِ عرب ۹۳ھ (۷۱۱ء) میں واردِ سندھ ہوئے تھے اور پرانا عربی مؤرخ بلاذری لکھتا ہے کہ اس کے اٹھائیس ہی سال بعد یعنی ولید بن یزید کے عہد میں اہلِ سندھ عربی بولنا درکنار اس زبان کی تعلیم میں ترقی کرنے لگے تھے۔ چند ہی روز میں عربی زبان کے سندھی نژاد شعراء نے یہاں تک نمود حاصل کر لی کہ ان کے اشعار بلادِ شام و عرب میں مشہور ہوگئے + اور ان کا نام ارضِ عرب کی علمی صحبتوں میں عزت سے لیا جانے لگا۔ چنانچہ اس عہد کا ایک شاعر لسانِ عرب جس کا لقب ہی سندھی تھا آج تک مشہور ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ متوطن سندھ عربوں نے بھی سندھی زبان ذوق و شوق سے

سیکھنا شروع کر دی تھی ۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد عربوں کا انہماک ہندوستان کی زبانوں میں یہاں تک بڑھا کہ سندھی زبان کے عربی نژاد شاعر پیدا ہونے لگے جن کا کمال یہاں کی مہذب صحبتوں اور معزز درباروں میں بہت مقبول تھا ۔ اُس زمانے کا ایک مشہور سیاح بزرگ بن شہریار خان ناخدا جس کا سفر نامہ دار السلطنت روس میں چھپا ہے ۔ لکھتا ہے سنہ ۲۷۰ھ (۸۸۳ء) میں کسی ہندو راجہ نے مسلمان حاکم سندھ کو لکھا مجھے مسلمانوں کے عقائد سے مطلع فرمایئے سندھ کے فرمانروا نے یہاں ایک ماہر السنہ ہندو شاعر کو بلا کے حکم دیا کہ آپ عقائد اسلامیہ کو سندھی زبان میں لکھ دیں ۔ وہ ہندوستان کی کئی زبانیں جانتا تھا اور سب میں شعر کہتا تھا ۔ اس راجہ کی زبان میں ایک نہایت ہی فصیح و بلیغ نظم لکھی ۔ جس میں شریعتِ اسلامیہ کے کل اُصول و قواعد موزوں کر دئے تھے اس نظم کو سب نے پسند کیا اور وہ راجہ کے پاس پہنچی تو شاعر کی قادر الکلامی کی بیحد داد دی ۔ اُس کا مشتاق ہوا اور حاکم سندھ کو لکھا آپ اِس شاعر کو میرے پاس بھیج دیں ۔ وہ شاعر گیا جس سے راجہ نے قرآن مجید کا ہندی زبان میں ترجمہ کرایا اور اُسے بہت کچھ انعام و اکرام دے کر رخصت کیا ۔

اس کے بعد جب قدیم سیاحان عرب اصطخری ابن حوقل

انباری اور مسعودی وغیرہ سندھ آئے ہیں اُن کے بیانوں سے یہ نتیجہ بخوبی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سندھ میں ہندو مسلمانوں کا میل جول اس قدر بڑھ گیا تھا کہ ہندو عربی معاشرت سے اس قدر متاثر نہ ہوئے تھے۔ جس قدر خود عرب ہندوستانی معاشرت سے متاثر ہو گئے تھے۔ عربوں نے یہاں کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہاں کی عورتوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ یہاں کی زبان بولتے تھے۔ اور یہیں کے رسم و رواج کے پابند تھے ؎

غزنوی کے حملوں سے نظر آتا ہے مگر در اصل ابو ریحان بیرونی کی علمی کوششوں سے ہُوا۔ جس کے وطن میں اگرچہ بڑا اختلاف ہے۔ مگر میرے خیال میں سندھ کے فنا شدہ شہر بیرون یا نیرون کے رہنے والا اور اس ہندی آمیز اسلامی تمدن کی یادگار تھا۔ جو حسبِ بیان متذکرہ بالا سندھ میں قائم ہوگئی تھی۔ اس نے عربی و سنسکرت دونوں زبانوں میں کمال پیدا کیا۔ ہندوستان کے اندرونی شہروں اور ہندوؤں کی قدیم علمی مدرسگاہوں میں طالب علمی کی ہندوؤں کے علوم عربی میں اور عربوں کے علوم سنسکرت میں منتقل کئے اور برسوں ان شہروں میں رہ گئے جہاں اسلام کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہاں کی مروجہ زبانیں سیکھیں اور ایک ایسا عجیب و غریب شخص بن گیا کہ آج تک مغرب کی علمی دنیا میں حیرت و ادب کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ؎

اسی عہد سے وابستہ فارسی کا مشہور شاعر مسعود سلمان ہے۔ جس کی نسبت تذکرۂ مجمع الفصحاء میں لکھا ہے "وے را سہ دیوان بودند، تازی، ہندی، فارسی۔"

مولانا شبلی لکھتے ہیں "تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ہندی زبان میں اس (مسعود) نے ایک دیوان لکھا تھا۔"

اس کا خاندان اگرچہ ملکِ عجم سے آیا تھا وہ خود لاہور میں پیدا ہوا تھا۔ اور اسی وجہ سے زبانِ ہندی کا اتنا بڑا زبان دان ہو گیا کہ اس کثرت سے وطنی زبان میں شعر کہتا تھا کہ ان کا ایک مستقل دیوان مدوّن ہو گیا۔

یہ غزنویوں کے عہد کا ایک نامور شاعر تھا۔ اس کے چند ہی روز بعد مولوی محمد حسین آزاد مرحوم لکھتے ہیں کہ شہاب الدین غوری کے عہد میں ہندوستان کے مشہور ہندی شاعر چند کوی نے پرتھی راج راسا لکھی۔ تو اس کے کلام میں کثرت سے فارسی۔ عربی الفاظ موجود تھے۔

یوں تو دو قوموں کے ملتے ہی باہم مبادلۂ الفاظ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر اس لین دین کی حقیقی منڈیاں دو ہوا کرتی ہیں اوّل بازار جہاں ضروری اشیا کی خرید و فروخت کے ساتھ لفظوں کا سودا بھی ہونے لگتا ہے اور دوسری نغمہ و سرود کی صحبتیں۔ خصوصاً جب ایک قوم کی محفل میں دوسری قوم کے مغنی آئیں اور

اپنی زبان کے گیت دلکش نغموں میں سنائیں۔ عوام پہ بازار کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اور خواص یعنی امیروں۔ دولتمندوں اور معزز لوگوں پہ عیش و طرب کی صحبتیں زیادہ اثر ڈالتی ہیں۔ عام مسلمانوں کے لیئے بازاروں میں الفاظ کے لین دین کی تجارت تو اسی دن کھل گئی تھی۔ جس دن مسلمان ہندوستان میں آئے تھے۔ مگر بزم طرب کی محفلیں اس وقت گرم ہوئیں جب مسلمان فرماں رواؤں نے اپنے دربار میں ہندو مغنیوں کو جگہ دی اور گانے والے طائفے نوکر رکھے۔ ساتھ ہی مشائخ صوفیہ نے ادھر توجہ کی۔ اور موسیقی کے روکنے کے لیئے مسلمانوں کے دروازوں پر جو مذہبی پہرہ تھا وہ اُٹھ گیا علما نے اس سے اختلاف کیا۔ مگر قاضی حمید الدین ناگوری نے سلطان شمس الدین التمش کو اپنی ایک کرامت دکھا کے علماء کے فتوؤں کے خلاف مجلس سماع کا ایسا گرویدہ کر دیا کہ مشائخ کی محفلوں میں طبل و سرود کا نغمہ گونجنے لگا۔

شمس الدین التمش نے عربی و عجمی نژاد مشائخ کا شوق پورا کرنے کے لیئے غالباً ایرانی مغنیوں کو اپنے دربار میں جگہ دی ہوگی۔ مگر اس کا بیٹا فیروز شاہ گانے کا ایسا دلدادہ ہوا کہ بڑے بڑے گویئے دُور دُور سے آ کے اس کی محفل نشاط میں جمع ہو گئے اور ہر شہر اور ہر قصبے سے گانے ناچنے والی عورتوں نے دلی میں آ کے بسنا شروع کر دیا۔ جن میں سے بعض چوٹی کے صاحب کمال مطربوں اور مغنیوں کو اس کے دربار

میں خاص جگہ مِل گئی - فیروزشاہ کے بعد یہ سلسلہ برابر بڑھنا شروع ہو گیا - معزالدین کیقباد - جلال الدین خلجی دولتِ مغلیہ سے پیشتر کے وہ پُرانے تاجدارانِ ہند ہیں جن کو موسیقی کا بہت شوق تھا اور اِن کے شوق نے دِہلی میں خصوصاً اور سارے ہندوستان میں عموماً ہزارہا مطرب و مغنی پیدا کر دیئے ۔

ابن بطوطہ کو دلی اور دولت آباد دونوں شہروں میں "طرب آباد"، نام کے محلے نظر آئے - جن میں صرف ڈوم ڈھاڑیوں کی آبادی تھی اور یہی نہیں کہ اِن میں فقط ہندو" مغنی آباد ہوں - ہندو مسلمان دونوں تھے - مسلمان بھی معمولی مسلمان نہیں بلکہ دیندار اور پابندِ شرع گویئے جن کی وجہ سے اِن محلوں میں مسجدیں تھیں اور خوب آباد تھیں اِن میں پنجوقتہ نماز ہوتی اور رمضان میں جماعت سے تراویح پڑھی جاتی - شاہی درباروں میں عموماً اربابِ نشاط کے داروغہ یا چودھری مسلمان تھے جو اکثر ایرانی الاصل ہوتے - اِن دو عنصروں کے ملنے سے فنِ موسیقی کے مسائل میں باہمی رَدّ و بدل اور داد و ستد کے اصول کا جاری ہونا یقینی ہے - مگر اِسی سلسلہ میں موسیقی سے زیادہ اس لین دین کے عمل کے الفاظ میں جاری ہو جانا لازمی تھا ۔

چندہی روز میں یہ علمی تجارت اور زیادہ ترقی کر گئی - کشمیر کے حکمران سلطان زین العابدین نے جو فارسی کے علاوہ ہندی اور تبتی زبانوں میں پورا دخل رکھتا تھا

اکثر عربی و فارسی کتابوں کا ترجمہ ہندی میں اور بہت سی ہندی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کرایا۔ اور سب سے پہلے اُسی کے حکم سے مہابھارت اور راج ترنگی (قدیم تاریخ کشمیر) کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔

اسی زمانے میں امیر خسرو کے اشعار مشہور ہوئے جنھوں نے دہلی میں نشو و نما پایا تھا۔ وہ شاعری کے علاوہ موسیقی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ انھیں ہندوستان کا گانا ہندوستان کا مذہب غرض یہاں کی ہر چیز پسند تھی۔ اور اُنھوں نے ہر چیز میں کمال پیدا کر کے سخن آفرینی کی بلکہ اُنھوں نے دونوں جگہ کے علوم و فنون کیسا تھ دونوں زبانوں کو بھی ملایا۔ اور فارسی و ہندی الفاظ کو باہم مربوط کر کے ایسے نئے نئے جوڑ جوڑ لگانا شروع کئے۔ ایک منظوم کتاب میں عربی۔ فارسی اور ہندی کے ہم معنی یا مترادف الفاظ جمع کر دئے۔ جو خالق باری کہلاتی ہے۔ اور اگلے نصاب تعلیم میں داخل تھی۔ اس کتاب میں مختلف لفظوں کو ایک سلسلے میں منظوم کرنا ہی بجائے خود ان کو باہم ملانا اور جوڑنا تھا۔

اس کے بعد ہندوؤں نے فارسی پڑھ کے سلطنت کے دفاتر فارسی میں ملازمت شروع کی اور اسی کے مقابل بعض سلطنتوں نے اپنے دفتروں کو خالص ہندوستان کی وطنی زبان میں رکھا اور مسلمان ملازمت کے لئے یہاں کی وطنی زبان علمی حیثیت سے سیکھنے لگے۔

یہ تمام باتیں صاف طور پہ بتا رہی ہیں کہ ان دونوں

مسلمانوں اور ہندوؤں میں یہاں میل جول اور ربط و ضبط کس قدر بڑھ گیا تھا اور اس ربط و ضبط اور اتفاق و یکجہتی کا پھل جو قیامت تک ہمارے گزشتہ اتحاد کو نہ بھولنے دے گا وہ ہماری اُردو زبان ہے۔ اس کا بٹنا در اصل اس مبارک عہد کی یادگار مٹ جانا ہے جب ہم دونوں میں دوستی کے درجے سے بڑھ کر عزیز داری و قرابت کا رشتہ خوب مضبوطی کے ساتھ قائم تھا۔

ہر چیز کی تولید کے لئے والدین کی ضرورت ہے اور جس شخص یا چیز کی اصلیت کا پتہ لگانا ہو تو ہمیں اس کے حقیقی ماں باپ کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ اُردو کے ماں باپ اس میں ذرا شک نہیں کہ بھاشا اور فارسی ہیں جو اِس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ بھاشا وہ اصلی سرزمین ہے۔ جس میں یہ پودا اُگا اور جس کی آب و ہوا میں اس کا نشو و نما ہوا۔ بمقابل اس کے فارسی کو اس زبان کی ولادت میں باپ کی حیثیت حاصل ہے۔ جس نے زمین ہند کے بطن میں ایک نئے بچّے کے لئے خماتی مادہ پیدا کر دیا۔ جن لوگوں نے مسئلہ تولید میں غور کیا ہے۔ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ہر بچے میں جس قدر زیادہ اثر ماں کا ہوتا ہے باپ کا نہیں ہوتا۔ اس کا سارا جسم تمام اعضاء گوشت پوست رگ و پے سب ماں کے ہوتے ہیں۔ اس میں بعض پدری خصائل و عادات مخفی رہا کرتے ہیں۔ جو اکثر ثبوت دیدیا کرتے ہیں کہ کس باپ کا بچہ ہے۔

یہ دونوں اثر اُردو زبان میں صاف نظر آرہے ہیں - یعنی ڈھانچہ نظامِ نحوی اصول اشتقاق سب خالص ہندی اور بھاشا کے ہیں - فارسی و عربی الفاظ عزیز و پسندیدہ مہمانوں کی طرح آکے اس طرح رل مل گئے کہ ایک جان دو قالب ہو گئے ہیں۔ آخر زمانے میں بہت سی فارسی کی بندشیں بھی پوری پوری ترجمہ کر کے زبان میں شامل کر لی گئی تھیں - بلکہ بعض شعراء نے یہاں تک کیا کہ ان فارسی بندشوں کو اسی فارسی ترکیب سے اُردو میں نقل کر لیا - لیکن غور سے دیکھیے تو وہ بندشیں بالکل بے ربط ہیں اور اسی وجہ سے کبھی زبان میں شامل نہ ہو سکیں - انشاء اللہ خان اور مظہر جان جاناں کی جو گفتگو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے آبِ حیات میں نقل کی ہے اسے پڑھ کر حیرت ہوتی کہ ان دونوں فارسی لفظوں کے ساتھ فارسی بندشوں کو بھی لوگ کیسی بے احتیاطی سے گفتگو میں شامل کر دیتے تھے - سید انشاء کہتے ہیں "ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائلِ ربیان اور اوائلِ ربیان سے الی آلان اشتیاقِ مالا یطاق تقبیلِ عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلکِ تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے"۔

مرزا صاحب جواب دیتے ہیں "اپنے تئیں کون بھی بہ دو طفلی سے تمہیں ایسے اشخاص کیساتھ موانست اور مجانست درکار ہے"۔

اسی قسم کی چند بندشیں مرزا غالب کے اشعار میں

بھی ہیں - لیکن اُن دِنوں لوگوں کی زبان سے ایسی ترکیبیں محض اس وجہ سے نِکل جاتی تھیں کہ درباری زبان فارسی تھی - فارسی شعر و سخن اور ایرانی ادب کی تہذیبی مجلسوں میں زیادہ قدر تھی - فارسی دانی کا اظہار بات کرنیوالے کی علمی قابلیت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا اور لوگوں کو اپنی لیاقت ظاہر کرنے کے شوق میں اس کا خیال نہ رہتا تھا کہ فارسی کے استعمال میں کہاں تک بے احتیاطی کر رہے ہیں - بعینہٖ جس طرح آج کل اکثر انگریزی دان حضرات انگریزی لفظوں اور جملوں کے استعمال میں بے احتیاطی کیا کرتے ہیں اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ فارسی کا دَور ختم ہوتے ہی اس قِسم کی تمام بندشیں زبان سے نِکل گئیں اور چھن چھنا کے وہ زبان باقی رہ گئی جس کا ماخذ چاہے کہیں سے ہو مگر اب اُردو ہے اور خالص اُردو ٭

میں خیال کرتا ہوں کہ یہ اصول معلوم ہونے کے بعد کہ اُردو کا اصلی ڈھانچہ ہندوستانی ہے - اور اِس میں فارسیؔ و عربی الفاظ کا فقط ضامن پڑ گیا ہے - یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اُردو میں ہندی و سنسکرت اور فارسی و عربی کو کس حد تک کتنا اور کِس قِسم کا تصرّف کرنے کا حق حاصِل ہے - اُردو کے ساتھ مذکورہ بالا زبانوں کا رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد یہ مسئلہ بہت با اصُول طریقے سے صاف ہو جاتا ہے - اس کی بندشوں - نحوی ترکیبوں و ترتیب

الفاظ - افعال کی گردانوں - صفات و روابط کے استعمال اور ضمائر و صفات سے کام لینے میں دخل دینا خاص سنسکرت اور بھاشا کا حق ہے - اسمیں اگر عربی زبان دخل دے تو وہ زبان کو بنائے گی نہیں بلکہ بگاڑ دے گی - اس لیئے اردو کا اصلی ڈھانچہ بھاشا و سنسکرت سے ماخوذ اور انھیں کا بنایا ہوا اور بالکل آریہ اُصول کا ہے - فارسی کو اس میں دخل دینے کا کسی قدر حق حاصل ہو سکتا ہے اس لیئے کہ وہ بھی آرین زبان ہے - مگر اس کا کیا علاج کہ اُردو کا اشتقاق اور اس کی نحوی ترکیبیں بالکل بھاشا کے مطابق ہیں - رہی عربی اُسے تو اس میں دخل دینے کا مطلق حق نہیں ہے - بمقابل اِس کے عربی کو ترتیب و اُصولِ نحوی چھوڑ کے صرف یہ حق حاصل ہے - کہ اپنے ذخیرۂ الفاظ میں سے اُردو کو نئے نئے الفاظ دے - اس لیئے کہ تولید زبان میں اِس کا جو پہلا ضامن پڑا تھا - اس نے اردو کی بندشوں میں عربی الفاظ کو مہمان عزیز اور مانوس بنا دیا ہے - جس طرح ہر باپ کو حق ہے کہ وہ اپنے فرزند کو اپنے علمی و ادبی فنون سکھائے - اسی طرح عربی کو حق ہے - کہ اُردو کے لیئے نئی اِصطلاحیں مہیا کرے - اِس کے ذخیرے میں اپنے الفاظ سے وسعت و متانت پیدا کرے اور دنیا کو دکھا دے کہ یہ "بچہ" اگرچہ ہندی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے - مگر میرا

فرزند ہے۔

آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ اردو میں زبردستی چاہیے جس زبان کے اسم بے لیئے جائیں ربط نہیں کھاتے اس کے فطری اوزان سے باہر ہوتے ہیں۔ اور عربی الفاظ اس میں آتے ہی اس کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں اور یہ امتیاز کرنا دشوار ہوتا ہے۔ کہ وہ خاص اردو لفظ ہیں یا عربی سے لیئے ہوئے ہیں۔ اس لیئے جس طرح عربی فارسی کے لیئے یہ ناجائز ہے۔ کہ اردو کی نحوی ترکیبوں اور بندشوں میں دخل دیں اسی طرح بھاشا اور سنسکرت کے لئے ناجائز ہے کہ اس زبان کے ذخیرہ الفاظ میں نئے بغرمانوس الفاظ داخل کریں۔ جو اس کے فطری اوزان اور تلفظ و نوعیت کے خلاف ہیں۔

لیکن دونو کے حدود مقرر کر دینے کے بعد میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ زبان اردو کا چوکھٹا دراصل سنسکرت اور بھاشا کا بنایا ہوا ہے۔ اس لیئے یہ زبان خالص آرین زبان ہے۔ اور فارسی وعربی نے فقط اسے اپنے خوبصورت الفاظ کا زیور و لباس پہنا دیا ہے۔ اس بناء پر مدت دراز سے میری رائے ہے۔ کہ جو لوگ اردو صرف و نحو مرتب کرنے میں عربی قواعد زبان سے مدد لیتے ہیں۔ سخت غلطی میں مبتلا ہیں۔ عربی کے قواعد ہماری زبان میں ہرگز پورے نہیں اتر سکتے۔

نحو و صرف کی اصلی عمارت افعال کی بحث پر

قایم ہوا کرتی ہے - عربی اور ہیبرا خیال ہے - تمام
سامی زبانوں میں فعلوں کا اشتقاق بغیر کسی دوسرے
فعل کے بلائے فقط ایک حرف کے بڑھانے
گھٹانے یا حرکتوں کے بدل دینے سے ہوجاتا ہے
بخلاف اس کے آریہ زبانوں میں بغیر کسی دوسرے فعل
یا لفظ کے بلائے پیدا اشتقاق نہیں ہوسکتا ۔

اسی طرح نحو اردو کے صدہا مسائل ہیں -
جن کے بیان کرنے کا وقت نہیں ہے - مگر وہ سب
ثابت کرتے ہیں کہ اردو آرین زبان ہے سامی نہیں
اسی کے ساتھ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ اس زبان
کو جو انس اور جلیا اتحاد بھاشا اور سنسکرت سے ہے
فارسی و عربی سے نہیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اردو
سے اگرچہ ہندو مسلمان دونوں کو قریبی تعلق ہے - اور
دونوں اس کے پیدا کرنے والے ہیں مگر ہندوؤں
کا تعلق مضبوط اور بہت بڑھا ہوا ہے ۔

سرابِ حیات

سرسید احمد خان

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یونہی تمام ہوتی ہے

کس خیال میں ہو آج آپ کی طبیعت کچھ متفکر معلوم ہوتی ہے۔

نہیں کوئی بات نہیں یونہی سست ہے۔ آدمی کو کبھی کچھ خیال ہوتے ہیں کبھی کچھ۔ انہی خیالات سے کبھی آپ ہی آپ خوش ہوتا ہے کبھی آپ ہی آپ متفکر ہو جاتا ہے۔

بھلا کہیے تو کن خیالات نے آپکو متفکر کیا ہے۔ ہم بھی تو سنیں۔

چند روز ہوئے کہ ایک گھنٹہ میں نے اپنے کمرے میں لگایا ہے اس کا لنگر ٹوٹ گیا تھا وہ بند تھا نہ چلتا تھا نہ آواز دیتا تھا ایک دوست نے مہربانی سے اس کو بنا دیا وہ چلنے لگا اور آواز دینے لگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ وہ دن رات چلتا ہے ایک سے اپنا دورہ شروع کرتا ہے اور بارہ پر ختم کر دیتا ہے اس کی ایک الٹ پھیر میں دن رات ختم ہو جاتا ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا تو معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں۔ یہی دھن کئی دن سے مجھے لگی ہوئی تھی اور اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا کہ یکایک ہمارے دوست یاد دہی رجب علی صاحب نے ایک کتاب بھیجی جس کے سر پر لکھا

تھا "سرابِ حیات" میں بہت خوش ہوا اور سمجھا کہ شاید اس سے کچھ عقدہ حل ہو گا ۔

یہ کتاب در اصل انگریزی میں ہے اور جانس نے بڑی فصاحت و بلاغت سے لکھی ہے، اس کا ترجمہ پنڈت بشمبر ناتھ صاحب نے کچھ کمی بیشی کے ساتھ نہایت قابلیت سے اُردو زبان میں کیا ہے ۔

اس کتاب میں مصنف نے نہایت لائق اور مشہور ۔ عقلمند اور دولتمند ۔ فصیح و ظریف ، شاعر و فیاض اور بخیل آدمیوں کا جو ہمارے زمانے سے تھوڑے ہی دن پہلے اس دنیا میں موجود تھے ذکر کیا ہے اور پھر دکھایا ہے ۔ کہ کس حسرت و افسوس سے اس دنیا سے گئے ۔ تمام مال و دولت چھوڑ گئے ۔ نہ وہ عقلمندی کام آئی اور نہ وہ متاعِ دنیا ۔ زبانِ حال سے یوں کہتے کہتے مر گئے ؎

کس لئے آئے تھے ہم کیا کر چلے
تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے

اِس کتاب نے بجائے سلجھانے کے میرے خیالات کو اور اُلجھا دیا اور یہ سوال دِل میں پیدا ہوا کہ "کس لیے آئے تھے ؟" اسی سوچ میں تھا کہ میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا ۔ ایک خوشنما ندی اور سرسبز درخت اور شاداب کھیتی پر میری نظر پڑی ۔ میں نے دیکھا کہ ندی کا پانی بہا چلا جاتا ہے ۔ پچھلا آتا ہے اور اگلا چلا جاتا ہے ۔ درختوں کو میں نے دیکھا کہ پرانے جاتے ہیں اور نئے آتے ہیں پکی کھیتی کاٹی جاتی ہے اور نئی بوئی جاتی ہے

بھی آواگون لگ رہا ہے یہ کس لیے آئے تھے اور کس لئے گئے
کیا یہ بھی کچھ حسرتیں لے گئے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ مگر میں
نے غور کیا کہ شاید یہ مسئلہ کہ کس لئے آئے اور کیا کر چلے
متحرک جانداروں سے متعلق ہوگا۔ میں نے سب کی حالت
پر اپنا خیال دوڑایا۔ میں نے شیر کا خیال کیا جو سب سے
زیادہ خوبصورت۔ سب سے زیادہ شاندار۔ سب سے زیادہ
شجاع سب سے زیادہ غیور۔ مگر سب میں زیادہ ممدوح
اور بآزار مشہور ہے۔ جب اس کی مردہ لاش کا میں نے خیال
کیا تو دیکھا کہ ایک بے حرکت لاش۔ پھول کر پیٹ پھٹا ہوا
انتڑیاں گیدڑوں کی کھائی۔ سنہری کھال خاک میں ملی ہوئی۔
گوشت گل کر زمین پر پڑا ہوا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا اور غالباً
وہ بھی چند روز کو۔ میں سمجھا کہ یہ تو اسی قسم کا جانور
تھا۔ جس قسم کے آدمیوں کا "سراب حیات" میں جانسن نے
ذکر کیا ہے۔ کسی اس سے عمدہ جانور کو دیکھو۔

اتنے میں کتے کا مجھے خیال آیا میں سمجھا کہ سب جانوروں
میں یہی خدا رسیدہ ہے۔ قناعت۔ محبت۔ رفاقت۔ دوستی
وفاداری اپنے مالک کی اطاعت اور سب سے زیادہ کسر نفسی
اسی پر ختم ہے۔ سب دور دور کرتے ہیں۔ مثلاً بہت
سے تو نجس العین بتاتے ہیں۔ مگر یہ غریب سب کے
سامنے عاجزی و کسر نفسی سے دم ہلاتا اور سر جھکاتا ہے
مگر جب وہ بھی مرا تو ایک لاش بے حرکت تھا نہ وہ
دم ہلاتا تھا۔ نہ وہ سر کا جھکانا تھا نہ وہ رفاقت تھی نہ
وہ اطاعت تھی۔ چند روز میں اسی طرح ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا

منہ کھلا - جبڑا ننگا - دانت اور پسلیاں کھلی ہوئی اور ہزاروں چیونٹیاں اس میں گھسی ہوئی ہیں نہایت متعجب ہوا اور کہا کہ میاں انجام دونوں کا ایک سا ہی ہوا *

میں نے کہا نہیں ! کسی مقدس جانور کو دیکھیں نے کبوتر کا خیال کیا جو دنیا میں سب سے مقدس شمار ہوتا ہے بھولی بھالی صورت - پیاری پیاری باتیں - جورو خصم میں نہایت محبت - دونو کا سوشیل برتاؤ - نہایت میٹھا - تقدس میں بھی سب سے زیادہ بڑھا ہوا - نوح کے لئے زیتون کی مبارک ٹہنی لانے والا - مکہ معظمہ میں کعبہ کا طواف کرنے والا تمام خانقاہوں کا مجاور ہو کر رہنے والا اپنے پروں کی ہوا سے بیماروں کو شفا بخشنے والا - تمام ہندوؤں اور بدھ مت لوگوں کو جی کے بچاؤ کی ہدایت کرنے والا *

مگر جب اس کا بھی انجام دیکھا تو اس سے زیادہ کچھ نہ پایا کہ پر نچے ہوئے کہیں پڑے ہیں - چونچ کہیں اور پنجے کہیں - چند روز میں سینے کا ڈھانچہ پڑا ہے پھر بھی نہیں *

میں نے اپنے خیال کو انسان کی طرف پلٹا کہ یکایک میرے سامنے سلطان عبدالحمید خان کا ماجرا آموجود ہوا جو نہایت مشہور اور بہادر شخص تھا - لڑائیوں میں نہایت دلیری و دانائی سے لڑا تھا - پندرہ برس سے قسطنطنیہ کے تخت شاہی پر جلوس کرتا رہا - لوگ کہتے ہیں نہایت فضول خرچ تھا - ملک میں روپے کی کمی تھی - شاہی خزانہ خالی تھا - باغیوں سے سلطنت میں آفت برپا تھی - مگر اس

نے کئی کروڑ روپیہ اپنے خزانہ میں عیاشی کے لئے چھپا
رکھا تھا۔ اپنی پیاری جورو کی خوشی کے لئے لڑکوں کی
ولی عہدی کی پرانی رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اس جورو
سے جو بیٹا تھا۔ اس کو ولی عہد بناتا تھا۔ اور ملک کی
بربادی کا کچھ خیال نہ کرکے اس کام کے پورا کرنے
کے لئے ملک کے دشمنوں کو اپنا دوست بناتا تھا۔
کیا دیکھتا ہوں کہ اپنے جرموں میں اسی کی سلطنت کے
لوگوں نے اس پر یورش کی۔ تخت سے اتار دیا۔ اور محل سے نکال ایک
چھوٹے سے مکان میں قید کردیا۔ سلطنت جانے کی حسرت نے اس
کے دل کو بیتاب کردیا۔ اور اپنے تئیں آپ مار مرا۔ میرے خیال
نے جھٹ ہاتھ دوڑایا پہلے تو ماتھے پر رکھا۔ پھر نتھنوں
کے سامنے لے گیا کہ شاید کچھ سانس چلتی ہو۔ سینے کو
ٹٹولا ہاتھ کو دیکھا۔ پاؤں کو دیکھا چاروں طرف غور کی۔
بجز ایک لاش کے کچھ نہ پایا۔ سینے پر کان لگایا کہ شاید
وہ ہڈیاں اچھل رہی ہوں۔ مگر کچھ پتہ نہ لگا میں سمجھا
کہ اب اس میں کچھ نہیں۔ چند روز میں یہ گوشت بھی
نہ ہوگا۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچا رہ جائیگا اور چند روز
بعد وہ بھی نہ ہوگا۔ مجھے جانسن کی "سرابِ حیات" یاد آئی
اور سمجھا کہ دنیا کی حسرت میں مرا اس لئے اس بدحالی ہوا
مجھ کو اشتیاق ہوا کہ کسی بڑے خدا رسیدہ دنیا
کی طرف سے پژمردہ مرے ہوئے کا حال دیکھوں۔ پنجاب کا
نہایت متبرک شخص میری آنکھوں میں پھر گیا۔ اس کو
دیکھنے سے بہت خوش ہوا۔ خدا کے سوا اور کچھ کام نہ تھا

عبادت کے سوا اور کچھ کام نہ تھا۔ دنیا اور اس کا عیش
بعض بے حقیقت تھا۔ جو لو تھی وہ خدا سے اور عقبیٰ
سے لگی ہوئی تھی اتفاق سے ان کا بھی آخری وقت آ
پہنچا۔ اپنی اول منزل کی انہوں نے وصیت کی اور اچھے
دوستوں کو نصیحت۔ نہایت شاداں و فرحاں سفر کی
تیاری کی۔ اور بغیر کسی ارمان و حسرت کے جان دی۔ میرے
خیال نے جھٹ ہاتھ بڑھایا ماتھے پر رکھا۔ نتھنوں کے
سامنے گیا۔ دل ٹٹولا۔ سینہ ٹٹولا۔ ہاتھ دیکھا پاؤں دیکھا
کچھ نہ تھا۔ سینے پر ٹکٹکی باندھی کہ اس کے اندر سے ضرور
کچھ روشنی جھلکتی ہو گی۔ مگر کچھ نہ تھی میں گھبرایا اور بے
اختیار بول اٹھا کہ اجی حضرت! کچھ بولو تو سہی۔ وہاں
کیا تھا۔ سانس بھی نہ تھی میں نے کہا یہ تو ویسا ہی
معاملہ ہو گیا۔ جیسا کہ ان سے پہلوں کے ساتھ ہوا تھا
دنیا کی حسرت لے جانے اور عبادت کے شوق میں مر
جانے میں تو اب تک کچھ فرق نہیں دکھائی دیا۔
اتنے میں لوگ ان کی تجہیز و تکفین کرنے لگے خانقاہ
میں اگلے سجادہ نشینوں کی قبروں کے برابر قبر کھودنے لگے
میں نے گھبرا کر کہا کہ دو چار دن رہنے تو دو۔ مجھے تو سمجھ
لینے دو کہ یہ ماجرا کیا ہے لوگوں نے کہا پاگل ہوا ہے
مردوں کو کوئی رکھتا بھی ہے تمام کھال پھس جائے گی
گوشت گل پڑے گا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ نکل آوے گا
کوے اور چیلیں منڈلانے لگیں گی یہ سن کر میں تو
ششدر رہ گیا۔ تمام اگلے لاشے میری آنکھوں میں

پھر گئے۔ میں نے کہا میاں اور سب کا بھی تو یہی حال ہوا تھا۔ کیا یہی بات سچ ہے؎

چو آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مردن چہ بر روئے خاک

میں نہایت متردد و متفکر۔ حیران و ششدر وہاں سے اُٹھا اور دل بہلانے کے لئے اپنے باغ میں گیا جو ایک بہت بڑا باغ تھا اور جوانی اور دلولے کے زمانے میں میں نے اس کو از سرِ نو نہایت خوبصورت و خوش نما آراستہ کیا تھا اور وہاں اکثر دوستوں کا اور بڑے بڑے نامی اور باکمال لوگوں کا مجمع ہوتا تھا۔ غالب کی دلکش و محبت آمیز بزرگانہ باتوں سے آزردہ کی دلربا فصاحت سے شیفتہ کی متین و نیم خندہ زن وضع سے۔ صہبائی جان نواز کے میخانۂ محبت سے دل شاد شاد رہتا تھا۔ اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ ایک چمن میں پہنچا جس کی نیو نئی کھدوائی ہوئی تھی۔ مٹی میں ایک ہڈی دکھائی دی جس کو میں بکرے کی سری سمجھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر پرے پھینکدیا۔ جب وہ نکلی تو بکرے کی سری نہ تھی بلکہ آدمی کی کھوپری تھی۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ ایک دن اسی طرح کوئی شخص میری کھوپری کو بھی ماریگا میں نے دوڑ کر اسے اٹھا لیا اور دیکھا کہ صرف ہڈیاں جڑی رہ گئی ہیں۔ پیشانی کی ہڈی پر خط خط ہیں۔ شاید وہی نوشتۂ تقدیر ہے۔ جو پڑھی نہیں گئی۔ آنکھوں کی جگہ ایک گڑھا و حلقہ تھا۔ انگلی ڈالو تو کچھ نہیں۔ ناک کی خوبصورتی بالکل نہ تھی ایک شکستہ تھوڑی سی اونچی نہایت بد نما

ہڈی کا نشان تھا اور اس کا سوراخ نہایت بُرا معلوم ہوتا
تھا۔ دانت جن کو موتی اور اولوں کی باڑھ کہتے تھے۔
ایسے ہیبت ناک دکھائی دیتے تھے۔ کہ دل کانپتا تھا
میں نے اپنی بے ادبی کی جو نادانستہ ہوئی تھی معافی
چاہی اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ کیا مذہب تھا۔ عالم تھے فقیر
تھے دنیا کی حسرت میں مرے یا خدا کی عبادت میں؟ ہر
چند پوچھا۔ کچھ جواب نہیں ملا۔ پھر میں اس کو اُلٹ پلٹ
کر کے دیکھنے لگا کہ شاید کچھ نشان بھلائی برائی کا ملے
کچھ نہ ملا۔ ایک بڈھا باغبان میری ان سب باتوں کو
دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں کیا دیکھتے ہو۔ اچھے
اچھے۔ بُروں کا گیدڑ بھیڑئیے کا مرے پر سب کا ایک
حال ہو جاتا ہے۔ میں سخت متعجب ہوا اور جانس کی
" سراب حیات کو یاد کیا۔ پھر اس نے کیا کہا تمہارے
خیال بھی بہت خام ہیں اور تمہارے متفکر ہونے پر
بھی نہایت افسوس ہے تم اس مٹی کے ڈھیر اور سڑنے
والے گوشت اور گلنے والی ہڈیوں میں کیا ڈھونڈتے
تھے؟ جو چیز دیکھنے کی تھی وہ تو اس میں تھی ہی نہیں ٭
میں نے پوچھا کہ وہ پھر کہاں تھی؟ اس نے کہا کہ
معلوم نہیں۔ پھر پوچھا کہ کیسی تھی؟ بولا کہ معلوم نہیں۔
پھر پوچھا کہ دکھائی دیتی تھی؟ کہا نہیں۔ پھر پوچھا کہ
کہاں گئی؟ کہا معلوم نہیں ٭

اس سوال جواب سے میں اور بھی متحیر ہوا کہ جس چیز
کا کسی طرح پر علم نہیں اس کی نسبت کہتا ہے کہ تھی۔ بولا کہ

خدا نے کہا ہے میں نے کہا سچ و لکن لیطمئن قلبی یہ سُنا
اور سُن کر خاموش ہو رہا۔ میں نے کہا یہ سب تمہارے
خیالات ہیں کہ وہ شخص دنیا کی حسرت میں مرا اور وہ شخص
خدا کی عبادت میں، مرے یہ سب برابر ہیں جو بات سچ
ہے وہ آپس کی ہمدردی قومی اعانت۔ قومی بھلائی ہے جبکہ
ہماری قوم کا دنیا میں یہ حال ہے کہ ذلت و خواری۔ نکبت و
جہالت میں مبتلا ہے تو اگر کوئی دنیا کی حسرت میں مرکر جہنم
میں گیا تو ہماری جوتی سے اور عبادت کرکے بہشت میں گیا
تو ہماری بلا سے۔ان کا کیا رونا ہے۔ جیتوں کو رو جو مردوں
سے بھی بدتر ہیں٭

زبانِ گویا

خواجہ الطاف حسین حالی

اے میری بلبل ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیوہ بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! سچ بتا تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں نیا مزا ہے۔ کبھی تو ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا اثر جادو کا اُتار۔ کبھی تو ایک افعیٔ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی۔ اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کو شکار کرتی تھی اور اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک کھیل ہے۔ جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کے بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کو سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا، اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بس کی گانٹھیں

اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں - کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل - کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے - ہماری عزت ہماری ذلت - ہماری نیک نامی - ہماری بدنامی ہمارا سچ ہمارا جھوٹ - ہمارا سچ تیری ایک "ہاں" اور "نہیں" پر موقوف ہیں - تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا ۔

اے زبان تو دیکھنے میں ایک پارۂ گوشت کے سوا نہیں مگر طاقت تیری نمونۂ قدرت الٰہی ہے - دیکھ اس طاقت کو رائگان نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا - راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور - دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا - تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی - دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا ۔

اے زبان تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز - کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرمِ راز - علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی - حوصلہ اس کا قفل ہے اور تو اس کی کنجی - دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا - وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین اور ارشاد تیرا کام ناصح مشفق تیری صفت ہے اور مرشد برحق تیرا نام خبردار

اس نام کو عیب نہ لگانا اور فرض سے جی نہ چرانا ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائیگا۔ اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے۔ تہمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے اور چغلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے نہیں! ہرگز نہیں!! اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے۔ بلکہ سراسر زیان ہے اگر تیرا قول صادق ہے تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسرے کے دِلوں میں جگہ پائے گی ورنہ گدی سے کھینچ کر نکالی جائے گی ؎

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجا لائے۔ اُنہوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچتائے کسی نے اُنہیں فریبی اور مکار کہا۔ کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ اِن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بد عہد بنایا اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان۔ مکر اور افترا۔ طعن اور تشنیع۔ گالی اور دشنام۔ پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب اِن میں نکلے اور وہ سب کے سب سزاوار ٹھیرے ؎

اے زبان! یاد رکھ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ

چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائیں گے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے ؞

اے زبان! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے۔ اور کُتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ وہ نام کے جانور اور اُن کے ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور ہمارے دل میں "نہیں" اور زبان پر "ہاں"

الٰہی اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبان راست گفتار دے اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں ؞

اگلے لوگ

مولانا راشد الخیری

منصف مزاج دوستو! آخر وہ موقع آگیا۔ جس کا مدت سے ارمان تھا اور وہ وقت آپہنچا جس کے واسطے برسوں سے آنکھیں ترس رہی تھیں! آج وہ دن ہے کہ کیا محل سرا ہو یا ٹوٹا سا گھر۔ بڑا بھاری شہر ہو یا چھوٹا سا گاؤں۔ دیوار و در سے بھی ترقی کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ گوشے گوشے اور چپے چپے غرض کونے کھدرے تک تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملکۂ مغرب کی سواری اپنے وطن سے روانہ ہو کر دریائی مسافت طے کر رہی ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ مشرقی حدود میں داخل ہو۔ لہذا اس وطن کا اقبال تو دیکھو مرد تو مرد عورتیں تک سارے جھگڑے بکھیڑے بھول بھال اور گھر کے دھندے چھوڑ چھاڑ مہمان کے استقبال کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ مزا یہ ہے کہ سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے۔ ادھر امیر اپنے کمرۂ نشست کو مختلف تصاویر سے مزین کر رہا ہے تو فقیر اپنے کچے دھابے بہ لال قندی لپیٹ رہا ہے کہ کسی طرح حق مہمان نوازی ہی ادا کر لوں۔ کچھ عجیب طلسم کا سا سماں ہے۔ جدھر نظر جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی کینچلی بدلے فلاح و بہبودی کے گلدستے ہاتھوں میں لئے موجودہ طرز معاشرت پر بس طعن کرتا ترقی کی صدائیں لگا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے پاؤں شل ہو گئے ہیں ۔ دیکھتے دیکھتے
آنکھیں پتھرا گئیں ۔ سوچتے سوچتے دماغ چکرا گیا ۔ مگر ابھی
تک اس سیمتن کا نظارہ نصیب نہیں ہوا ۔ جس کے انتظار
میں بیسیوں راتیں اور مہینوں دن بسر کئے ہیں ۔

میدان ترقی کے بہادرو ! تمہارا اشتیاق سر آنکھوں
پر ۔ تمہاری سرگرمی چشم ما روشن دل ما شاد ! مگر عقل سلیم اتفاق
کی بجائے متامل ہے ۔ جس طرز معاشرت کو جہالت سے تعبیر کر
رہے ہو ذرا اس پر غور کی نظر تو ڈالو ! شہر آبادی یعنی دلّی
بستے کا ہے ۔ یہی چراغ سحری جو اب ایک آدھ جھونکے کے
مہمان ہیں اپنی روشنی سے محلہ بھر کو منور کر رہے ہیں ۔ چشم تامل
سے دیکھنا کیسی کیسی جھلکیاں نظر آ رہی ہیں !

کچا پکا گارے مٹی کا گھر ہے ۔ مگر لیپا پوتا چندن سا
شرم و حیا کی گٹھڑیاں ۔ حسن و جمال کی دیبیاں جھاڑو بہارو
سے فراغت پا پکا ریندھ کھانے سے پہلے کھلانے بیٹھیں
پاس کو بھی ۔ بستی گُستی جو میسر ہے پڑوس کے اندھے دھندول
کو بھیجا ۔ کنبہ کے غریب محتاجوں کو دیا ۔ بچا کھچا ۔ اچھا برا
آپ کھایا ۔ ذرا انصاف کی نظر سے دیکھنا ان کے زیور
عفت و عصمت میں ہمدردی کا جوہر کس آب و تاب سے
چمک رہا ہے ۔ ان کو خاوندوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں
اپنی راحت اپنا عیش ۔ اپنا سکھ ۔ اپنا چین ان کی خوشی پر
قربان کر چکیں ۔ طوق غلامی سمجھو یا اطاعت و فرمانبرداری
کا چندن ہار ان کے گلے میں پڑا ہے تو یہی ! ان کے
دروازوں میں گھنٹوں کھڑے رہو ۔ ان کی ڈیوڑھیوں

یہ گھڑیوں کان لگا کر سنو۔ ہوا اُنکی آوازیں بھی دیواروں سے باہر نہ لائے گی ٭

خدا معلوم ان جاہلوں کی طبیعت میں قدرت ہی نے کوئی مادّہ ودیعت کیا ہے یا صحبت کا اثر اور تربیت کا فیض ہے۔ بہن بھائیوں پر پروانہ اور بھائی بہنوں پر نثار! لڑکیاں اطاعت گزار۔ لڑکے فرماں بردار۔ بڑوں کا ادب۔ چھوٹوں کا لحاظ۔ تعظیم۔ شرم۔ حیا۔ تمیز اِن کی گھٹی میں ہے ٭

یہ سفید داڑھیاں۔ یہ متبرک صورتیں جو عنقریب صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی۔ آج تمہارے راج میں بیوقوف سہی۔ جاہل سہی۔ مگر ان کی عمر کے پچھلے ورق تو لوٹ کر دیکھو! زمانے کا رُخ بدل جائے۔ ہوا کے جھکڑ چل جائیں اِن کے کارنامے مٹنے والے نہیں۔ اِن پتھروں سے مروت اور محبت کے ایسے چشمے پھوٹے کہ راستہ چلتے مسافر ممنون ہو گئے۔ ذرا ان بڑے میاں کو دیکھنا۔ منڈا ہوا سر۔ بھدّی جُوتی۔ کھدی ململ کا ڈھیلا ڈھالا کرتہ ہاتھوں میں دونے۔ بغلوں میں پوٹلیاں۔ سر پہ گڑ کی بھیلی کندھوں پر ترکاری کی پوٹ۔ لدے بندے لڑھکتے پڑھکتے چلے آرہے ہیں۔ ان پہ ہنسو۔ قہقہے لگاؤ۔ ٹھٹھے اڑاؤ۔ مگر اِن کی کیفیت بھی تو سُن لو۔ مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی۔ پڑوس کی پردہ نشین رانڈیں جن کے ہاں گھس لگانے کو مرد کا نام نہیں کبھی کی بیٹھی راہ تک رہی تھیں ان کے گھروں پر گئے پیسے لیئے۔ سودے پوچھے۔ اپنا کاروبار رکھ

محنت مزدوری چھوڑ بازار گئے - یہ انھیں دکھیاریوں کا بوجھ ہے ۔

زمانے کے نبض شناسو! عالم بنو - فاضل بنو - لائق ہو فائق ہو - کچھ ہو جاؤ - مگر پوچھو صاف بتا رہی ہے کہ اب یہ انداز رخصت ہوئے - البتہ آنیوالی نسلیں سن لیں گی کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں - جن کے قدموں میں خلق و تہذیب کے دریا لوٹتے تھے - زمانہ ان واقعات کو فسانہ بنا دے گا - یہ کہانیاں بہت روز تک باقی رہیں گی ذرا زمانۂ جاہلیت کے بہن بھائی دیکھنا! محبت کی سرسبز و شاداب ٹہنی پر کیسے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں - یہ تو رچھ گیری - مگر جوش محبت کی پوری تصویر ہے - بھائی کے ہاں بچہ پیدا ہوا - پردیس بہن یہ سن کر پھولی نہیں سمائی - بھتیجے کے لئے ہنسلی کڑے - بھاوج کے لئے جوڑا لے کر بھائی سے نیگ لینے آئی - کس محبت سے کہتی ہے۔

بیرن بھیا میں تیری ماں کی جائی ہولر سن کر بدھاوے کر آئی
چھاتی دھلائی کٹوری لوں گی تو لٹ دھلائی روپیہ
پاؤں دھلائی چیری لوں گی نوشے کے چڑھن کو گھوڑا

بھائی کی خوشی میں شریک ہو کر نیگ لینے کے حقوق کیسے مزے سے جتا رہی ہے - بھائی سے اتنا خطاب کر چکی تو اب بھاوج سے دو دو باتیں ہیں ؎

یہ نہ سمجھ بھاوج مدی نند ہیٹنی نہیں آئی
تیرے للا کو ہنسلی اور کڑے تجھ کو جوڑا لائی

بھائی پر تو زور تھا - مگر اس خیال سے کہ بھاوج کو بار خاطر نہ

ہو۔ یوں کہتی ہے۔ پھر نہ سمجھو کہ تیرے دروازے پہ بیٹھنے آئی
مرادوں کی صحل بھائی ہمیں لیجئے۔ بھتیجا ہمیں دیجئے۔ جو اپنا
حق ہے مانگ رہی ہوں جو مجھ پر ہے وہ بر موجود ہے ؞

یہ تمام قصہ طے ہو جانے کے بعد آخری بات جو بہن
کے منہ سے نکلتی ہے وہ ایک پیٹ میں پاؤں پھیلانے
کا سچا اثر۔ ایک گود میں دودھ پینے کا پورا جوش اور خالص
محبت کا پکا ثبوت ہے۔ جس دل سے یہ الفاظ نکلے ہیں۔
اس کی حالت قابلِ غور ہے کیسی سچی اور اچھی دعا ہے ؎

باغن میں جیسے آم پھلے رے۔ ایسے پھلے میرا بھائی

الٰہ العالمین جس طرح باغوں میں مور آکر آم پھلتا ہے۔
اسی طرح میرا بھائی پھلے پھولے۔ بیٹے ہوں۔ پوتے ہوں۔
اس کے پھیرے بسیں اور میرے باپ دادا کا نام روشن ہو۔

ملکِ مغرب کے مشتاقو! یہ جلسہ ختم ہوا۔ اور صحبتیں رخصت
ہو گئیں۔ جن چراغوں کی روشنی در و دیوار تک پھیلی تھی کبھی کے
بجھ گئے۔ صحبتِ شب کی شریک ایک آدھ شمع اِدھر
اُدھر ٹمٹما رہی ہے۔ جو نسیم کے ایک دو جھونکوں کی محتاج
ہے۔ جن مقدس صورتوں کی برکت تھی۔ وہ سب خاک
میں مل گئیں ؞

عزیز دوستو! ایک وقت آئے گا اور ضرور آئے گا۔
آنکھیں پھاڑ کر دیکھو گے اور سر پر ہاتھ رکھ کر روؤ گے اور
اور یہ لاجواب جواہر ریزہ ریزہ ہوں گے ڈھونڈو گے۔ مگر بے
سود۔ پرکھو گے۔ لیکن بے وقت ؞

بہارِ مشرق کے باغبانو! گو آج سنسان جنگل میں پڑے

آرام کر رہے ہو۔ مگر چمنستانِ حیات میں ایسے پھول
لگا گئے کہ قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ بھانت بھانت
کے پکھیرو اور رنگ برنگ کی بلبلیں بیٹھ کر چہکیں گی۔
اور ان کی مہکار مشرق سے مغرب تک پھیلے گی!
خزاں دنیا بھر کو تاراج اور مسمار کر دے گی۔ مگر تمہارے
مبارک ہاتھوں کی گلکاری صفحۂ ہستی سے مٹنے والی نہیں۔

زمانہ حال اور ماضی کی خوش بیانی کا مقابلہ

منشی جے رام مودگل

مختلف ملکوں کے آئین و قوانین اور اُن کے باشندوں کے اوضاع و اطوار ابتدائے آفرینش سے ہمیشہ تغیر پذیر رہے ہیں۔ آج جو رسم مرغوب ہے کل وہی معیوب ہے۔ آج ہم ایک رواج کے پابند ہیں کل دوسرے پر کاربند خوش بیانی بھی آج وہ نہیں جو کل تھی۔ یورپ کے ابتدائی زمانۂ تہذیب میں اسے بطور ایک فن کے تحصیل کرتے تھے۔ اور مقرّر کی قدر وقیمت فقط اس کی گویائی پر متصور تھی۔ جمہوری ضروریات کے لحاظ سے متقدمین کی علمی استعداد حوالۂ زبان رہتی تھی۔ عام میلوں اور حرب گاہوں۔ شاہی دعوتوں اور عبادت خانوں میں شعرائے شیریں مقال اپنے دلآویز قصیدوں۔ پُر جوش جنگناموں۔ محرک مناجاتوں سے غضب ڈھاتے تھے۔ مورخین تک قومی میلوں کی تقریب میں جمع ہو کر وہ دادِ فصاحت دیتے تھے۔ کہ یونانیوں کے دقیقہ شناس گروہ وجد میں آکر بار بار تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ اِس خوش بیانی نے تماشہ گاہوں کو زینت بخشی نظمی قصوں اور خشک شاعری نے دلچسپیٔ کلام کے لئے پہلو خالی کیا۔ اس جماعت نے فصاحت و خوش بیانی کے لباس میں اپنے فرائض کو ایسے بہتر یا نہ طور پر انجام دیا کہ متاخرین آجتک دنگ ہیں۔ زمانہ سلف

میں سادہ بیان فلاسفر تک اپنے خیالات کو یوں ترتیب دیتے تھے کہ وہ تقریر عام کا مضمون بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ فصاحت خیالات کا ایک معمولی لباس ہو گئی۔ خاص غرض یہ تھی کہ بولنے والے کا خیال اس قدر موزوں ہو۔ کہ کوشش کرے۔ ایسا پختہ ہو کہ مؤثر ہو سکے۔ یہاں تک مضبوط ہو کہ سامعین کے حافظے میں متمکن اور جانشین ہو جائے۔ تحریک و ترغیب کے جو جملے اور سچے جوش سے سپیکر کی تقریر دم بدم تازہ اور مؤثر ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ مجمع عام کے سامنے از سرتا پا تقریر نظر آنا۔ سابق کے فصحا کا ایک ادنیٰ کمال تھا۔ ایسی حالت میں ان کے اشارات۔ حرکات و سکنات اور ترغیب کا حقیقی شوق کیونکہ ممکن تھا۔ کہ سامعین کو والہ و شیدا بنانے میں ناکام رہے۔ سپیکر کے الفاظ میں ایک عجیب کشش مقناطیسی ہوتی تھی۔ جو سامعین موافق و مخالف معتقد و غیر معتقد سب کے دلوں کو کھینچ لیتی تھی۔ یہ فصاحت فقط خالی آواز نہیں تھی۔ یہ وہ شعلۂ صفت خیال تھے جو ایک عالی دماغ سپیکر کے دلی جوش سے نکلتے اور اس کی طبعی لیاقت سے مزین ہو کر جلوہ گر ہوتے تھے۔ یونانیوں کے نکتہ چین اور باریک بین گروہوں کے سامنے عرصۂ بلاغت و میدان فصاحت میں قدم بازی کرنا دل لگی نہ تھا۔ اور یہ زمانۂ سابق کے فصحا ہی کے حوصلے سے کہ دادِ زبانی کے خطرناک میدان میں آزادانہ جولانئ طبیعت دکھاتے تھے۔ ایسے زمانے میں ہر ایک آدمی چاہتا ہے کہ میں خوش بیان ہو جاؤں تو وجہ کیا؟ دلوں پر

حکومت کرنا۔عنان اختیارات اپنے ہاتھ میں لانا۔ انعامات حاصل کرنا۔ خطابات و ترقیات کا مستحق کہلانا اسی ایک بے نظیر طاقت پر موقوف تھا۔ اس زمانے میں خوش بیانی کی شرافت یہاں تک حدِ اعتدال سے متجاوز ہوئی۔ بجائے اس کے کہ لوگ اس سے مفید باتوں میں ترقی کریں اپنے ہر ایک ارادے کے پورا کرنے کا اس کو ذریعہ سمجھنے لگے۔ رومانیوں کی فصاحت بھی اسی وقت قابل قدر رہی جب تک اس میں بناوٹ کو دخل نہ ہوا۔ صداقت خیال کی روح ہے۔ خیال باطن محض بیہودگی ہے۔ زمانہ گذشتہ کی فصاحت یا خوش بیانی اگر کامیاب ہوتی تھی تو زیادہ تر لفاظی اور لسانی سے ہی ہوتی تھی۔ زمانہ حال کی خوش بیانی اس سے بہت کچھ متفاوت ہے۔ متاخرین نے جہاں اور علوم کو سہل کر دیا ہے۔ فصاحت کو بھی مدلل اور موزوں بنانے میں کوئی دقیقہ فرد گذاشت نہیں کیا۔ آج کل کے فصیح اپنے مضبوط سے مضبوط خیالات کو بھی لفاظی۔ زیادہ گوئی اور انواع و اقسام کی جادو بیانی سے ظاہر نہیں کر سکتے اِلّا اس صورت میں کہ فی الواقع کوئی ملکی پیچیدگی۔ کوئی لاینحل مسئلہ یا اشتعال انگیز معاملہ زیر بحث ہو۔ جس میں دل معمولی زنجیروں سے آزاد ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں قانون کا احاطہ پھیلتا ہے۔ تہذیب کا میدان وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جوں جوں خیالات میں سادگی اور باقاعدگی آتی ہے۔ قدرتی فصاحت کی لیاقت اور قدرت میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے یقین نہیں کہ فصاحت کا لبھانا اثر کبھی زائل ہو جائے

تاہم آجکل کے سپیکر کے لئے اپنے الفاظ پر قادر ہونا اور اپنی دلائل کے استحکام سے باخبر رہنا ازبس ضروری ہے۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ آج کل کی فصاحت سابق کی طرح ستم برپا نہیں کرتی۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ اس کی طاقت کے آج کل وہ دور دورے نہیں رہے جو پیشتر تھے۔

پریس نے اس لاجواب طاقت کو کسی قدر پست کر دیا ہے اسی نئی ایجاد کے ذریعے سے انسان ایک گوشے میں دبکے دبکائے اپنے خیالات کی اشاعت کر سکتا ہے۔ اس سے منفردہ لیاقتیں تو روبہ ترقی نظر آتی ہیں۔ مگر یہ ذہانت کی عمدگی اور جمعیت بالقوہ اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ اعلیٰ درجے کا انشاپردازہ بولنے میں خاک اثر پیدا نہیں کرتا اور جو سپیکر ہیں وہ طباع اور حاضر جواب نہیں پائے جاتے نہایت پُر مغز تحریریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مگر ایک مجمع کے سامنے اسی قسم کی جادو بیانی اور دُر افشانی آسان کام نہیں۔

جہاں مجمع کے روبرو کھڑے ہوئے ہوش و حواس ندارد سب تیزی و طراری معطل۔ دلائل بالکل لا طائل۔ الفاظ ہیں کہ وبال ہو گئے۔ بولنا بلا کا سامنا ہے۔ قیامت کا مقابلہ ہو گیا۔ چندہی بندگان خدا نظر آئیں گے۔ جو اپنے خیالات پر اس قدر قادر اور حاکم ہوں کہ بے تحاشا گفتگو کر سکیں۔ لوگ دن بدن خاموشی سے مانوس ہوتے جاتے ہیں۔ رسالہ جات مطبوعہ کو سب سے الگ تھلگ بیٹھ کر جی بہلانے کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی تقریر ہوئی بھی تو سامعین

اُلٹا اُسے کتابی عبارت سے ملانے لگے اور طرفہ یہ کہ جو بات سلف میں فصاحت کہلاتی تھی اب یاوہ گوئی سے موسوم ہو گئی۔ ہمیں اپنی ضروریات کو خیال میں لاکر اپنی فصاحت کو میزان میں تولنا چاہیئے۔ کجا وہ فصاحت جسے خیالی پرجوش کہیں تو بجا ہے۔ کجا آجکل کی فصاحت جسے جوش پر خیال کہنا بالکل روا ہے۔ قدیمی فصاحت کا مدعا ترغیب تھا حال کی فصاحت کا مقصد ترغیب کے علاوہ یقین دلانا بھی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آج کل کے سپیکر کو تعلقات کاروبار۔ فنون مختلفہ اور آداب و قواعد میں بہت کچھ دخل ہو۔ غرض کہ اس زمانہ میں فصاحت کے ساتھ قوت مدرکہ کی صفائی از بس ناگزیر ہے۔ زمانہ سابق میں نیک مفید ملکی اور سچی باتوں کے رواج پر زور تھا۔ آج کل انصاف و صداقت اور شرافت کا قائم رکھنا مدنظر ہے لہذا اسپیکر کے لیئے معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی میں احتیاط رکھنا لازمات سے ہے۔

نامی سپیکر ہونے کے لیئے نیک چلن ہونا ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسے کہ آئینے کے لیئے صفائی۔ بدچلن آدمی کے دل میں وہ توانائی اور آزادہ روی ہی نہیں ہوتی۔ جو خیالات کی پیدائش اور اُن کے اظہار کے لیئے لازمی ہے۔ جس شخص کو ہر وقت اپنے عیوب کا علم رو برو ڈالتا ہے۔ اس کا دلی شوق ہر وقت پا بجولاں رہیگا ہردم کی پشیمانی۔ دائمی ندامت فکر بلند کو پاس تک نہیں آنے دیتی۔ ایسا آدمی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی مضامین

یا مذہبی فرائض پہ گفتگو کرے۔ مگر ہر لفظ پہ چونک اُٹھتا ہے
بات بات پہ دل میں خفیف ہوتا ہے۔ حوصلہ و ہمت کو
پھر فراہم کرتا ہے۔ مگر خبثِ باطن کو کیا کرے۔ انفعال
سے لاچار ہے۔ آخر "من چہ سرائم و طنبورہ من چہ
سرائد" کا مضمون دیکھ کر خود ہی بیچارہ ہمہ تن لب ہو جاتا
ہے۔ نیکی بذات خود ایک جوہر ہے۔ اس سے طبیعت میں
ایک آزادی پیدا ہوتی ہے۔ جسے کوئی چیز نہیں پہنچتی بلا خوف
و خطر آزادانہ تقریر کرنے کے لئے انسان کا طبعی طور پہ خوش خلق و
نیک چلن ہونا ضروریات سے ہے۔ نیک آدمی خیر خواہی عوام
کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ بدخواہ کا دل زمینِ شور سے بدتر ہے
جس سے کبھی پھل پھول کی تمنا نہ رکھنی چاہئے۔ خاص کر
وہ آدمی جو اپنے عیوب کی وجہ سے انگشت نما ہو۔ کبھی بطور
ایک سپیکر کے اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ ادھر کسی بدچلن
آدمی نے اپنی زبان کھولی ادھر سامعین کے دلوں میں اس
کے ذاتی اطوار کے خیالات تازہ ہو گئے۔ آپس میں چشمکیں
ہونے لگیں۔ یار لوگوں نے فقرے پہ فقرہ چست کیا۔ کسی نے
آوازہ کسا۔ کسی نے پھبتی کہی۔ چلئے سپیکر کے آگے ہوائے حواس غائب۔
برخلاف اس کے کہ اگر کوئی نیک آدمی انجمن آرا ہو خواہ اس
کے الفاظ بالکل بے تُکے اس کی تقریر محض لغو کیوں نہ ہو۔ لیکن
فقط اس کا نیک ہونا ہی بڑی بھاری سفارش ہے۔ صرف اس کی نیکی
کے خیال سے ہی سامعین کے دلوں میں اس کی تعظیم اسکے خیالات کی قدر
اور اسکی باتوں کی توقیر پیدا ہو جاتی ہے۔ بہرحال سپیکر کے لئے نیک
ہونا اور نیک کہلانا واجب ہے۔

تاریخ

منشی برج نرائن چکبست

موجودہ تہذیب کا ایک علمی اصول ہے کہ دنیا میں جس قدر رسم و رواج یا علوم و فنون ہیں۔ وہ ایک سلسلہ وار ترقی سے ظہور میں آئے ہیں۔ فنِ تاریخ بھی اس حالت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے موجودہ زمانے تک یہ فن مختلف تہذیبوں کے مختلف سانچوں میں ڈھلتا چلا آیا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب انسان کو دنیا میں آئے ہوئے بہت کم دن گذرے تھے۔ قدرت کے کارخانے اس کے لئے معمے سے کم نہ تھے۔ اس عالمِ حیرت میں اس کی نگاہوں کے سامنے جو حیرت انگیز نقشے گذرے تھے وہ اس کے دل پر عجب اثر پیدا کرتے تھے۔ مثلاً وہ دیکھتا تھا کہ کبھی دن بڑے ہوتے ہیں کبھی راتیں۔ کبھی چاند۔ سورج سیاہی میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی سردی زور شور کے ساتھ اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ کبھی گرمی کے موسم کی تپش حد سے زیادہ ترقی کر جاتی ہے۔ شروع شروع میں وہ قدرت کے کارخانوں میں کوئی انتظام یا ترتیب نہیں پاتا تھا۔ ان انقلابات سے متاثر ہو کر وہ دنیا کی کیفیت۔ تشبیہوں اور استعاروں کے رنگ میں ایک شاعرانہ طرز پر بیان کرتا تھا۔ اب بھی جو وحشی قومیں باقی ہیں۔ ان کی گفتگو تشبیہ اور استعارے کے پیرائے میں ہوا کرتی ہے۔ مثلاً اگر کسی وحشی کو یہ کہنا ہوگا کہ فلاں شخص میرا ہمسایہ ہے تو وہ کہے گا "کہ اس کے گھر کی پتیاں

میرے گھر میں اڑ کر آتی ہیں" چنانچہ زمانہ گزشتہ میں بھی وحشی قوموں کا یہی رنگ تھا۔ اِس قسم کے گیت یا نظمیں ہر ملک اور ہر قوم کی تاریخ میں موجود ہیں۔ جن میں وہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ جو کہ انسان کے دِل میں ابتدائی تہذیب میں پیدا ہونے ہوں گے۔ مثلاً سیاروں کو ایک قسم کا دیوتا مانتا ہے۔ دریاؤں اور پہاڑوں کی عظمت اور شوکت سے متاثر ہو کر ان کی پرستش کرتا ہے۔ اور جب اِس کے جذبات دِلی جوش میں آتے ہیں۔ تو وہ اُن خیالات کو شاعرانہ طرز پر ادا کرتا ہے۔ جو کہ نظموں یا گیتوں کی شکل میں یاد رہ جاتے ہیں۔ اور آئیندہ نسلوں کو ایک ایسی تاریخ کا کام دیتے ہیں۔ جس میں اِس وقت کی تہذیب اور تمدن کی حالت آئینہ وار نظر آتی ہے۔ ایسی نظموں وغیرہ کو جن کو انگریزی زبان میں مائی تھالوجی کہتے ہیں۔ خلاف عقل انسانی جان کر بالکل بے وقعت نہیں سمجھنا چاہئے۔ اِن سے کامل طور پر تاریخی واقعات کی تشریح نہیں ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت کی تہذیب کا بحیثیت مجموعی اندازہ ہو سکتا ہے۔ جس وقت کہ نظمیں تصنیف ہوئی تھیں۔ اور یہ ایسی تحقیقات ہے۔ جو کہ تاریخی تحقیقات کی حد سے کسی حالت میں باہر نہیں ہے۔ اس موقعہ پر یہ کہنا ضروری ہے۔ کہ تاریخی صراحت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو خارجی واقعات کی تصریح ہے جو کہ موجودہ سائنس کے اصولوں پر مبنی ہے دوسرے جذبات انسانی کی توسیع و ترقی کی تشریح ہے فن تاریخ کے ابتدائی کارناموں سے ہم خارجی واقعات کی

تصریح عمل میں نہیں لا سکتے۔ لیکن اس وقت کے انسانوں کے جذباتِ دلی اور عقائد کا رجحان نہایت آسانی سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے تاریخی کارنامے ایک نہایت اعلیٰ علمی ذخیرے کا کام دے سکتے ہیں۔ یہ فن تاریخ کی ابتدائی منزل ہے۔

دوسری منزل میں اس دلچسپ فن نے ایک نئی صورت پکڑی۔ جب کہ انسان ترقی کے میدان میں دس قدم اور آگے بڑھا اس کا تجربہ وسیع ہوتا گیا۔ دل و دماغ کی پنہاں قابلیتیں ظہور میں آئیں۔ اس حالت میں تاریخ صرف ان جذبات و عقائد انسانی کی داستان نہ رہی جو کہ انسان کے دل میں محض قدرت کے عظیم الشان کارخانے دیکھنے سے پیدا ہوئے تھے۔ بلکہ اس میں خارجی واقعات کو مثلاً انسانی کارناموں کو بھی دخل ہوتا گیا۔ لیکن یہ واقعات اصلی حالت میں نہیں بیان کئے گئے۔ ہر روایت کے بیان میں خیالی عظمت و شوکت کو بہت کچھ دخل رہا جو عظیم الشان انسان اس دور میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعریف میں بہت سی داستانیں کہی گئیں۔ کچھ نظمیں کچھ نثریں۔ مگر واقعات کی صراحت کا خیال بالائے طاق رہا۔ اس قسم کی داستانیں پڑھنے سے ہم کو ہزاروں تاریخی واقعات معلوم ہوتے ہیں مگر جیسا کہ بیشتر لکھا گیا ہے ہر واقعہ کے بیان میں مبالغہ کو بہت دخل ہے۔ مثلاً لڑائیوں کی داستانیں اس طرح لکھی گئی ہیں جنہیں عقل انسانی کبھی قابل اعتبار نہیں مان سکتی یا اکثر عظیم الشان انسانوں کی مثالیں موجود ہیں جن کی بہادری اور رعب تن کی تعریف

میں دریا بہا دیئے گئے ہیں۔ ہندوستان میں مہا بھارت کے سورو بیران کے جواب ہیں۔ ان کی بہادری کی روایتیں جس طرز پر لکھی گئی ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ کس قدر مبالغہ آمیز ہیں۔ مہا بھارت کے ہرکولیز یعنی بھیم کی نسبت روایت تحریر ہے کہ اس نے غصے کے عالم میں ایک بہت بڑا درخت زمین سے اکھاڑ کر اپنے مخالف کی طرف اس طرح کھینچ مارا جس طرح کوئی تنکا اٹھا کر پھینک دے۔ گویا بادی النظر میں یہ واقعہ خلافِ قانون قدرت معلوم ہو۔ لیکن اصل میں یہ ایک بہادر اور قوی ہیکل شخص کی بہادری اور دلیری کی مبالغہ آمیز تعریف ہے۔ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم اگر اس قسم کی حکایتوں کا مطالعہ کریں۔ تو بہت کچھ تاریخی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ مبالغہ پسندی کی وجہ کیا ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے لوگوں کی نسبت مبالغہ آمیز روایتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ اور جس قدر زمانہ گذر جاتا ہے۔ اس ذخیرے میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جن خلافِ قدرت کرشموں کا انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ اُنھیں کا وہ مجموعہ بتلائے جاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں گوتم بدھ نے کبھی اوتار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ بت پرستی کیخلاف اُسنے وعظ کیا۔ لیکن برہمنوں نے پُران بنا کر اس کو اوتار کا اعزاز بخشا ہے۔ اور اسکے مریدوں نے اسکا بت پوجنا شروع کر دیا۔

ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا

سیواجی کی مثال بہت نزدیک زمانے کی مثال ہے یہ سب جانتے ہیں کہ سیواجی انسان تھا۔ اس کے وقت کی قابلِ اعتبار

تاریخ موجود ہے۔ لیکن مہاراشٹر میں ایک فرقے کا یہ عقیدہ ہے کہ سیواجی شوجی کا اوتار تھا۔ اور اِس کی پیدائش ایک معجزے کے ذریعے ظہور میں آئی تھی۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان میں چونکہ عظمت و شوکت کی قدر کرنے کے جذبات قدرتی طور پر موجود ہیں۔ اِس وجہ سے مبالغہ آمیز روائتیں بڑے بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اِن کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ ابتدائے تہذیب میں چونکہ جذبات نہایت زور شور کیساتھ انسان کے دِل میں پائے جاتے تھے۔ اور اِس کا عقیدہ غائبانہ روحانی قوتوں میں تھا۔ لہٰذا اِس زمانے میں جو عظیم الشان اِنسان گزرے۔ اِن کے مداحوں نے اُن کو آسمان پر چڑھا دیا اور اِن کی تعریف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ وجہ یہ ہے۔ کہ لوگ مُبالغہ پسندی کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اِن کے نزدیک یہ ایک قسم کی عزت تھی۔ کہ بڑے آدمیوں کی صفت میں مُبالغہ سے کام لیا جائے۔ نیز وہ سمجھتے تھے کہ بزرگوں کے کارناموں پر جس قدر خیالی تعریف کی وارنش کیجائے زیبا ہے۔ لہذا جب ہم اِس قِسم کی روائتیں پڑھیں تو ہم کو اِس امر کا خیال لازمی ہے کہ ہم اصلی واقعات بجلنسہٖ نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ اِن واقعات کی وہ تصویر کھینچ رہے ہیں جن میں کہ بہت کچھ مبالغہ کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ یہ فنِ تاریخ کی دوسری منزل کی حالت ہے۔

تیسری منزل کی سیر کا راستہ بہت کچھ صاف ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جبکہ انسان کو تاریخ کی غرض سے تاریخ لکھنے

کی جس پیدا ہوئی - ابھی تک اِس کا منشا محض جذباتِ دِلی کا اِظہار تھا یا بزرگوں کی عظمت کہنا نہ کہ تاریخ کی غرض سے تاریخ لِکھنا - اب وہ زمانہ آیا کہ جب اس نے گزشتہ و موجودہ واقعات کو یکجا جمع کرنا شروع کیا - لیکن یاد رہے کہ اِس وقت تک تاریخ نویسی کا مذاق تکمیل پر نہیں پہنچ گیا تھا - اِس زمانے کی تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں - نہ کہ ملک اور سوسائٹی کی حالت کی فلسفیانہ تفسیریں نیز اِس وقت تک مبالغہ کو تاریخی واقعات لِکھنے میں بہت کچھ دخل تھا - ہراڈوٹس یورپ کا اس رنگ کا پہلا باقاعدہ مورخ ہے - اِس نے اپنی تاریخ میں اکثر واقعات لِکھے ہیں - جو مبالغے سے پُر ہیں - یا اُسی زمانے کا ایک دوسرا مؤرخ ہے - اُس نے صاف الفاظ میں لِکھ دیا ہے کہ میں نے اصلی واقعات کے عِلاوہ بہت کچھ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے -

جیسے فِردوسی نے شاہنامے میں صاف طور پر لِکھ دیا ہے کہ ؎

منش کردہ ام رستم پہلوان
وگرنہ یلے بُود در سیستان

ہندوستان میں تاریخ نویسی کا مذاق اِس حد سے آگے نہ ترقی کر سکا - یہاں پران وغیرہ موجود ہیں - جن کے پڑھنے سے تہذیب قدیم کا حال معلوم ہو سکتا ہے - یا کشمیر کی تاریخ کا پتہ چلتا ہے - لیکن کوئی باقاعدہ تاریخ تمام ملک کی موجود نہیں - اِس میں شک نہیں کہ ہندوستان کے قدیم

باشندوں نے مختلف علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی تھی ۔ جس کی ثنا و صفت میں یورپ کے محققین تر زبان ہیں ۔ لیکن فن تاریخ نے یہاں نشوونما نہ پائی ۔ اکثر حضرات کا یہ مقولہ ہے کہ مسلمانوں کے وقت حکومت میں اکثر جابر اور متعصب فرمانرواؤں نے ہندوستان کی کتب تاریخی جلا دیں ۔ مگر یہ خیال بالکل غلط ہے اور اِس قابل نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے ۔

کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے فلسفہ اور شاعری وغیرہ کا ذخیرہ تو اب تک موجود ہے ۔ مگر تاریخی کتابیں اِس انتظام کے ساتھ جلائی گئیں ۔ کہ اِن کی خاک بھی سُرمے کے لیے نہیں ملتی ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ فنِ تاریخ نے اُسی مُلک میں زیادہ نشوونما پائی کہ جس ملک میں نظامِ معاشرت پولیٹیکل اصولوں پر مبنی تھا ۔ ہندوستان کی حالت جداگانہ تھی ۔ یہاں نظامِ معاشرت کا دارومدار محض مذہبی اصولوں پر تھا ۔ یہاں دُنیا سے زیادہ عقبیٰ کی فکر رہتی تھی اس لیے فنِ تاریخ کو قابلِ اطمینان ترقی نہ ہوئی ۔ کیونکہ فنِ مذکورہ زیادہ تر دنیاوی کارناموں سے تعلق رکھتا ہے ۔

اب فنِ تاریخ کی چوتھی منزل کا حال ملاحظہ ہو ۔ جب انسان میں غور و فکر کی قابلیت نے ترقی کی اور وہ محض عادت کا غلام نہیں رہا تو اِس نے واقعات کو صرف سرسری نظر سے دیکھنا ناپسند کیا ۔ بلکہ اِن کی رفتار کا بحیثیت مجموعی اندازہ کرنا شروع کیا ۔ عام اسباب سے عام نتائج اخذ کیے ۔ اور اِن

عام نتائج کی مدد سے چند عام اصول قائم کئے اور
ان عام اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر واقعات کی رفتار
پر ایک تنقیدی نگاہ ڈالی - اس دماغی ترقی کے ساتھ
نظامِ معاشرت کی سادگی میں بھی رفتہ رفتہ فرق آتا گیا
اور زندگی کی داستان پیچیدہ ہوتی گئی - اس حالت میں
تاریخ جب لکھی گئی تو وہ محض واقعات کی فہرست نہ رہی
بلکہ ان واقعات کے اسباب و نتائج کی فلسفیانہ
تشریح ہو گئی - اس قسم کی تاریخ نویسی کی بنیاد یورپ
میں پڑی - اس میں شک نہیں کہ عربی فارسی وغیرہ
میں اکثر مستند تاریخیں موجود ہیں - مگر ان میں صرف
سلطنتوں کے کمال و زوال کی داستانیں درج ہیں مگر
سوسائٹی اور مذہب وغیرہ کے پیچیدہ مسائل کا ان میں
ذکر نہیں ہے - یورپ میں سب سے پیشتر ملک
اطالیہ میں میکے ولی نے فلسفیانہ تاریخ کی داغ بیل
ڈالی - اس کے بعد جرمنی انگلستان وغیرہ میں ایسے مؤرخ
پیدا ہوئے - جنھوں نے علاوہ معمولی واقعات کے
سوسائٹی کے مختلف پہلوؤں پر تاریخ میں نقادانہ نظر
ڈالی - آخر کار فرانس میں گیزو نے تاریخ تمدن لکھ
کر تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا - غرض رفتہ رفتہ
فنِ تاریخ ترقی کرتا گیا اور آخر کار تجربے سے یہ ثابت
ہو گیا کہ فنِ تاریخ شاعری اور فلاسفی کا مجموعہ ہے
یعنی مؤرخ کامل وہی شخص ہو سکتا ہے - جو کہ فلسفی
کا دماغ اور منصف کا قلم رکھتا ہو - دماغ سے فلسفیانہ

طور پر اندازہ کرے۔ اور جادو کار قلم سے سوسائٹی کے انداز معاشرت کی تصویر کھینچے۔ لیکن ابھی تک غالباً یورپ میں بھی کوئی ایسا مؤرخ نہیں پیدا ہوا۔ جس میں یہ دونوں وصف درجہ کمال پر پائے جاتے ہوں۔ بالفعل وہاں فنِ تاریخ دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک فرقہ ایسے مورخین کا ہے۔ جن نے واقعات کی تشریح اور اُن کی فلسفیانہ تحقیقات اپنا حصّہ کر لیا ہے۔ دوسرا فرقہ تاریخی فسانہ نگاروں کا۔ اس قسم کے مصنفین زمانہ ہائے دور دراز کی سوسائٹی کے طرز معاشرت کی تصویر افسانوں کے پیراؤں میں کھینچتے ہیں۔ جو شخص کہ پورے طور سے تاریخی حیثیت حاصل کرنا چاہے۔ اس کے لئے اِن دونوں قِسم کی تصانیف کی سیر ضروری ہے۔ ہمارے اردو لٹریچر میں تاریخی تحقیقات کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ یہ بھی انگریزی تہذیب و تربیت کا اثر ہے کہ اکثر بزرگوں کو تاریخ لکھنے کا شوق پیدا ہوا ہے مثلاً شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ صاحب نے اکثر تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر اِن تصانیف میں اِس اقادانہ لیاقت سے کام نہیں لیا گیا ہے جو فن تاریخ کی شان میں داخل ہے۔ مگر نہ ہونے سے یہ تصانیف بہتر ہیں۔ بے شک اردو میں ایک ایسی کتاب موجود ہے جس پہ کہ سچی تاریخ کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کا نام دربارِ اکبری ہے اور اِس کا لکھنے والا

ہندوستان کا مشہور مصنف محمد حسین آزاد ہے۔ ؎

زبان پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلئے

دربارِ اکبری میں محض اکبر کے زمانے کے محاربات وغیرہ ہی کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اکبر کے زمانے کی سوسائٹی کا رنگ بھی دکھایا گیا ہے۔ اِس نامور مصنف نے نظمِ اردو کی تاریخ آبِ حیات کے نام سے یادگار ہے یہ تاریخ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے ✦

علاوہ ان نامی مصنفین کے اکثر حضرات نے چھوٹی چھوٹی تاریخیں ہندوستان کے مختلف حصّوں کی لکھی ہیں اور ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے مگر افسوس ہے کہ فنِ تاریخ کی دوسری شاخ یعنی تاریخی فسانہ نگاری نے ابھی کچھ نشوو نما نہیں پائی۔ یوں تو فسانہ نگاروں کا ایک فرقہ پیدا ہو گیا ہے۔ جو اپنے تئیں تاریخی فسانہ نگار سمجھتے ہیں۔ مگر ابھی تک ایک بھی ایسا مصنف نہیں پیدا ہوا۔ جو کہ واقعی تاریخی فسانہ نگار کے لقب کا مستحق ہو۔ میری نظر سے اکثر فسانے گزرے ہیں۔ جن کی لوح پہ لکھا ہوا تھا کہ یہ تاریخی فسانہ ہے۔ مگر ایک فسانے کے پڑھنے سے بھی اِس زمانے کی سوسائٹی کے طرزِ معاشرت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ جس زمانے کا اِن فسانوں میں ذکر تھا۔ اِن میں محض تاریخی واقعات درج کر دئے گئے ہیں۔ مگر اِن کے مصنف زمانہ دیرینہ کے مردہ قالبوں میں جان نہیں ڈال

سکتے تھے - ایک افسانے میں جو کہ عرب کے متعلق تھا اور جس میں ایک ہزار برس اُدھر کی تاریخ کا ذکر تھا - یہ واقعہ نظر سے گزرا کہ کسی شخص نے کسی کو رجسٹری کر کے خط بھیجا - حالانکہ عرب میں اب تک رجسٹری کا پتہ نہیں ہے - ایک صاحب نے - اپنے تاریخی فسانے میں کسی مغربی عورت کے حُسن کی تصویر میں سیاہ اور چمکدار زلفیں بھی شامل کر دیں - حالانکہ مغرب میں سنہرے اور گھونگر والے بال ہوتے ہیں - نہ کہ سیاہ اور چمکدار زلفیں +

ایک بزرگوار نے اپنے تاریخی فسانے میں جو کہ راجپوتانے کی سو برس اُدھر کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے - راجہ کے محل میں مختلف آسائشوں کے علاوہ اپنے دماغ سے گیس کی روشنی بھی بہم پہنچا کر دی حالانکہ اِس زمانے میں گیس کی روشنی کہاں؟

اِس تشریح کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ فنِ تاریخ نے کس طرح ترقی کی اور کیا کیا رنگ بدلے اور جو کچھ میں نے اِس حد تک تحریر کیا ہے اسے میں فنِ تاریخ کی تاریخ کہوں گا - مذکورہ الصدر اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو بہت سی کاوشیں رفع ہو جائیں گی - مثلاً ہم پر یہ روشن رہے گا کہ پُرانی کتب مذہبی جنھیں ہم تقویم پارینہ خیال کرتے ہیں - ایک قسم کے تاریخی سرمایہ سے کم نہیں - جس سے تہذیب انسانی کی ابتدائی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے - یا ہمارے

ایڈ - اڈیسی وغیرہ ایسی تاریخی تصانیف ہیں - جن میں ایسی روائتیں درج ہیں جو کہ مبالغے سے خالی نہیں مگر جن کی اصلیت ضرور ہے - علاوہ بریں مطالعہ تاریخ میں ہم کو اور چند امور کا بھی خیال رکھنا لازمی ہے اور یہ کہ تاریخ پڑھنے میں ہم کو اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم صرف ایک کہانی یا داستان نہیں پڑھ رہے ہیں جس میں کسی بادشاہ کی تخت نشینی یا مرنے جینے کے تذکرے ہیں - برعکس اِس کے ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ مختلف زمانوں میں انسانی اخلاق کا کیا معیار رہا ہے - جس سے کہ تہذیب کے مختلف درجوں کا اندازہ ہو سکتا ہے - یا مذہبی انقلابات پر ہم کو غور کرنا چاہیئے - کہ کون کون مذہبی عقائد مختلف زمانوں میں سوسائٹی پر حاوی رہے ہیں - اور علم طبیعات کی ترقی کے ساتھ اِن عقائد میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں - اور اِن مذہبی انقلابات کے ساتھ سوسائٹی کے سوشل رسم و رواج کا کیا رنگ رہا ہے - کون اصول دیر پا ثابت ہوئے ہیں اور کن کو زمانہ نے فنا کر دیا ہے - اِس انداز پر مطالعۂ تاریخ کرنے سے تاریخی زمانہ ہم کو محض ایک داستانِ غیر مسلسل نہ نظر آئے گا - بلکہ ہم پر یہ امر آئینہ ہو جائے گا کہ یہ اخلاقی - مذہبی اور سوشل قوتوں اور اِن کے نتائج کا ایک ایسا سِلسلہ ہے جو کہ ازل سے شروع ہوا ہے - اور ابد تک قائم رہے گا ۔

دوسرا امر جس کا مطالعہ تاریخ میں لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو صرف بڑے بڑے واقعات کو ضروری سمجھ کر حفظ نہ کر لینا چاہیئے۔ محض بڑی بڑی لڑائیوں کی حکایتیں یا انقلاب عظیم کی داستانیں یاد کر لینے سے ہم سوسائٹی کی اندرونی یا اصلی حالت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم کو زیادہ تر توجہ ان واقعات پر کرنا چاہیئے جو کہ بادی النظر میں غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔ مگر جو در اصل قوم یا ملک کے اخلاق یا عادات پر اثر کرتے ہیں۔ مثلاً علمی ترقی یا جہالت کی طرف سوسائٹی کے رجحان کا اندازہ کرنا۔ افلاس و دولت مندی کی مختلف حالتوں پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایسی پنہاں قوتیں ہیں جن سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آ سکتے ہیں۔ لہذا سوسائٹی کی اصلی حالت دریافت کرنے کے لئے محض عظیم الشان واقعات پر توجہ کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ اِن پنہانی اخلاقی اور علمی قوتوں پر غور و تعمق کی نظر ڈالنا چاہیئے۔ جن کے زوال و کمال کے ساتھ ملکوں اور قوموں کے زوال و کمال کی داستانیں رہی ہیں۔ اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دین اسلام کو جو کچھ فروغ ہوا ہے۔ وہ تلوار کے زور سے ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ عظیم الشان مذہب محض جبر سے پھیلایا گیا ہے۔ ایسا خیال محض تاریخ اسلام کے سطحی نظارے سے ہو سکتا ہے۔ جن لوگوں نے عمیق نظر سے عروج اسلام کی تاریخ پڑھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اسلام کے فروغ کی بانی ایک

زبردست اخلاقی قوت تھی - جو کہ رسولِ عربی کی تلقین سے ظہور میں آئی تھی اور جس نے عرب کے جاہل وحشیوں کو سرفروش اور توحید پرست مسلمان بنا دیا تھا - مسلمان ایمان پر جان و دولت قربان کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور یہی زبردست قوت اخلاقی تھی جس نے اسلام کا سکہ دُنیا میں جاری کر دیا۔

اسی طرح اکثر حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مرہٹوں کو جو کچھ عروج حاصل ہوا ہے وہ محض لوٹ مار کی بدولت حاصل ہوا ہے - سیواجی محض ایک زبردست لٹیرا تھا - لیکن اگر نظر غور اور انصاف سے مرہٹوں کی حیرت انگیز ترقی کی داستان پڑھی جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ مرہٹوں کے سینوں میں حب الوطنی کی آگ روشن تھی اور وہ محض ذاتی عروج و فائدے کے لئے نہیں لڑتے تھے - بلکہ اپنے ملک پر اپنی جان قربان کرتے تھے - اور یہ زبردست اخلاقی قوت سیواجی کی بہادری اور جان نثاری سے پیدا ہو گئی تھی - جن صاحبوں نے جناب رانا ڈے کی وہ لاجواب کتاب پڑھی ہے - جس کا نام عروج سلطنت مرہٹہ ہے - وہ میرے اِس دعویٰ کی تائید کریں گے۔ مراد اِن مثالوں کے پیش کرنے سے یہ ہے کہ بڑی بڑی انقلابی حالتوں کے ظاہری عنواں تک مطالعہ تاریخ میں نظر نہ محدود رکھنی چاہیئے بلکہ اِن انقلابات کے اسباب باطنی بھی تلاش کرنے چاہیئں - مطالعہ تاریخ

میں اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ہر واقعہ کا اندازہ تحقیق و تنقید سے کیا جائے۔ کیونکہ اگر کسی قسم کے تعصب سے کام لیا گیا تو واقعات کی تشریح سے قابلِ اطمینان نتیجہ نہیں نکل سکتا بلکہ نتائج کی صحت میں فرق آجانے سے اُلٹا سبق گمراہی کا ملتا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بالفعل ہندوستان میں تاریخی مطالعہ کے وقت بہت کچھ تعصب سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں رسم و رواج دیرینہ کی پابندی کی بیڑیاں ایسی مضبوط ٹھکی ہوئی ہیں کہ پرانی بات کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا اصولِ اخلاق سمجھا جاتا ہے اس کا اثر مطالعہ تاریخ پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات کا یہ شیوہ ہے کہ جب وہ قدیم ہندوستان کی تاریخ پڑھنے لگتے ہیں تو اُن کی محض یہ غرض رہتی ہے کہ جو واقعات کہ ہمارے ہندوؤں کے اخلاقی یا علمی اعزاز کے شاہد ہوں۔ اِن کی تشہیر کی جائے اور "پدرم سلطان بود" کا غلغلہ بلند کیا جائے اور اگر کسی طرح یہ ثابت ہو جائے کہ قدیم ہندوستان میں ریل اور تار برقی کا سامان موجود تھا تو پھر کیا کہنا ہے۔ اور جب اس وضع کے حضرات کو کسی اخلاقی یا سوشل بدعنوانی کا ثبوت ملتا ہے تو فکر یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح اِن واقعات پر خاک ڈال دی جائے۔ یا اکثر بانیانِ اصلاح نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب کسی اصلاح کے عمل میں لانے کی کوشش شروع کرتے ہیں تو

اختلاف کی شورش سے بچنے کے لئے یہ چال چلتے ہیں کہ
تاریخی واقعات توڑ مروڑ کر لفظی شعبدہ پردازی سے
یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہم نئی بات، نہیں کہتے ہیں
بلکہ ایک پرانی رسم تازہ کر رہے ہیں - مثلاً ایک بزرگوار
پردے کے خلاف ہیں - اُنھوں نے اپنے دلائل میں
اس بے بنیاد تاریخی تصرّف کو بھی شامل کیا ہے - کہ
مسلمانوں میں کبھی پردے کی رسم نہ تھی ہندوستان
میں چین سے آیا اور ہندوؤں سے مسلمانِ ہند
نے پردے کی رسم سیکھی - حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے
کہ ایسی کوئی قابلِ وقعت تاریخی شہادت نہیں موجود
ہے - جس سے یہ ثابت ہو کہ ہندوستان نے چین
سے پردہ اڑایا اور مسلمانوں پر ابر کی طرح چھا گیا -
اِسی طرح کی اور مثالیں موجود ہیں - مگر یاد رہے کہ
اصلاحِ قومی کی عالی شان عمارت ایسی سست بنیاد پر
تیار کرنا خالی از اندیشہ نہیں ہے - اِن خدا کے
بندوں سے کوئی پوچھے کہ قومی اصلاح کی کوشش
میں دروغِ مصلحت آمیز شامل کرنے کی کیا ضرورت
ہے - کیا ہمارے بزرگ انسان نہ تھے - کیا اِن کی
تہذیب فرشتوں کی تہذیب تھی کہ اِن میں نقص دریافت
کرنا کفر میں داخل ہے اِن سب باتوں کو چھوڑ کر ہمارا
فرض ہے کہ تاریخ کا مطالعہ تحقیق کی نظر سے
کریں - جو لغزشیں اپنے بزرگوں کی نظامِ معاشرت
میں دیکھیں اُن سے عبرت حاصل کریں اور اُن کے

تجربے سے فائدہ اٹھائیں ۔

سب سے زیادہ ضروری اصول مطالعہ تاریخ کی نسبت یہ ہے کہ ہمیں اپنے ملک یا قوم کی کل تاریخ کو دنیا کی تاریخ سے الگ نہ سمجھنا چاہیئے ۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے ملک یا قوم کی تاریخ اِس عظیم الشان تاریخ کی ایک شاخ ہے جو کل بنی نوع انسان کی تہذیب اور ترقی کی داستان ہے اور جس کا سلسلہ زمانہ قدیم میں دور تک پہنچتا ہے ۔ اگر ہم تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالیں تو ہم پر ثابت ہو جائے گا کہ ہماری موجودہ حالت اِن ہزاروں اخلاقی اور علمی قوتوں کی رو سے ظہور میں آئی ہے جو کہ ابتدائے آفرینش سے اب تک مختلف ملکوں اور قوموں میں کام کرتی آئی ہیں ۔ ہزاروں دِل و دماغ تحقیقات علمی کے لیئے وقف ہو چکے ہیں ۔جنھوں نے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں تہذیب کی شمع روشن رکھی ہے اور ایک ملک کا چراغ دوسرے ملک سے جلا ہے ۔ مثلاً اس زمانے کی سیر کرو ۔ جب وادی انڈس میں تہذیب کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا ۔ چین میں علم و فن کی ترقی ظہور میں آ رہی تھی ۔ بابل میں تہذیب اپنا ابتدائی رنگ جما رہی تھی ۔ پھر اِس زمانے کی تصویر اپنی آنکھوں کے سامنے کھینچو ۔ تعلقات باہمی شروع ہونے مختلف علم و عقل کے کارنامے اور صنعت و حرفت کے نمونے ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے غرضیکہ

اسی طور سے دنیا روز بروز ترقی کرتی گئی۔ آج ہمارے سامنے تہذیب کے وسیع باغ ہیں۔ مختلف رنگ کے پودے اپنی اپنی بہار دکھلا رہے ہیں اور ہمارے دلوں کو سرور اور آنکھوں کو نور بخش رہے ہیں۔ ان میں ایسے پودے بہت کم ہیں کہ جنھوں نے ابتدائے آفرینش سے اب تک ایک ہی سرزمین کی آب و ہوا میں نشوونما پائی ہو۔ برعکس اس کے ہر ایک پودا ایسا ملے گا جس میں دوسرے ملک کے پودے سے لا کر قلم لگائی گئی ہے۔ دیکھو آج علم ہندسہ کس ترقی پر ہے۔ اہلِ یورپ نے اس میں کیا کیا باریکیاں پیدا کی ہیں۔ اب اگر اس کی تاریخ پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اہلِ یورپ نے اہلِ عرب سے حاصل کیا ہے۔ اور اس کی ایجاد کا سرا ہندوستان کے سر ہے۔ جہاں سے اہلِ عرب نے اسے سیکھا۔ ہر گھنٹے کے ساٹھ منٹ اور ہر منٹ کے ساٹھ سیکنڈ پر تقسیم اہلِ بابل کا ایجاد ہے۔

آتش فشاں آلاتِ حرب کی صنعت اہلِ یورپ کے ساتھ مخصوص سمجھی جاتی ہے۔ مگر اصل میں اہلِ چین ان کے موجد ہیں۔ کیونکہ بارود چین ہی کی ایجاد ہے۔ فن جہاز رانی آج کس ترقی پر ہے۔ اس کے لئے بھی ایک معنی میں اہلِ چین کا شکریہ لازم ہے کیونکہ قطب نما پہلے انہوں نے بنایا۔ دور کیوں جاؤ یورپ کی موجودہ تہذیب بہت کچھ اہلِ عرب کے احسانوں سے

گرانبار ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یورپ میں پہلی یونیورسٹی اور پہلی رصدگاہ مسلمانوں نے ہی قائم کی۔

اِسی طرح اور بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں غرضکہ اس صورت پر تاریخی واقعات کا اندازہ کرنے سے یہ آئینہ ہو جاتا ہے۔ کہ ہماری موجودہ تہذیب کل پُرانی تہذیبوں کا عِطر ہے۔ اور یہ ایسا اصول ہے۔ جو تنگ خیالی اور کم نظری کے فنا کرنے کے لیئے جادُو کا اثر رکھتا ہے۔ اکثر ہندو مسلمان کے جھگڑے "پدرم سلطان بُود" کے نازِ بے جا پر قائم ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ ہم نے عاداتِ بد مسلمانوں سے سیکھے۔ اور مسلمان کہتے ہیں کہ ہم نے ہندوؤں کو اخلاقِ حسنہ سکھائے ہیں اُن سے کچھ نہیں سیکھا ہے۔ مگر دونوں فرقوں میں جن لوگوں کی نظر وسیع اور جن لوگوں کے دِماغ علمِ تاریخ کے نور سے روشن ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندو بہت سی خوبیوں کے لیئے مسلمانوں کے احسان مند ہیں اور مسلمان ہندوؤں کے *

جناب رانا ڈے مرحوم نے لکھنؤ میں سوشل کانفرنس کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اُس میں ثابت کر دیا تھا کہ ہندوؤں نے انتظامی قابلیت اور لیگا نگت کا اُصول مسلمانوں سے سیکھا اور دماغی اور روحانی ترقی کا سبق مسلمانوں نے ہندوؤں سے۔ اِن واقعات پر غور کرنے سے اِن کاوشوں سے نجات

بل سکتی ہے - جو کہ جہل و تعصب کی وجہ سے
دلوں میں پیدا ہو گئی ہیں ٭

قصہ مختصر عالم تاریخ کی سیر بھی عجب روحانی سرور کا سرمایہ بہم پہنچاتی ہے اور عقل کو جلا دیتی ہے - اس عالم میں قدم رکھتے ہی تجربہ کا آفتاب نور افشاں نظر آتا ہے - جس سے دل کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں - اس عالم میں تہذیب اور ترقی کی وہ زبردست شاہراہ نظر آتی ہے - جس کا ایک کنارہ ازل ہے اور دوسرا ابد - جس کی ہر منزل پر فیض کے چشمے جاری ہیں - کہیں وہ بزرگ اپنی خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں جنھوں نے مذہب اور فلسفہ کی تحقیق میں اپنی عمر صرف کر دی ہے اور طبع نورانی سے ایسے چراغ روشن کر گئے ہیں جنھیں ہوائے مخالف کے جھونکے نہیں بجھا سکتے اور جن کی روشنی میں اب تک بہت سے گمراہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں - کہیں وہ بزم جادو آراستہ نظر آتی ہے - جس میں بڑے بڑے معجز نگار نثاروں اور شاعروں کا مجمع ہے - نکتہ سنجیوں کے گلدستے مہک رہے ہیں اور شراب سخن کا جادو چل رہا ہے - کہیں ان قوی ہیکل اور ضیغم منش جوانوں کی پُر رعب صورتیں دکھائی دیتی ہیں جن کی چتونوں سے سچی عزت کا نور برس رہا ہے اور جن کی تلواروں کے پانی سے ابتک مختلف

قوموں کے اعزاز و وقار کا چمن ہرا ہو رہا ہے
اسی طرح عالم تاریخ میں ہر علم و فن کے باکمال
حضرات کی زیارت کا موقع ملتا ہے۔ اور لطف
یہ ہے کہ ادنیٰ سے اعلیٰ شخص عظیم الشان انسانوں
کی صحبت میں بلا تکلف شریک ہو سکتا ہے اور اپنی
قابلیت کے مطابق فیض حاصل کر سکتا ہے ؎

دیہات کی زندگی

مولوی عبد الحلیم شرر

اے شہروں کے عالی شان محلوں میں رہنے والو! تمہیں نہیں معلوم کہ دیہات والے دنیا سے کیا لطف اُٹھاتے ہیں۔ تم ایک منزلِ عشرت میں ہو۔ عالم کی نیرنگیاں تمہاری نظر سے بہت کم گذرتی ہیں جس مقام پہ تم ہو وہاں صبح و شام کی مختلف کیفیتیں بھی اپنا پورا پورا اثر نہیں دکھا سکتیں۔ خبر بھی نہیں ہوتی کہ آفتاب کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ ہوا کس طرف کی چلی اور کیا کیا بہار دکھا گئی۔ مگر غریب دیہات والے جنھیں تم نے اکثر ذلت کی نظر سے دیکھا ہوگا۔ وہ اِن امور کا ہر وقت اندازہ کرتے رہتے ہیں۔ ہر صبح اُنہیں ایک نیا لطف دِکھاتی ہے۔ اور ہر شام سے اُنھیں ایک نئی راحت نصیب ہوتی ہے۔

گاؤں کے جفاکش رہنے والے صبح ہونے سے پہلے ہی نیند کا پورا لطف اٹھا چکتے ہیں۔ صبح کے تارے ہنوز جھلملانے بھی نہیں پاتے ہیں اور وہ اپنی رات کی ضروری راحت سے اُکتا چکتے ہیں۔ ایسے وقت میں نسیم سحر کے خوشگوار اور نازک جھونکے آتے ہیں اور بڑے ادب سے

اُنہیں جگانے لگتے ہیں ۔ اِس وقت اِن کے ناز اور بادِ سحر کے نیاز دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں ۔ صبح کی ہوا نہایت شگفتگی کے ساتھ جگاتی ہے ۔ اور وہ نہیں جاگتے صرف کروٹیں بدل بدل کر رہ جاتے ہیں ۔ بادِ سحر یونہی اصرار کرتی ہوئی ہے کہ صبح کے نقیب مرغانِ سحر اُٹھتے ہیں ۔ اور اُنھیں اُٹھاتے ہیں ۔ غریب ۔ محنت پسند لوگ تازہ دم اُٹھ بیٹھتے ہیں ۔ وقت کی کیفیتوں کو نہایت غور سے اور بڑے لطف کے ساتھ دیکھتے ہیں ۔ ان کا پہلا کام ہوتا ہے کہ جھونپڑوں سے باہر نکلے ۔ آسمان کو دیکھا ۔ جس میں تارے جھلملا رہے تھے ۔ افق مشرق کی روشنی پر نظر ڈالی جو رات بھر کے چمکتے ہوئے تاروں پر غالب آتی جاتی تھی ۔ کچھ کچھ نمودار ہونے والے درختوں کو دیکھا جن پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں ۔ یہ سماں اپنی خوبیاں دکھا کر انہیں بیخود کرنے کو تھا کہ اُنھوں نے اپنے دن کے کام کو یاد کیا ۔ آگے بڑھے اور رات کی دبی ہوئی آگ پر گری پڑی پتیاں جمع کر کے آگ جلائی ۔ تاپ تاپ کے افسردہ ہاتھ پاؤں کو گرمایا ۔ اِس کے پاس کے شکستہ جھونپڑے میں جا کے بیل کھولے اور عین اس وقت جب کہ آفتاب کی کھڑی کرنیں مشرقی کنارۂ آسمان سے اُوپر کو چڑھتی نظر آتی تھیں ۔ یہ لوگ لمبے لمبے ہلوں کو کندھے پر رکھ کر کھیت کی طرف روانہ ہوئے ۔ کھیتوں کی مینڈوں پر جا رہے ہیں اور زمین کی فیاضیوں کو کس مسرت اور خوشی کی

نظر سے دیکھتے جاتے ہیں۔ ہرے ہرے کھیت ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے سے لہرا رہے ہیں۔ نظر اِس خوشگوار سبزے پر عجب لطف کے ساتھ کھیلتی ہوئی دُور تک چلی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پودے جو خدا کے پاس سے دنیا والوں کی روزی لے کر آئے ہیں کس قدر شگفتہ اور بشاش نظر آتے ہیں۔ رات کا برقعہ اُٹھا کر آسمان نے اُنھیں اور خوبصورت بنا دیا ہے۔ کیوں کہ تاروں کی چھاؤں میں اس وقت اُن کی نازک اور چھوٹی پتیوں پر شبنم کے موتی جھلک رہے ہیں۔ ایک عالمِ جواہر ہے۔ جس پر جھلملاتے ہوئے تاروں کی شعاعیں خدا جانے کیا کیفیت دکھا رہی ہیں۔ اِن جفا کشوں نے اِس وسیع میدان کو نہایت شوق سے دیکھا۔ جو اِس وقت تو صرف ان کی نظر کو ہی خوش کرتا ہے مگر اصل میں قدرت کے ہدیے اور نیچر کے تحفے ہر جاندار کو اسکی فیاضیوں سے ملتے ہیں۔ یہ لوگ کھیتوں پر پہنچ کر اپنی غفلت پر نادم ہو گئے۔ کیونکہ اور لوگ ان سے بیشتر ہی پہنچ چکے تھے۔

یہ سب لوگ ترو تازہ کھیتوں میں منتشر ہو گئے آفتاب کی کرنوں نے جو امیر و غریب سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں۔ کھیتوں کی بینڈوں پر اور کنوؤں کے کناروں پر اِن کا خیر مقدم ادا کیا۔ اب یہ لوگ اپنے کام میں اس قدر مصروف ہیں۔ کہ نیچر کے جذبات بھی ان پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتے اور

قدرت کی بہار بھی ان کی دلفریبی کرنے سے عاجز ہے - وہ ہرا ہرا سبزہ زار - وہ سہانا سماں - وہ صبح کی بہار وہ تر و تازہ ہوا وہ اجلی کرنیں - ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا شوق اکثر منچلی طبیعت والوں کو شہر سے باہر کھینچ لے جایا کرتا ہے - ان کو یاد کرتے ہی بارہا ہم پر ایسی وحشت سوار ہوتی ہے کہ گھر سے دو دو تین تین کوس تک نکل گئے ہیں - مگر یہ لوگ اپنے روزانہ کاموں میں ایسے مصروف ہیں کہ ان کیفیتوں کو آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے - زمین کی اس استعداد کے بڑھانے میں دل و جان سے مساعی ہیں - جو صرف ان کے لئے نہیں - تمام دُنیا کے لئے مفید ہے - جان توڑ توڑ کر محنت کر رہے ہیں - غریب کم قوت بیل جو شاید رزق رسانی کی فکر میں دُبلے ہو گئے ہیں - ان کے ہاتھوں کی مار کھاتے ہیں - اور زمین کو پیداوار کے قابل بناتے چلے جاتے ہیں - اپنی محنت آسان کرنے کے لئے یہ لوگ نہایت دردناک آواز میں کچھ گاتے جاتے ہیں - اور اُن کی آواز کھلے میدان میں گونج گونج کر ایک نئی کیفیت پیدا کرتی جاتی ہے - کنوؤں کے کنارے والے پانی نکال کر زمین کو سیراب اور چھوٹے چھوٹے درختوں کو زندہ کر رہے ہیں - دیکھو وہ کس شوق سے اس بات کے منتظر ہیں کہ ڈول

اُوپر آئے اور انڈیلیں اور جس وقت ڈول اُن کے ہاتھ میں آجاتا ہے کس جوش کے عالم میں چلّا اُٹھتے ہیں "الہ دین" پانی اِن کی بڑی دولت ہے۔ جس کی اُمید میں وہ آرزو مند بن بن کر کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں اور کبھی کنووں کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ آفتاب پوری بلندی پر پہنچ کر نیچے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جھکتے جھکتے افق مغرب کے قریب پہنچتے وقت باغ عالم کی دلچسپیوں سے رخصت ہونے کے خیال میں زرد پڑ جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ آفتاب کی حالت اور وضع میں اختلاف ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ نہ تھکنے والے اور دھن کے پکے دہقان ایک ہی وضع اور ایک ہی صورت سے اپنا کام کئے جاتے ہیں۔ نہ محنت اُنھیں تھکاتی ہے نہ مشقت اُنہیں ماند کرتی ہے۔ نہ دھوپ سے پریشان ہوتے ہیں نہ کام کرنے سے اُکتاتے ہیں۔ الغرض آفتاب غروب ہوتا ہے۔ دن اِن سے رخصت ہوتا ہے۔ اور شام کی دلفریب کیفیتوں کا لطف بخوبی دیکھ کر یہ اُمید لگا کے کہ کل کھیتوں کو آج سے زیادہ تر و تازہ پائیں۔ اپنے کھیتوں سے رخصت ہوتے ہیں خوش خوش اِس کچے اور کم حیثیت گھر میں آتے ہیں۔ جسے ہم نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے ہیں

بی بی غریبی کا کھانا اور فصل کے مناسب غذا ان کے سامنے لاکر رکھ دیتی ہے۔ وہ نہ دل سے خدا کا شکریہ ادا کر کے کھاتے ہیں۔ اور دوسرے دن کی محنت کا خیال کر کے اپنے تئیں سویرے ہی سُلا دیتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جس وقت شہروں کے پہر دن چڑھے تک سونے والے سیہ کار اپنی شرمناک زندگی کے بھدے نمونے دکھانے کے لئے جاگتے ہوتے ہیں۔ زاہد نمازِ عشا پڑھ کے سو چکا ہے۔ بے فکرے تپیں اڑا رہے ہیں۔ شعراء مضمون آفرینی کی فکر میں ہیں۔ امراء کے محلوں میں کھانے کا اہتمام ہوتا ہے۔ بچے کہانیاں سُن رہے ہیں طلبا کتاب پر جھکے ہوئے ہیں مے کش وہ پیاس بجھا رہے ہیں جو کمبخت نہیں بجھتی۔ سیہ کار بدکاری کی دھن میں شہر کی سڑکیں اور گلیاں چھان رہا ہے۔ اور یہ جفاکش عجب میٹھی نیند میں غافل سو گئے ہیں۔ تاکہ تڑکے آنکھ کھلے۔ یہ اطمینان اور آسائش بے شک رشک کے قابل ہے ؎

گاؤں عموماً قدرت کا سچا جلوہ گاہ ہوتا ہے۔ اور وہاں کے سین اپنی سادگی اور دلفریب کیفیتوں کیساتھ انتہا سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔ اے شہر کے نازک خیال اور چابکدست کاریگرو! وہاں تمہاری صناعیوں کی بالکل قدر نہیں۔ وہاں صرف قدرت کی

کاریگری عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور خدا کی فیاضیاں بڑی فیاضی کے ساتھ پسند کی جاتی ہیں - اور نہایت شوق سے لی جاتی ہیں اُن کی خوشی کا پیمانہ بہت چھوٹا اور تنگ ہے وہ بہت تھوڑے میں خوش ہو جاتے ہیں اور اداسے مسرت اُن کی دلفریبی کے لئے کافی ہوتی ہے - اور وہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زار جنہیں وہ روز صبح و شام کو آتے جاتے دیکھا کرتے ہیں ان کے مسرور کرنے کے لئے بہت ہیں - اور نہر و تازہ کھیت جن سے زیادہ پیداوار کی اُمید ہے - ان کی خوشی کو اعتدال سے زیادہ بڑھا دیا کرتے ہیں ۔

دیہات کا چودہری اگرچہ اس کی حکومت چند کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں اور ایک وسیع میدان پر محدود ہے - مگر اپنے حلقے کا پورا بادشاہ ہے - اس کے آگے وہاں کی مختصر آبادی میں ہر ایک کا سر جھک جاتا ہے - اس کے رواج کو ہر شخص بلا عذر تسلیم کر لیتا ہے - اس کے فیصلوں کا کہیں اپیل بھی نہیں ہوتا - مگر باوجود اس حکومت کے دیکھو - وہ کس بے تکلفی سے اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا ہے - دنیاوی پُر تکلف فرش کی ضرورت نہیں - بلکہ کرسی کو وہ ناپسند کرتا ہے - قدرت کے سادے فرش اور خدا کی زمین پر

اس کا دربار لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کو
اپنے رتبے کے قریب ہی سمجھتا ہے۔ اس لئے
نہ وہ کسی ممتاز مقام پر بیٹھتا ہے۔ اور نہ گاؤں
والے کسی ذلت کی جگہ پر ہیں۔ بس یہ حالت ہے
کہ اگر عزت ہے تو سب کی۔ اور اگر ذلت ہے
تو سب کی۔ اس کے گھر میں بھی وہی سامان اور
وہی فرنیچر ہے جو اس کے ماتحتوں کے گھر میں ہے
چارپائی اس کا نرم اور آرام دہ بچھونا ہے۔ کچی مگر
صاف اور پتی ہوئی کوٹھڑیاں۔ اس کی خوابگاہ
اور ہال ہیں۔ جفاکش اور گرہست بہو بیٹیوں کے
ہاتھ پاؤں اس کے خادم ہیں۔ کوٹھیوں میں بھرا
ہوا غلہ اس کی دولت ہے۔ چند ڈبلے اور لاغر
مویشی اس کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ایک کم حیثیت
مکان اس کی کوٹھی ہے۔ اور گرد کے کھیت اور آس
پاس کا سبزہ زار اس کا جانفزا باغ ہے۔

گاؤں والوں کی یہ بات کس قدر قابل حسد ہے
کہ وہ ایک سادی اور بسیط حالت پر ہیں۔ ان کی
کفایت شعاری کی زندگی کس صفائی اور اطمینان سے
گذرتی ہے۔ ان کی فکریں ہمارے مقابل میں بہت
کم ہیں۔ وہ ہمارے روپے پیسے کے بھی محتاج نہیں
ہمارا سکہ بھی ان میں بہت کم مروج ہے۔ چونکہ ان کی
نظر ہر وقت رازق مطلق کی طرف لگی رہتی ہے۔ اس
لئے وہ خدا کی بے واسطہ فیاضیوں ہی سے سکے

کا کام بھی نکال لیتے ہیں - غلّہ اور اناج اِن کا سکہ ہے - دنیا کی ہر چیز جو اُن کی ضرورتیں رفع کر سکتی ہے غلے کے عوض میں اِن کو بہ آسانی اور بکفایت مل سکتی ہے ۔

غریب دیہاتیوں کی یہ بات اس قابل ہے کہ ہم اِن سے ایک کارآمد سبق لیں وہ یہ کہ اِن میں پورا اتفاق ہے - وہ ایک ایسے کونے میں پڑے ہیں کہ گورنمنٹ بھی اِن کی زیادہ حمایت نہیں کر سکتی - اور اِن کے دشمنوں کے مقابل میں انھیں قوی نہیں بنا سکتی - مگر اتفاق اُن کی قوت ہے - اور باہمی ہمدردی اُن کا ہتھیار ہے - افلاس اور آفات سماوی بھی کبھی اِن کے دشمن ہو جاتے ہیں - مگر وہ اسی ہتھیار کو لے کے اُٹھتے ہیں - اور کامیاب ہوتے ہیں - کھیتوں میں پانی پہنچانے کے وقت وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں - کھیتوں میں تخم ڈالنے کے وقت وہ ایک دوسرے کو غلّہ قرض دیتے رہتے ہیں ۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ایک عالم کی فکر اپنے سر لیتے ہیں - اور دنیا بھر کے لیے خود مصیبت میں پھنستے ہیں - ہم بے فکر ہیں - اور اپنی اغراض اور بقائے زندگی کے اسباب کو بھولے ہوئے - مگر ہماری طرف سے اس کام کو وہ پورا کرتے ہیں - اس جفاکشی کے انعام میں خدا کی طرف سے

انھیں جو کچھ ملتا ہے اس میں سے خود بہت کم لیتے ہیں - اور سب ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔ ایک کسان کی زندگی پر غور کرو - اور اس کی سالانہ محنت و مشقت کا اندازہ کرو - کہ کس طرح جان توڑ توڑ کر اپنے تئیں مٹا مٹا کر جفا کشی پر تلا رہتا ہے - اور اس کے بعد یہ غور کرو کہ وہ کس لئے اس مصیبت میں پڑتا ہے - تو معلوم ہو کہ وہ دنیا کا کتنا بڑا ہمدرد ہے - اور حبِّ ملک کس قدر اسکے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے - بے شک وہ ساری دنیا کے لئے محنت کرتا ہے - اور اس سے زیادہ نوعِ انسانی کا دوست دنیا بھر میں نہ ملے گا ◆

آج کا کام کل پر ڈالنے کی خرابیاں
ایک کاہل شخص کی عبرتناک داستان

لالہ رام کشن

ایک شخص باسل نامی جو اور سب طرح بڑا لائق و فائق تھا - مگر آج کا کام کل پر ڈال دینے کی عادتِ بد کے سبب تمام عمر بڑی ذلتیں اور نقصان اٹھاتا رہا اپنی سرگزشت اس طرح لکھتا ہے ؛

مدت سے میری خواہش تھی کہ میں اپنی سرگزشت لکھوں - مگر اب میں نے مصمم اِرادہ کر لیا ہے - کہ آج ہی اُسے شروع کر دوں - کیونکہ میری زندگی میں میرے بڑے بڑے اعلیٰ مقاصد اور اچھے اچھے ارادے صرف آج کا کام کل پر ڈالنے کی عادتِ بد کے طفیل خاک میں مل گئے ہیں ؛

عہدِ شباب میں مجھے اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ تم میں فقط یہی ایک عیب ہے - کہ آج کا کام کل پر ڈال دیتے ہو - میں اس بات کو تسلیم کرتا تھا مگر اپنی ذکاوتِ طبع کے سامنے اس کو کچھ ایسا بڑا نقص خیال نہ کرتا تھا - اور سمجھتا تھا کہ جب ہی

چاہوں گا اس کی اصلاح کرلوں گا - مگر آجتک وہ دن نصیب نہیں ہوا - اور اب بڑھاپے میں تو کیا اصلاح ہوگی - ہاں عمر گذشتہ کا افسوس باقی ہے - لیکن اب پچھتائے کیا ہووے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ۔

میرے والد لنڈن میں ایک نامی کتب فروش تھے اور جس دن میں تولد ہوا اس دن وہ اتفاق سے کتاب تذکرہ المشاہیر دیکھ رہے تھے - اور جس وقت میری پیدائش کی انھیں اطلاع ہوئی اس وقت وہ باسل کا حال پڑھ رہے تھے اور یہ شخص قیصریہ کا اسقف اور عظیم اخلاق کی کئی کتابوں کا مصنف تھا - پس میرے والد نے اس امر کو نیک فال سمجھ کر میرا نام باسل ہی رکھ دیا اور کہنے لگے کہ میرا بچہ ضرور بڑا آدمی ہوگا - اور یقین ہے کہ میں اپنی آنکھوں سے اس کا عروج دیکھوں گا - بچپن میں میری ذکاوت اور حافظہ جو شاید میرے ہمجولیوں سے بڑھ کر نہ تھا - میرے باپ کی نظروں میں محبت پدری کے سبب معمول سے زیادہ معلوم ہوتا تھا - اور اسی وجہ سے وہ کہا کرتے تھے کہ اس لڑکے کو اعلےٰ قسم کی تعلیم دینی فرض ہے - اور فی الواقع اپنی استطاعت سے بڑھ کر انھوں نے میری تعلیم کے وسائل مہیا کیے ۔

لڑکپن سے ہی مجھے خیال تھا کہ میں بڑا

آدمی ہوں گا۔ اور عرصے تک میرے اُستاد بھی مجھ سے خوش رہے۔ مگر اُن کا یہ کہنا کہ یہ لڑکا تیز فہم ہے" میرے حق میں مضر ہوا۔ میں سبق یاد کرنے کو آسان کام سمجھ کر ٹال ٹول کرتا رہتا۔ اور عین وقت پر یاد کرنے بیٹھتا اِس طرح خود پسندی کے طفیل التوا کی عادت پڑ گئی۔ جس کا خاتمہ رسوائی کے ساتھ ہوا ٭

جب میں سرکاری مدرسے میں پڑھنے بیٹھا تو میرے ہم جماعتوں میں بعض ایسے تھے۔ جن کی صحبت میں میں اِس قدر سست ہو گیا۔ کہ مجھے ہفتے میں دو دفعہ مار پڑا کرتی تھی۔ بڑا ہوا تو چاہیے تھا کہ میری عقل مجھے اصلاح کی طرف مائل کرتی۔ مگر یہ بات نہیں ہوئی۔ کیونکہ میرے والد کی بعض بے احتیاطی کی باتوں نے میری خود بینی کو اور تقویت دی۔ جس سے میں کاہل ہوتا رہا ٭

جب میں تعطیلوں میں گھر آتا اور میرے اُستاد میری شکایتیں خطوں میں لکھتے تو میرے والد مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرتے اپنے کسی دوست سے باتوں باتوں میں میری تعریف کر جاتے کہ میرا بالک بھی عجیب قسم کا آدمی ہے چاہے تو سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر بڑا کاہل ہے اس کے استاد بڑی شکایتیں لکھتے ہیں۔ لیکن یہ

نہیں جانتے ہیں کہ سارے ذہین آدمی ایسے ہی ہوا کرتے ہیں - دیکھو فلاں شخص کیسا کاہل وجود ہے - جو کام کرتا ہے وہ کل پر ڈال دیتا ہے - اس کی کتاب میرے پاس شائع ہونے کی غرض سے آئی تھی واہ وا کیا عجب کتاب ہے - جب وقت اخیر ہو جاتا ہے تو کام کرتا ہے مگر کام سب سے اعلیٰ ہے - میں نے تو کوئی ذکی آدمی ایسا نہیں دیکھا جو کاہل نہ ہو ۔

اس قسم کی باتیں میرے دل میں جاگزیں ہو گئیں - اور میں اپنے خیال میں ذہانت اور کاہلی کو یہاں تک لازم و ملزوم سمجھنے لگا - کہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا میرے نزدیک ناممکن تھا اسی لئے میرے ناصحوں کی پند و نصائح کا اس معاملے میں مجھ پر اثر نہ ہوتا تھا - بلکہ اس بدعادت کا مجھے فخر تھا - اور ابھی مجھے اپنی نادانی کے باعث کوئی سخت ندامت بھی نہ ہوئی تھی ۔

پہلی ہی دفعہ مجھے ندامت اس وقت ہوئی - جب اٹن کالج میں اپنی سستی کے سبب اس انعام سے محروم ہو گیا جو شعر لکھنے کے لیئے مقرر ہوا تھا - وجہ یہ ہوئی کہ میں نے شعر تو لکھ لئے تھے - مگر ان کی صاف نقل کرنے میں ایسی تاخیر کی کہ وہ موقع گذر گیا - جو ان کے پیش کرنے کے واسطے مقرر تھا - میرے شعروں کی چھوٹے

بڑے سب تعریف کرتے تھے ۔ مگر انعام ایک بھدّا
سا لڑکا جانسن لے گیا ۔ جو کچھ بھی ذہین نہ تھا ۔
ہاں ثابت قدم اور محنتی تھا ۔ میرے شعر گو کیسے
ہی اچھے تھے پر کس مصرف کے ؟ البتہ میں
اُنھیں یاروں کو دکھا دکھا کر شیخی بگھارتا تھا ۔ اگر
میں چاہتا تو وقت پر پیش کر سکے ۔ انعام مار سکتا
تھا ۔ میرے والد اِس عزت و توقیر کے موقع کو
ہاتھ سے کھو دینے کے سبب مجھ سے سخت ناراض
ہو گئے ۔ زیادہ تر قلق اِن کو اِس وجہ سے ہُوا کہ
اِس انعام کے جلسے کو بادشاہ نے اپنی تشریف آوری
سے مزین کیا تھا ۔ اور جن طلبا نے انعام و اکرام
پائے تھے ۔ وہ بادشاہ کے سامنے پیش کئے گئے
تھے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اِن لڑکوں کو اوائل عمر
میں صاحب فہم و فراست خیال کیا جانا اِن کے
حق میں بہت فائدہ بخش ہوگا ۔ اب تو میرے والد
نے میرے درست کرنے کی دل میں ٹھان لی
اور اِسی نیت سے اُنھوں نے مجھے ایک کتاب جس
میں کاہلی کی مضرتیں بہت عمدہ طور سے ظاہر کی گئی
تھیں ، مطالعہ کو دی ۔ پر افسوس اِس کا کچھ اثر نہ
ہوا ۔ بلکہ بار بار پڑھنے سے میرا دِل ایسا ہٹا
کہ اُلٹا اِس مصنف کی ہجو پر کمر بستہ ہو گیا ۔ اور
خوب زبردست تحریریں لکھیں ۔ حتیٰ کہ اُن کی بدولت
میری کیسی قدر شہرت ہوگئی ۔ چنانچہ ایک فاضل

لاٹ پادری کو میری انشاء پردازی ایسی پسند آئی کہ مجھے اکثر اپنے مکان پر کھانے کے لئے بلانے لگا اور چونکہ مجھے والد نے مذہبی تعلیم اس لئے دلوائی تھی کہ میں بھی شاید اپنے ہم نام کی طرح کسی دن اسقف کے ممتاز عہدے پر سرفراز ہو جاؤں۔ اس واسطے مجھے اپنے مُربی کی مہربانی سے امید تھی کہ وہ میرے لئے کوئی معقول تجویز کرے گا۔ میں ابھی پورا پادری نہیں بنا تھا کہ اس کے ماتحت چار سو روپے ماہوار کی ایک اسامی نکلی۔ اس نے میرے واسطے کچھ عرصے تک خالی رکھی اور اس اثناء میں اس نے خیرات پر وعظ کرنے کے لئے مجھے ایک مضمون لکھنے کو کہا کیونکہ اُسے ایک بھاری مجمع کے سامنے یہ وعظ کرنا تھا۔ میں اپنی عادت بد اور شامت اعمال کے سبب ہر روز مضمون لکھنا ملتوی کرتا رہا حتیٰ کہ جمعے کی شام آ گئی اور اگلے دن سنیچر کو وعظ ہوتا تھا۔ اتفاقاً اس شام کو میرے دوست آشنا میرے ہاں آ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ اس میں بڑی رات آ گئی۔ میں اپنے اس غرّے میں کہ مضمون ہے کیا میرے ایک گھنٹے کا کام ہے۔ صبح کو لکھ لوں گا۔ پڑ کر سو رہا۔ لاٹ پادری کے چوبدار نے صبح مجھے آ جگایا کہ پادری صاحب مضمون

مانگتے ہیں - یہ سنتے ہی میرے حواس باختہ ہو
گئے - گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا - گھنٹہ دیکھا تو
۹ بج چکے تھے - جھٹ پٹ لکھنے بیٹھ گیا - اُدھر
دل اُدھر ہاتھ دونوں کانپ رہے تھے - اور
خیالات ایسے پریشان کہ پاؤ گھنٹہ گزر گیا اور
شروع کا فقرہ ختم نہ ہوا - چالیس منٹ تک
تو میں نے لاٹ پادری کے چوبدار کو ٹھہرا رکھا
اس عرصے میں بمشکل کاٹ کوٹ کر دو صفحے لکھے
پھر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا - آخر اِس
جلدی کے لکھے ہوئے پر اطمینان نہ ہوا اور وہ
دونوں صفحے بھی پھاڑ ڈالے - اب چوبدار بولا کہ
میں زیادہ نہیں ٹھہر سکتا - آخر مجبور ہو کر
بے حیائی سے میں نے یہ رقعہ لکھ بھیجا - کہ
ناگہاں بیمار ہو جانے کے باعث میں مضمون
لکھنے سے قاصر رہا - معاف فرمائیں - اس میں تو کچھ
شک نہیں کہ جب میں لکھنے بیٹھا تھا تو بیماروں
سے بدتر تھا - میرے سر میں سخت درد تھا - اس
روز سارے دن گھر میں پڑا ہوا اپنی حالت پہ تاسف
کرتا رہا - اور تغافل شعاری کا نتیجہ جو میں نے اُسی
دن سمجھ لیا تھا - وہی ظہور میں آیا - کہ وہ اسامی
دوسرے ہی روز ایک اور شخص کو مل گئی اور
جس مربی کی طرف سے اب میری ساری امیدوں
کا خاتمہ ہو گیا ۔

اسپر تو میرے والد نے بڑی ہی لعنت ملامت کی - اس ناکامی اور لعنت ملامت کے صدمے سے شاید میں دُرست ہو جاتا - مگر خوش نصیبی کی ایک ایسی غیر مترقبہ بات واقع ہوئی کہ جس سے بجائے بہتری کے میری بربادی ہو گئی وہ یہ تھی کہ میرے کالج کے احباب میں سے ایک شریف زادہ تھا - جس کا باپ چین کی سفارت پہ مامور ہوا تھا - میرے باپ کی دُکان پہ وہ نوجوان کتاب خریدنے آیا اور جونہی اس نے سنا کہ میں سفارت کے ساتھ جانے کا مشتاق ہوں - فوراً جاکر اپنے باپ سے میری سفارش کی کہ اسکو بھی سفیر صاحب کے مصاحبوں کے زمرے میں داخل کر لیا جائے اور میری علمی لیاقت کی بہت تعریف کی اور میرے خیالات کے خاکے جو میں نے اُسی موقع کے لئے تیار کئے تھے پیش کئے - اُن کی بدولت میرے حال پہ سفیر صاحب کی وہ عنایت مبذول ہوئی جس کا میں دل سے خواستگار تھا - یعنی میرا سفارت کیساتھ جانا قرار پا گیا *

میرے اس دُور دراز کے سفر پہ جانے کی میرے والد نے سخت مخالفت کی - کیونکہ جس پیشے کے لئے اُنہوں نے مجھے تعلیم و تربیت کی تھی اُسے ترک کر دینا میرے والد کو بہت ناگوار ہوا

اور کسی نہ کسی دن مجھے اسقف کے عہدۂ جلیلہ پر دیکھنے کی جو انھیں امید تھی اس کا منقطع ہو جانا ان کے لیے کوئی آسان بات نہ تھی۔ آخر جب میں نے یہ عذر پیش کیا کہ مذہبی کام میری لیاقت کے مناسبِ حال نہیں مجھے اپنے ذہن اور لیاقتِ علمی کے جلا دینے کے لیے نہایت ضرور ہے۔ کہ میں غیر ملکوں میں جا کر نئے نئے واقعات اور قِسم قِسم کے طریقِ معاشرت دیکھوں۔ ان باتوں سے میرے والد کی کچھ تشفی ہوئی۔ اور وہ سمجھے کہ اسقف نہیں تو میرا لڑکا نامی مصنف تو ضرور ہو جائے گا۔ پس اس شرط پر میرے والد نے میرا چین جانا منظور کر لیا۔ کہ میں دو ضخیم جلدوں میں اپنی سیاحت اور ملکِ چین کے حالات تحریر کرنے کا عہد و پیمان کر لوں مجھے اپنی عادت کے موافق یہ کام کچھ ایسا دشوار معلوم نہ ہوا۔ میں نے فی الفور اقرار کر لیا میرے دل میں تو سینکڑوں منصوبے اور امیدیں بھری ہوئی تھیں۔ اس سفر کی باتوں میں صبح سے شام ہو جاتی تھی۔ اگرچہ میرے والد نے تیاری کے لیے بار بار تاکید کی۔ لیکن میں لیت و لعل ہی میں وقت گذارتا رہا۔ جب وہ ہفتہ آ پہنچا۔ جس میں جہاز روانہ ہونے والا تھا تو میں گھبرایا۔ کہیں درزیوں سے جوڑے سلوائے۔ کہیں موچی سے بوٹ بنوائے۔ کہیں اور

ضروری اسباب مثلاً مختلف اقسام کے رنگ کاغذات
کاپیاں - صندوقچے - غلاف - نوشک وغیرہ خریدنے کی
کوشش کرنے لگا - ایک سادی نوٹ بک تھی -
اس میں ایک سُرخ خط درکار تھا - عین روانگی کے
دن میں وہ خط کھینچنے بیٹھا - مگر مارے جلدی کے
اس میں داغ لگ گئے - درزی ابھی تک جوڑے
تیار کر کے نہیں لایا - نہ موچی نے بوٹ دیا - ذرا
سی آہٹ پر یہی سمجھتا تھا کہ درزی آیا یا موچی
بوٹ لایا - غرض اسی بولاہٹ میں کئی دفعہ تو
میری دوائیں اُلٹ گئیں - گھڑی دیکھتا جاتا تھا
اور ان کاریگروں کو ان کی سستی اور غفلت کے
سبب بُرا بھلا کہتا جاتا تھا کیونکہ اسی رات کی
ڈاک گاڑی میں مجھے جانا تھا کہ پورٹس موتھ پہنچ کر
سفارت سے ملوں - گیارہ بج چکے اور ابھی میری آدھی
نوٹ بک میں بھی سُرخ رُول نہ ہوا تھا - نہ میرے جوڑے
آئے نہ بوٹ - حتّٰی کہ بارہ بج گئے - اور مجھے چھوڑ کر ڈاک
گاڑی چل دی یہ دیکھ کر میرے والد غصے کے مارے
تھرتھرا اُٹھے اور پیچ و تاب کھا کر مجھے سخت سست
کہنے لگے - میں نے عرض کیا کہ لارڈ صاحب روز مقررہ
پر ہرگز روانہ نہ ہو سکیں گے - کیونکہ اکثر ایسا ہی
ہوا کرتا ہے کہ دُور دراز سفر کے جانے والے اس
روز روانہ نہیں ہو سکتے جو روانگی کے لیے مقرر کیا
جاتا ہے - مجھے یقین ہے کہ لارڈ صاحب پورٹس موتھ

میں فرودِ قیام کرینگے۔ تعجب نہیں کہ وہ جس دن وہاں
پہنچیں ہوا مخالف ہو۔ اور ان کے جلو میں کیا
سارے ہی لوگ، مجھ سے بڑھ کر وقت کے پابند
ہیں؟ القصہ میری اس تقریر سے والد کا غصہ کچھ
فرو ہوا۔ اور ہم نے خیال کیا کہ آج روانہ ہونا
تو ناممکن ہے۔ البتہ کل رات کو ضرور روانہ ہوجاؤنگا

دوسری رات کو روانہ ہو کر جب میں پورٹس
موتھ پہنچا تو معلوم ہوا کہ کوئی چار گھنٹے ہوئے
ہیں کہ سفارت کے جہاز روانہ ہوگئے۔ اب تو
میرے اوسان خطا ہوگئے۔ اور چھکے چھوٹ
گئے۔ مایوسی کے صدمے سے میں نقشِ دیوار
بن گیا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر سرائے کے
ایک نرم دل خدمت گار نے دوڑ دھوپ کر کے
اتنا پتہ لگایا کہ سفارت کے رہے سہے آدمیوں
کو لے جانے کے لئے ابھی ایک اور جہاز روانہ
ہونے والا ہے۔ چنانچہ ایک شریف آدمی کو
جو اس جہاز میں جانے والا ہے دس منٹ ہوئے
کھانا کھا کر سمندر کی طرف جاتے دیکھا ہے
میں اس کے پیچھے بھاگا۔ مگر کشتی کنارے پر
سے چل دی تھی۔ میں نے بہت سا کرایہ دے کر
ایک اور کشتی تیار کرائی۔ کہ وہ مجھے اسباب سمیت
جہاز تک پہنچا دے۔ غرض میں اس میں بیٹھا۔ اور
خدا خدا کر کے عین جہاز روانہ ہونے کے وقت

جا پہنچا جب ذرا دم میں دم آیا تو میں نے دل میں کہا۔ کہ آخر میں نے جہاز کو آ ہی پکڑا اور کامیاب ہو کر ہی رہا اب تو میں اپنی خوش نصیبی پر بھروسہ کروں گا۔ مجھے تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ میں رہنے کا نہیں ؛

جب میں نے آرام سے بیٹھ کر اس معاملے میں خوب غور کی تو سفارت کے جہاز سے علیحدہ رہ جانے کا مجھے سخت رنج ہوا۔ کیونکہ میں اپنے دوست اور مربی اور ان فاضلوں کی صحبت سے محروم رہا۔ جن سے میری شناسائی ہو چکی تھی۔ اور جو مجھ پر نظر عنایت رکھتے تھے میں اپنی غفلت کے سبب ان سارے فائدوں سے محروم ہو گیا جو ان کے ساتھ رہنے اور گفتگو کرنے سے مجھے حاصل ہوتے۔ میرا جہاز جس کا نام شغال تھا ہندوستان اور غضنفر نامی سفارت کے جہازوں سے علیحدہ ہی رہا۔ جب نجد میں پہنچے تو میرے دوستوں کا پیغام مجھے ملا۔ کہ ہم فلاں مقام پر پانچ روز شغال کے منتظر رہے۔ پھر آگے روانہ ہو گئے۔ آخر الامر جب ہم جزیرہ سماٹرا کے ساحل پر پہنچے تو ہم کو ایک بلی پر جڑا ہوا ایک تختہ نظر پڑا جس پر ہمارے دوستوں نے ہماری ہدایت کے لیے لکھ دیا کہ ہم تمہارا انتظار کر کے فلاں تاریخ یہاں سے روانہ ہوئے اور فلاں راستہ سے جاتے ہیں۔ یہ نوٹس دیکھ کر میری طبیعت بشاش ہو گئی۔ گویا ہوا موافق

تھی کہ خوش قسمتی سے راستے میں بڑا حرج ہوا
ہمارے جہاز کے ہر فرد بشر کے منہ سے یہی نکلتا
تھا۔ کہ افسوس میں اُن جہازوں پر سوار کیوں
نہ ہوا۔ اور سب سے بڑھ کر میں خود اپنی
ناکامی کی شکایت بڑے جوش سے دن میں کئی
کئی مرتبہ کیا کرتا تھا۔ جب جہاز کے اور مسافروں
کو یہ معلوم ہوا کہ مجھے سفیر صاحب کے ساتھ
جانا تھا۔ مگر وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے اُن
کے ساتھ سوار نہ ہو سکا تو بعضے تو افسوس کرنے
لگے۔ مگر اکثر نے میری نسبت کہا کہ یہ اسی لائق
تھا اور یہ اس کی غفلت کی سزا ہے۔ آخرکار
ہمارا جہاز جزیرہ فورتھ میں ہندوستان اور غفنفر
سے جا ملا۔ اور میں خوشی خوشی اپنے دوستوں
کے پاس غفنفر میں جا بیٹھا ۔

جب میں نے اُن سے راستے کے اُن مقامات
کے عجیب و غریب حالات سنے جہاں جہاں وہ
ٹھیرتے آتے تھے تو مجھے از حد رنج ہوا۔ میں
اُن کے ساتھ ہوتا تو اپنی کتاب کے لئے خوب
مصالحہ تیار کرتا۔ خیر اب تو جو کچھ ہوا سو ہوا
آئندہ کے لئے میں نے مصمم عہد کیا کہ مملکت
چین کے حالات وہاں کی پیداوار اور اور
عجائبات دریافت کرنے میں ذرا بھی فرو گذاشت
نہ کروں گا۔ اور یہ سبب اور میری کتاب کو پورا

کرنے کے لئے کافی ہوں گے ۞

میں خیال کرتا تھا - کہ میری کتاب نہایت
دلچسپ اور سود مند ہوگی - بلکہ میں اُن تعریفوں
کا بھی دل ہی دل میں اندازہ کرنے لگا - جو اہل
کتاب کو دیکھ کر میرے دوست کریں گے - اور اس
خیال سے تو میں بہت ہی خوش ہوا کہ میرے
والد اپنے بیٹے کی یہ شہرت و ناموری دیکھ کر کیسے
باغ باغ ہوں گے - ایسے ہی خیالی پلاؤ پکاتا ہوا
مقام سُو تک جو قلمرو چین میں واقع ہے - جا پہنچا -
یہاں بڑی رات تک میں کتاب کا دیباچہ اور مضمونوں
کی شرح خیال لکھتا رہا - اور آخرکار تھک کر سو رہا
صبح کو آنکھ اس وقت کھلی - جب جہاز کی روانگی
کے گھڑیال بج رہے تھے - میں جھٹ پٹ
کپڑے پہن سوار ہو گیا - کوئی چار ہی کوس گئے
ہوں گے کہ مجھے اس تعجیل سے جہاز میں سوار ہونے
پر سخت پشیمانی ہوئی - کیونکہ سرحد چین میں داخل ہو
جانے سے مجھے نوٹ کرنے کے لئے نوٹ بک کی
ضرورت پڑی - واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو
نہ نوٹ بک ہے نہ پنسل - یاد آیا کہ حضرت وہی دونوں
چیزیں نہیں - بلکہ ساری نوٹ بکیں - کتابیں - غرض
سب کچھ وہیں سرائے میں رکھا رہ گیا - ایسا اس وقت
رنج ہوا کہ بیان سے باہر ہے - بازار میں کاغذ پنسل
سب کچھ مل سکتا تھا - اگر کفایت کا جی کی عادت

نہ ہوتی تو اور پاکٹ بک بنا لیتا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر آج کل آج کل کرتا ہی رہا اور کچھ نہ کیا۔ کاغذ کے پرزوں پر بڑے ضروری نوٹ لکھتا رہا۔ اور یہ ارادہ کرتا رہا کہ کل نوٹ بک بنا کر اس میں درج کر لوں گا۔ نہ کبھی وہ کل آئی نہ نوٹ بک بنی۔ یونہی یادداشتوں کے پرزے جمع ہوتے رہے۔

جب شہر پیکن میں پہنچے تو ہمیں سکونت کے لئے ایک عالی شان محل ملا۔ مگر ہمیں اتنی اجازت نہ تھی کہ اس محل سے نکل کر اِدھر اُدھر چل پھر سکیں اس وجہ سے مجھے اس قدر فرصت تھی کہ میں چاہتا تو اپنی یادداشت کے پرزوں کو کتاب میں آسانی سے نقل کر لیتا۔ لیکن یہاں بھی مجھے اُسی ستیاناسی وحشت نے کچھ کرنے نہ دیا۔ یہی خیال کرتا رہا کہ ان یادداشتوں کا نقل کرنا چند گھنٹوں کا کام ہے۔ ایسی جلدی کیا پڑی ہے جس روز چاہوں گا کر لوں گا۔ گرمی کی وہ شدت تھی کہ پہلے ایک دو ہفتے میں اپنی واسکٹ کے بٹن بار بار کھولتا اور شربت پیتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کے رئیسوں سے ملاقاتیں کرنے میں بھی بہت سا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ چین کے امیر کبیر جو ملاقات کرنے آتے تھے وہ معمولی باتیں کرنے کے سوا اور کچھ نہ کہتے سنتے تھے۔ یا تو مارے گرمی کے پنکھا جھلتے رہتے تھے یا چائے پیتے مٹھائیاں کھاتے اور پان چباتے۔ ایک دن صبح کو میری

ملاقات کے لیے ایک ایسی وضع کا امیر آیا جو چینیوں
کی سی شکل و شباہت کا نہ تھا۔ دریافت کرنے سے
معلوم ہوا۔ کہ وہ شخص فرانسیسی ہے جو مدت ہوئی
کہ پیرس سے پادریوں کے ہمراہ یہاں آیا تھا اور یہیں
پڑا رہا اور رفتہ رفتہ اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ گیا۔ اِس
امیر نے مجھ سے فرانسیسی زبان میں گفتگو کی۔ اور اس
کے ذریعے سے مجھے اِس طرف کے وہ حالات معلوم
ہو گئے جو میری کتاب کے لیے از بس کار آمد تھے یہ شخص
میرے پاس اکثر آتا اور گھنٹوں بیٹھا کرتا تھا۔ اور وہاں
کے باشندوں کی طرز معاشرت۔ عادات اور رسوم کی
نسبت وہ وہ باتیں سناتا کہ میں دل سے اس کا گرویدہ
ہو گیا اور سمجھا کہ میری کتاب اس کی بدولت ایسی
لاجواب بنے گی کہ پڑھنے والے عش عش کریں گے
اور میرا بڑا نام ہوگا ؎

القصہ ایک دن ہمیں خبر ملی۔ کہ شہنشاہ کا ارادہ
ہے کہ مقام جہول میں جو تاتار میں شاہی فرودگاہ
ہے۔ ہم سے ملاقات کریں۔ میرا فرانسیسی دوست بھی
شہنشاہ سے اجازت حاصل کر کے ہمارے ہمراہ چلا
اور اس بات سے مجھے بڑی خوشی حاصل ہوئی اور مجھے
پختہ یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ چلنے سے ملک کے
صحیح صحیح حالات معلوم ہوں گے جو اور سیاحوں کو نصیب
نہیں ہوتے۔ اکثر سیاح عدم واقفیت کے باعث اپنے
بیانوں میں سخت غلطیاں کرتے ہیں۔ لیکن اتفاق حسنہ

مجھ کو ہوا ہے - ایسا کسی سیاح کو نصیب نہیں ہوا ۔

وہاں پہنچ کر ملاقات کی تیاری میں ایسی جلدی کرنی پڑی کہ میں اپنی کتاب شروع نہ کر سکا اور نہ کاہلی کے سبب راستے میں اپنے دوست کی باتوں کی یادداشتیں لکھیں۔ ایک دن میں یادداشتوں کے پرچے سنبھالنے لگا - جن سے میری تمام جیب اٹی ہوئی تھی - ان کا تو ایک ڈھیر لگ گیا اور گڈمڈ کاغذوں کا ایک طومار بن گیا -- جسے دیکھ کر میں بہت گھبرایا اور ارادہ کیا کہ کل میں ان کو ترتیب کر کے بیچنے کے اندر چپکا لوں گا - دوسرے دن ذرا بھی فرصت نہ ملی تحائف جو انگلستان سے فغفورِ چین کی خدمت میں پیش کرنے کو لائے تھے - ان کو صندوقوں میں سے نکال کر ترتیب وار لگانے اور سجانے ہی میں سارا دن گذر گیا - اس سے اگلے دن تحفے پیش کئے گئے - تیسرے دن ایک ایسی نئی بات ہوئی جس کی وجہ سے یادداشتوں کے پرزوں کو ہاتھ لگانے کی سر دست ضرورت نہ رہی - شہنشاہ نے علاوہ اور بیش بہا چیزوں کے ایک صندوقچہ اپنے دستِ خاص سے بڑی متانت کے ساتھ یہ کہکر دیا - کہ ہمارے پاس اس سے بڑھ کر شاہِ انگلستان کے واسطے اور کوئی تحفہ نہیں - اس صندوقچہ میں شاہنشاہ کے بندگوں کی تصویریں تھیں - اور ہر ایک تصویر کے ساتھ چند شعر منسلک تھے - جن میں ان کی زندگی کے

مشہور واقعات کا بیان تھا۔ اس پر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ہماری طرف سے بھی اسی طرح کی شاہان انگلستان کی تصویریں اور شعر نذر گذرانے جائیں تو کیا ہی عمدہ بات ہو اور شاہنشاہ اس سے بہت خوش ہوں۔ میں نے اس امر میں اپنے فرانسیسی دوست سے مشورہ کیا۔ اس نے میری رائے کو پسند کیا۔ اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ اور کہا جب یہ کام تیار ہو جائے گا تو میں خود اسے شاہنشاہ کی خدمت میں پیش کرونگا۔ الغرض میں نے کام شروع کر دیا۔ ولایت سے آتے ہوئے میں اپنے ہمراہ شاہی خاندان کا مرقع لیتا آیا تھا۔ اب اس پر سے نقل اتارنی کچھ مشکل بات نہ تھی اور شعر میں ایسی آسانی سے کہہ لیتا تھا کہ میرے ہمراہی حیران رہ جاتے تھے اور میری لیاقت کی داد دیتے تھے۔

میرا قاعدہ تھا کہ محل کی ایک جانب ایک صحنچی میں اکیلا بیٹھ کر اپنا کام کیا کرتا تھا۔ کیونکہ یہ بڑی خلوت کی جگہ تھی۔ اور کسی طرح کا شور و غل آس پاس نہ ہوتا تھا۔ ایک دن رات کے وقت ایسا اتفاق ہوا کہ ہر چند فکر کیا۔ مگر جو مضمون شعر میں باندھنا چاہتا تھا وہ نہ بندھا۔ ناچار میں ایک مصنوعی ٹیلے پر جو صحن میں بنا ہوا تھا جا بیٹھا اور ہاتھ پر سر ٹیک کر سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔ یکایک ایسی آواز ہوئی جیسے بجلی

کڑکتی ہے۔ میں دہل کر غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا۔ تو کیا دیکھتا ہوں کہ صحن آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور سب لالٹینیں اور مشعلیں ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں اور آپس میں پوچھ رہے ہیں۔ کہ یہ کیا ہوا ہے؟ زمین پر لکڑی ستونوں کے ٹکڑے۔ چٹائیں اور چونا وغیرہ بکھرا پڑا ہے اور جہاں میں بیٹھا کرتا تھا وہ جگہ پاش پاش ہو گئی ہے۔ اور بارود کی تیز بو آ رہی ہے اس وقت مجھے یاد آیا۔ کہ صبح کو میں نے کچھ بارود ایک سپاہی سے لی تھی اور ارادہ تھا کہ اپنا پستول جا کر باقی اٹھا رکھوں گا۔ مگر سارا دن بارود اور پستول میری میز پہ دھرا رہا۔ سہل انگاری سے نہ میں نے پستول ہی بھرا اور نہ بارود ہی کسی محفوظ جگہ رکھی۔ رات کو جب میں ٹہلنے صحن میں گیا تھا تو میز پہ شمع جلتی چھوڑ گیا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ شمع کا گل بارود میں پڑ گیا ہو گا۔ جس سے مکان اڑ گیا۔ اس حادثے نے صرف اس محل کے رہنے والوں کو ہی نہیں بلکہ قرب و جوار کے لوگوں کو بھی خوف زدہ کر دیا۔ کیونکہ یہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اتفاقیہ معاملہ ہے اور کچھ اندیشہ کی بات نہیں۔ جب میرے ہمراہیوں کو اصل حقیقت معلوم ہوئی تو سب نے مجھ پر لعنت پھٹکار کی بوچھاڑ کر دی اور میں ندامت کے مارے

غرق ہو گیا۔ مجھے اتنی فرصت بھی نہ ملی۔ کہ میں اپنی شاہی تصویروں کے جل جانے کا افسوس کرتا۔ جن کا نشان تک باقی نہ رہا تھا۔ میری ساری محنت اور جانفشانی جو شہر کھنے میں ہوئی تھی رائگان گئی اور میری ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ میں نے جو مصیبت اپنے ہاتھوں اپنے آپ اور ہمراہیوں کے اوپر نازل کی تھی۔ اس سبب سے میرے اس رنج و الم میں نہ کوئی میرا شریک تھا نہ کوئی غمگسار۔ بلکہ سب مجھ سے کبیدہ خاطر رہتے تھے اور شاہنشاہ کو اس کی اطلاع ہونے پر جو بد نتائج پیدا ہونے کا خوف تھا۔ اس کے سبب سب میرے شاکی تھے۔ کیونکہ چینی لوگ اول درجے کے شکی ہوتے ہیں۔ نہیں معلوم اس اتفاقیہ حادثے سے کیا کیا نتائج نکالیں۔

میرے فرانسیسی دوست کو بھی اس واقعے کا بڑا افسوس ہوا اور وہ کہنے لگا کہ میں یہی شاہنشاہ کی خدمت میں عرض کرونگا کہ اس شدنی بات میں کسی کا قصور نہ تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ میرے دوست کی سفارش کارگر نہ ہوئی۔ اور تھوڑے دن بعد حکم ہوا کہ سفارت واپس کوچ کر جائے۔ اب تو سب لوگ مجھے سبز قدم سمجھنے لگے۔ اور سب کا یہی خیال تھا کہ سفارت سے ایسے وقت واپس جانے کے باعث

میں سب سے بڑھ کر وہی حادثہ ہے جو میری سستی کے کارن وقوع میں آیا۔۔ اس وقت میرے رنج کی کچھ انتہا نہ تھی۔ اور میں نہایت ہی پشیمان تھا۔ اِس پشیمانی نے مجھے رہا سہا نکما کر دیا پیکن سے کانٹن آنے تک جو عرصہ گزرا وہ سب رنج و غم ہی میں گزرا اور کوئی یادداشت تک نوٹ نہ کی گئی۔ کانٹن میں جا کر میرا سارا وقت دوستوں کے لیے سوغاتیں خریدنے میں صرف ہوا کیونکہ یہ سب سوغاتیں پیکن ہی میں خریدی جاتی تھیں مگر میں نے یہ سمجھ کر نہیں خریدیں کہ سارا جاڑے کا موسم وہیں گزارنا تھا۔ جلدی کیا ہے خرید لوں گا غرضیکہ اسباب کے صندوق جہاز پر چڑھا دیئے گئے۔ مگر میری سوغاتیں ابھی ادھوری ہی رہیں۔ آخر لاچار ہو کر میں نے اپنے سارے کھلونے اور اسباب ایک ٹوکرے میں بھرے یادداشتوں کے پرچے ابھی تک اسی تھیلے میں تھے جس میں میں نے انہیں شہر ہیول میں ٹھونسا تھا مجھے یقین تھا کہ راستے میں ان کو ترتیب وار کر کے کتاب میں درج کرنے کی فرصت مل جائے گی۔

جب جہاز میں سوار ہوئے تو چند روز تک تو میں بیمار رہا۔ پھر یہ حال رہا کہ جب موسم صاف ہوتا تو مچھلی کے شکار سے دل بہلاتا

اور جب موسم خراب ہوتا تو سستی میں گزار دیتا۔
جہاز میں کھانا۔ پینا۔ گانا۔ ناچنا۔ ہنسی۔ ٹھٹھا
اِن مشغلوں سے رہتا تھا۔ کہ باوجود یکہ میں نے
کوئی سو ہی مرتبہ کاغذوں کا تھیلا نکالا۔ لیکن ذرا
بھی کام نہ کر سکا۔ ایک دن سرکاری کمرہ بالکل
خالی تھا۔ اور میں نے کام بھی شروع کر دیا تھا۔
کہ جمعدار نے مجھ سے آکر کہا کہ آپ کی سوغاتوں
کا ٹوکرا جو جہاز کے کنارے پر دھرا تھا بہہ گیا
میں سنتے ہی بھاگا ہوا گیا اور کھلونے وغیرہ
سمندر میں بہتے ہوئے دیکھ کر نہایت افسوس
کرتا رہا۔ ایک دو دفعہ مجھ سے کہا گیا تھا۔
کہ اپنا سوغات کا ٹوکرا یہاں سے اُٹھا لو ورنہ
کسی روز سمندر میں جا پڑے گا۔ مگر میں اِس
کے اُٹھانے میں تساہل کرتا رہا۔ قصہ کوتاہ
سارا سفر طے ہو گیا اور ہم انگلستان آ پہنچے۔
مگر یادداشت کے پرچے اسی طرح تھیلے میں بند
دھرے رہے۔ اب میں نے دل میں عہد کیا
کہ گھر پہنچ کر پہلا کام اِن کاغذوں کو ٹھیک کرنے
کا ہی کروں گا۔ لیکن جب گھر میں آیا تو یار دوست
خویش و اقارب سے ملنے جلنے میں ہی ایک ہفتہ تو
گزر گیا۔ پھر احباب نے چین کے حالات سننے کے
لئے میری دعوتیں کرنی شروع کیں۔ دوسرا ہفتہ اِن
میں گزرا۔ میں نے دوستوں کی دعوتیں رد کر کے

کتاب لکھنے کے لیے تنہا بیٹھنا پسند نہ کیا۔ ہرچند میرے والد تاکید کرتے تھے کہ کتاب جلدی نکالو کیونکہ انہوں نے سنا تھا کہ سفارت کے ہمراہ جو لوگ گئے تھے اُن میں سے کئی شریف آدمی اِسی قسم کی کتاب لکھنے کا قصد کر رہے تھے۔ مگر میں اِسی میں وقت ٹالتا رہا کہ کل لکھنا شروع کروں گا۔ آخرالامر جب چند ہفتے سے زیادہ عرصہ مجھے گھر آئے گزرا۔ تو اخباروں میں اس مضمون کا ایک اِشتہار نکلا کہ ایک کتاب عنقریب ایسی شائع ہونے والی ہے کہ جس میں اس سفارت کے مفصل حالات ہوں گے۔ جو سرکار انگریزی کی طرف سے چین کے ملک میں گئی تھی اور اُس کے ضمن میں چین کے باشندوں کی طرزِ معاشرت۔ عادات و اطوار اور رسم و رواج کا بیان بھی ہوگا ؂

یہ اشتہار پڑھ کر میرے والد کا رنگ فق ہو گیا۔ اُنھوں نے وہ اخبار میرے ہاتھ میں دیا اور کہا میں نہ کہتا تھا۔ کہ اِس التوا کا کیا نتیجہ ہوگا۔ تم ساری عمر اِسی طرح کرتے رہے ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ مرتے دم تک تم اپنے کاموں کو کل پر ہی ٹالتے رہو گے۔ اسی طرح تم اپنے سارے ترقی و بہبود کے منصوبے برباد کرتے رہے ہو۔ بتاؤ تمہارا فہم و ذکا اور ذہنِ رسا کس کام کا ہے۔ دیکھو وہ مسٹر جانسن جسے تم بھدا اور سست کہا کرتے تھے۔ اِسی

محنت اور استقلالِ طبیعت کے طفیل کس عروج
پر پہنچ گیا ہے ۔

جب میرے والد کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا۔ تو
میں نے یہ سمجھایا کہ یہ کتاب کس کام کی ہوگی اور
اس کتاب کو جو میں لکھونگا۔ کب پہنچ سکتی ہے
مجھے وہ وسائل بہم پہنچے اور وہ وہ مصالحے ہاتھ
آئے ہیں۔ جو کسی اور شخص کو میسر ہونے ممکن
نہیں۔ پھر والد صاحب خفگی سے بولے۔ بھاڑ میں
گئے تمہارے وسائل اور چولھے میں گئے تمہارے
مصالحے۔ تم تو اپنی کاہلی کے کارن آج کل آج کل
ہی کرتے رہو گے اور کبھی اپنی کتاب تیار نہ
کر سکو گے۔ بالفرض اگر تمہیں کتاب ختم کرنی نصیب
بھی ہوئی تو اتنے عرصے کے بعد تمہارے باسی
مضمونوں کے پڑھنے کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا
پھر اگر تم چاہو تو یہ آخری موقع ہے۔ اپنی بگڑی
بات کو بنا لو۔ ورنہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں تمام
عمر تم سے ناراض رہوں گا ۔

اس پر میں نے اپنے والد سے عہد کیا کہ کل
ضرور کام شروع کر دوں گا۔ اور اُن کی تشفی کی۔ کہ
میری کتاب نہایت عمدہ۔ معتبر اور دلکش ہونے کی وجہ
سے اس کتاب سے بدرجہا بڑھ کر قابلِ قدر ہوگی۔
بارے میری ان باتوں سے والد کی کسی قدر تسلی ہوئی
اور چونکہ میں بھی پختہ ارادہ کر چکا تھا۔ یہاں سے

فراغت پاتے ہی میں نے یادداشتوں کا تھیلا کھولا
مگر افسوس پرچے بڑی ردی حالت میں پائے۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے جہاز میں کاغذوں کے
تھیلے تک سمندر کا پانی پہنچ گیا تھا اور اس سے
نہایت اچھے اچھے حالات کے اکثر پرچے خراب
ہو گئے تھے کہ پڑھے نہ جاتے تھے پنسل کے
لکھے ہوئے تو بیٹ مٹا کر صاف ہو گئے تھے۔
سیاہی کے لکھے ہوئے بمشکل کہیں کہیں سے پڑھے
جاتے تھے۔ اکثر خیالات جن کی نسبت امید تھی کہ
کبھی فراموش نہ ہوں گے اور اسی لئے بہت مختصر صورت
میں لکھ لئے گئے تھے۔ اب وہ تمام و کمال ذہن سے
اتر گئے۔ حیران تھا کہ کیا کروں۔ الغرض سارے مصالحے
میں سے صرف تھوڑا سا ہی میرے مطلب کا باقی رہ
گیا تھا۔ مگر یہ بات میرے خیال میں آئی۔ کہ اس
کمی کو اپنی رنگینیٔ طبع اور بلند خیالوں سے ایسا مزیدار
بنا دوں گا۔ کہ لوگ دیکھیں گے۔ پھر یہ خیال میں آیا
کہ لنڈن میں طبیعت کو یکسوئی ہونی مشکل ہے کہیں
باہر جا کر اس کام کو سر انجام دیجئے اور اس کتاب
کو بڑی غور سے لکھیے۔ اور اس پر کافی وقت صرف کیجئے
چنانچہ میں اپنے چچا کے گھر کی طرف جو ایک گاؤں میں
تھا روانہ ہو گیا۔ میں نے چین سے واپس آ کر ہر چند
چاہا۔ کہ اپنے چچا کو ایک خط لکھ بھیجوں۔ لیکن آج
کل کرتے کرتے خود اس طرف روانہ ہونے کا دن

آ گیا - میں نے خیال کیا کہ اب خط بھیجنے سے کیا فائدہ - اس کے پہنچتے پہنچتے تو میں خود ہی پہنچ جاؤں گا - مگر اس غفلت کا مجھے خوب خمیازہ اٹھانا پڑا۔ جب میں چچا کے ہاں پہنچا تو بجائے اس کے کہ اتنی مدت بعد ملنے سے وہاں سب کو خوشی ہوتی مجھ کو دیکھ کر سارا گھر حیران ہو گیا۔ وجہ یہ ہوئی کہ اُن کے گھر میں پہلے ہی مہمان اترے ہوئے تھے - اور کوئی بستر خالی نہ تھا - جب میں بوٹ اتار رہا تھا۔ تو میں نے اپنے کانوں سے سنا کہ میری چچی کہہ رہی تھیں کہ یہ ہم کو پیشتر سے اطلاع دئے بغیر کیوں آ گیا ہے ؟ اب میں کیا کروں - بستر کہاں سے لاؤں کیا اچھا ہوتا - جو یہ لڑکا آج یہاں سے سو کوس پرے ہوتا "۔

میرے چچا نے مجھ سے مصافحہ کیا اور خیر و عافیت پوچھی - مگر میں تاڑ گیا کہ وہ بھی میرے اس طرح آ جانے سے ناراض ہیں وہ بڑے صاف دل و صاف گو آدمی تھے - دل میں کچھ نہ رکھتے تھے انہوں نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ میں تم سے بہت ناخوش ہوں اور وجہ یہ بیان کی کہ باوجود بار بار تاکید کرنے کے تم نے مجھ کو نہ تو خود ہی خط لکھا اور نہ میرے خطوں کا جواب دیا - شاید تم غریبوں کے ساتھ خط وکتابت کرتے تم کو عار آتی ہے - میں نے کہا میں سچ کہتا ہوں کہ خط نہ لکھنے کا باعث میری کاہلی کے سوا

ادھر کچھ نہ تھا - میری چچی بولیں کہ باتیں جیسا لکھا
پڑھا آدمی خدا جانے خط کے جواب لکھنے میں کیا
تکلف سمجھتا ہے - علی الخصوص اس کے چچا نے جو
اس کو بہت ہی چاہتے تھے بار بار خیر و عافیت جاننے
کے لئے چٹھیاں لکھیں - اس پر میرے چچا نے کہا -
بے شک میں اس کو بہت چاہتا تھا اور جو کچھ مجھ سے
ہو سکا - میں نے اس کے واسطے کیا - مگر اب تو میرا
جیتے جی اس کو کبھی خط نہ لکھوں گا - میں خوب
سمجھتا ہوں کہ یہ لڑکا ذرا بھی میری پروا نہیں کرتا
اور نہ اب اس کی کچھ پروا میں کرتا ہوں - سارے
گھر والوں میں سے صرف میرے چچا کی بیٹی لوسی
مجھ سے تپاک کے ساتھ ملی - اور اس جھگڑے میں
اس نے میرے ساتھ ہمدردی کی - الغرض بہت ہی
بدمزگی ہوئی - علی الصباح ابھی میں بیدار بھی نہیں
ہوا تھا - کہ بچے میرے پاس آئے - اور لگے اپنی
سوغاتیں مانگنے - کوئی بولا - بھائی میری بندوق کہاں
کدھر ہے - کسی نے کہا لاؤ میری کشتی - کوئی کہنے لگا
میری سرخ ساڑھی بھی لائے ؟ ادھر میں مارے
شرم کے پانی پانی ہوئے جاتا تھا - جب میں نے
سوغاتوں کا ٹوکرا سمندر میں بہہ جانے کا حال
سنایا تو میری چچی نے کہا کہ ٹوکرے میں کھلونے
اور سوغاتیں کیوں نہ رکھی تھیں ؟ کیا صندوقوں
میں جگہ نہ تھی ؟ غرض میری کاہلی اور غفلت پر

چاروں طرف سے ایسی نفرین ہوئی کہ میں سخت پریشان ہو کر وہاں سے دل برداشتہ ہو گیا - میرے والد کی طرف سے خطوں پر خط چلے آتے تھے - کہ کتاب کہاں تک پہنچی - کب ختم ہوگی ؟ جلدی کرو کہ ایک اور کتاب "واقعات سفارت چین" نکلنے والی ہے - ادھر میں مارے رنج کے کبیدہ خاطر اور اُداس ہو رہا تھا - کتاب کا ایک حرف نہ لکھ سکا - کہ اتنے میں جس کتاب کا ڈر تھا وہ شائع ہو گئی اور میری ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں ۔

غرض اسی طرح میں اپنی سستی اور غفلت شعاری کے ہاتھ سے تمام عمر خراب و خستہ رہا - اور اگرچہ مجھے اپنی اور بڑی بڑی مایوسیوں اور ناکامیوں کا تذکرہ لکھنا ابھی باقی ہے - مگر میں ذرا کم بخت عادت سے مجبور ہوں - اور آج اپنی سرگزشت کو یہیں چھوڑتا ہوں - آگے کل لکھوں گا ۔

پُراسرار مشرق

سر شیخ عبدالقادر

انگریزی میں اور دیگر یورپین زبانوں میں مشرقی ممالک کے متعلق مختلف فقرے ایسے موجود ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مشرقی دنیا پُراسرار ہے اور اہلِ مغرب کے لئے اس کی اصلی حالت جان لینا یا اس کے اندرونی راز دریافت کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اور یہ خیال یہاں تک عام ہوا ہے کہ کتابوں اور رسالوں میں جہاں کہیں لفظ "مشرق" آتا ہے وہاں اس کے ساتھ پر اسرار کی صفت لازم و ملزوم ہو گئی ہے۔ اور انتہا یہ ہے کہ مغرب سے جو سیاح آتے ہیں اور اپنے سفر کے حالات لکھتے ہیں انہیں ہر مشرقی انسان اسرار کا مجموعہ نظر آتا ہے چنانچہ کچھ عرصہ ہوا۔ فرانس کے ایک نامور مصنف نے ایک کتاب لکھی جس کے فرانسیسی نام کا ترجمہ "الہند بغیر الانگلیس" ہے۔ یعنی ہندوستان کا وہ حصہ جو انگریزوں سے خالی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے ہندوستان کی بعض دیسی ریاستوں کی سیر کی ہے۔ اور ان کے

حالات لکھے ہیں - مگر جس شخص کا بیان دیکھو - پُراسرار پیشانی - قوّال اور اس کی پُراسرار آنکھیں کنوئیں پر پانی بھرنے والی جوان لڑکی اور اس کی پُراسرار آبرو - بیچارے فرانسیسی کے لیئے دکن کیا ہوا - ایک طلسم خانہ بن گیا - یہی حال کم و بیش ہر یورپین سیّاح کا ہے - اُنھوں نے بچپن سے بلادِ شرق کے ایک ایسے افسانے سُن رکھے ہیں اور تصوّر نے اُن کے ذہن میں شرق کا ایک عجیب نقشہ کھینچ رکھا ہے کہ جب وہ ہمارے ملکوں میں آتے ہیں تو ہمیں اپنا خیالی چشمہ لگا کر دیکھتے ہیں اور جو کچھ اِس خیالی عینک سے نظر آتا ہے اِسی کو حقیقت سمجھتے ہیں - اسی لیئے ہمارے اور اُن کے درمیان ایک پردہ حائل ہو گیا ہے جس کا اُٹھنا تقریباً محال نظر آتا ہے اور اسی پردے کی بدولت دونوں طرف یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ "شرق شرق ہے اور غرب غرب اور دونوں کبھی نہیں ملیں گے" - اب دیکھنا یہ ہے - کہ آیا واقعی ہم اور ہمارے مُلک پُراسرار ہیں؟ اور ایسے معمّے ہیں کہ یورپ والے سمجھ نہ سکیں؟ یا ہم معمولی اِنسانوں کے سے انسان ہیں - اور ہمارے مُلک دوسرے ملکوں کے سے مُلک - میرے خیال میں اِس سوال کا جواب صرف ایک ہو سکتا ہے - اور وہ یہ ہے - کہ نہ ہم پُراسرار ہیں اور نہ ہمارے مُلک - بلکہ یہ صرف اِس خیالی عینک کا اثر ہے - جو سیاحانِ یورپ لگا

لگا کر آتے ہیں کہ ہم اُنھیں ایسے نظر آئیں ؟

ہماری زندگی کا فقط ایک حصّہ ایسا ہے جسے وہ جائز طور پر کہہ سکتے ہیں کہ پُراسرار ہے اور وہ بھی صرف اس لئے کہ اِس پر ایک پردہ واقعی پڑا ہوا ہے یعنی ہمارے گھروں کی حالت۔ مجھ سے ایک انگریز نے جو عرصۂ دراز تک ہندوستان میں رہ کر انگلستان واپس گیا۔ یہ کہا کہ اتنی مدت تمہارے ملک میں رہا ہوں میں نے تمہاری کئی زبانیں سیکھیں اور مشرقی علوم سے خاصی واقفیت پیدا کی۔ اس پر ہندوستانی شرفا کی وہ زندگی جو گھروں کے اندر بسر ہوتی ہے۔ میرے لئے ایک سربمہر کتاب رہی ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی ایسے ناول لکھیں۔ جن سے زنانہ طرز بود و باش کا کچھ حال ہم اجنبیوں کو بھی معلوم ہو میں نے انھیں جواب دیا کہ اب کئی لوگ ایسے ناول لکھنے لگے ہیں جن سے ہماری اندرونی زندگی آپ لوگوں کو کسی قدر معلوم ہو جائے۔ اور آپ کا یہ مدعا جلد پورا ہونے والا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ رسم و رواج کے تھوڑے سے اختلاف کو چھوڑ کر کسی ہندوستانی شریف بی بی کی زندگی معمولی انگریز بی بی کی روزمرہ زندگی سے بہت جدا نہیں ہے۔ وہ صبح اُٹھتے ہی گھر کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو کر صبح کے کھانے کی فکر میں لگتی ہے۔ اگر گھر میں نادمہ ہوئی تو اس سے کام لیتی ہے۔ ورنہ خود سب اہتمام

کہتی ہے - کھانا تیار ہوا اور کھانا کھا کر میاں اپنے
کام کاج کو اور بچے اپنے مدرسے کو جا لئے تو ذرا
سستاتی ہے اور سینا پرونا لے بیٹھتی ہے یا اگر اسے
پڑھنے کا شوق ہے تو کتاب پڑھتی ہے - دوپہر ڈھلتے
ہی شام کے کھانے کی تیاری شروع ہوتی ہے - اور
اسی طرح کم و بیش تغیر کے ساتھ روز کا معمول ہے

؎ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اپنے عزیزوں دوستوں میں سے کچھ عورتیں ملنے
آگئیں یا یہ کسی سے ملنے چلی گئیں - تو اس سیدھے
سادے روزمرہ میں کچھ دلچسپی پیدا ہو گئی - کسی شادی
بیاہ کی تقریب میں شامل ہوگئی یا خود اپنے ہاں
کوئی شادی رچی تو ذرا اور دل لگی اور چہل پہل کا سامان
ہو گیا - جہاں تک میرا خیال ہے دنیا بھر میں اکثر عورتوں
کی اسی قسم کی زندگی ہے - خواہ وہ یورپ میں پردے
سے باہر رہتی ہوں - یا ایشیا میں پردے کے اندر - آپ
کو زیادہ رازجوئی صرف پردے کی وجہ سے ہوتی ہے
کیونکہ یہ خیال آتا ہے کہ خدا جانے پس پردہ کیا ہے
اور کیا نہیں - مگر اس اتنی سی آڑ کی وجہ سے یہ فرض
کر لینا کہ پردے کے پیچھے ضرور بڑے بڑے اسرار
ہیں - صحیح نہیں - اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سارے
مشرق کو پُر اسرار کہہ دیا جائے - کتنی قومیں ہیں جو
مشرق میں آباد ہیں - لیکن پردے کی رسم سے بالکل

آشنا نہیں - مثلاً چینی - جاپانی - برہمی وغیرہ ان کی زندگی
کیا مردوں کی کیا عورتوں کی تمام اغیار و اجانب کے پیشِ
نظر ہے اور اس میں نہ کوئی اسرار ہے نہ کوئی معمہ۔
اس کے علاوہ ہمارے ملک ہندوستان میں بیشتر
حصہ آبادی کا یا تو پردے سے بالکل بے تعلق ہے یا
صرف برائے نام تعلق رکھتا ہے - مسلمان بھی جن میں
پردہ مروج ہے - سارے کے سارے پردہ دار نہیں -
اور غریب لوگ جنھیں محنت مزدوری سے روزی
کمانی پڑتی ہے - مجبور ہیں کہ وہ عورتوں کو بھی
محنت میں شریک کریں اور ان کی عورتیں اکثر بے
پردہ اقوام کی طرح گلی کوچوں میں آزادانہ پھرتی
ہیں - پس جو کوئی نظرِ غور سے ہندوستان کی حالت
کو دیکھے - وہ اسے صرف اس بنا پر کہ اس میں
فی صدی چند لوگ ایسے ہیں جو پردے کے پابند
ہیں - پُر اسرار نہیں کہہ سکتا - پردے کا بھید
اگر ہم اسے بھید کہہ سکیں اپنے اثر میں
بہت محدود ہے - اور اگر کبھی بھید کھل بھی
گیا - (جیسا کہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ
شاید کھل جائے) تو ہم ان حضرات کو جن
کی نگاہیں پسِ پردہ بڑے بڑے اسرار دیکھنے
کی منتظر ہیں - بہت وثوق سے یہ بتانا چاہتے
ہیں کہ تمھیں نہایت مایوسی کا سامنا ہوگا - اور کوئی
ایسی نئی یا اچنبھے کی باتیں انھیں معلوم نہ ہوں گی -

جیسی کہ وہ اپنے خیال میں اس وقت تصوّر کئے ہوئے ہیں۔ فطرتِ انسانی تمام عالم میں ایک ہے۔ ضروریات انسانی بھی ایک معقول حد تک ہر جگہ وہی ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ انسان دوسرے انسان کو اچھی طرح سمجھنے میں قاصر رہے۔ صرف اِس لئے کہ ایک مشرق میں بستا ہے اور دوسرا مغرب میں۔ یا ایک کا رنگ گورا ہوتا ہے ایک کا سانولا۔ محض کوشش کی کمی اور ہمت کا نقص ہے۔ کہ ہم کہہ دیتے ہیں کہ انگریز لوگ عجیب ہیں۔ اور ہم اِن کے اصلی حالات اور خیالات سے کبھی واقف نہیں ہو سکتے۔ خواہ اِن سے کتنا ہی ملیں جلیں اور اِدھر انگریز یہ کہدیتے ہیں کہ ایشائی لوگوں سے خواہ ساری عمر سابقہ رہے اِن کی تہ کو پہنچنا دشوار ہے۔ اور اِن کے دِلی جذبات سے کسی اہلِ یورپ کا ٹھیک ٹھیک آگاہ ہونا ناممکن ہے۔ حالانکہ اِس منافرت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو انگریزوں نے اپنی آسائش اور سیاسی مصلحت کے لحاظ سے ہر مقام پر اپنے گھر شہر کی آبادی سے دُور بنائے ہیں۔ اور دوسری طرف ہندوستانی اپنے غریبانہ گھروں میں حوادث کے ڈر سے مُنہ چھپائے پڑے ہیں۔ اور کچھ گھر گھسنے پن کی عادت سے اور کچھ افلاس اور بے بضاعتی کے سبب باہر کی دُنیا سے الگ تھلگ ہیں۔

یورپ کے سیاح جو چند روز کے لئے آتے ہیں ان کی فرودگاہ وہ ہوٹل ہوتے ہیں جو یورپین آبادی کے قریب واقع ہیں۔ اور انھیں بہ سبب زبان کی عدم واقفیت کے اور اچھے ترجمانوں کے نہ ملنے کے کسی معقول ایشائی سے بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ وہ زیادہ نہ بڑی بڑی عمارتوں اور پُرانے تاریخی کھنڈروں کو دیکھ کر چلے جاتے ہیں۔ کوہ و دریا کے مناظر اور میدانوں کی وسعت کی تعریف کر جاتے ہیں۔ اور ان سب چلتی پھرتی تصویروں کو جو انھیں شہروں کے بازاروں میں خاموشی سے مصروف کاروبار نظر آتی ہیں۔ پُر اسرار قرار دے جاتے ہیں میں نے ممالکِ یورپ کی سیر کے بعد اور وہاں بہت سے لوگوں سے گفتگو کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اہلِ مغرب کسی اجنبی کے رُو برو اپنے اصلی خیالات کا اظہار کرنے میں بہت محتاط ہیں۔ ایک مشہور انگریز مدبر غالباً لارڈ سالسبری کا یہ مقولہ ہے کہ "انسان کو زبان اس لئے دی گئی ہے۔ کہ وہ اپنے خیالات لفظوں کے پردے میں کامیابی کے ساتھ چھپا سکے"۔ اور میں نے دیکھا کہ جدید تہذیب میں یہ بہت بڑا ہنر مانا گیا ہے۔ کہ انسان میں خیالات کے چھپانے کی قابلیت۔ خیالات کے

اظہار سے زیادہ ہو۔ اور اقوام یورپ جس
قدر تہذیب کے مدارج میں ایک دوسرے
سے بڑھی ہوئی ہیں۔ اسی نسبت سے اس فن
میں زیادہ ماہر ہیں۔ گویا اس اعتبار سے
غرب کسی قدر شرق سے زیادہ پراسرار ہے۔
اور اس کے بحر خیالات کا پانی زیادہ گہرا ہے۔
یوں سطحی نظر سے جو جس کا جی چاہے سمجھے۔
اور جو جی میں آئے کہے۔ حقیقت میں یہ سب
غلط فہمیاں ہیں۔ اور جب اتفاق زمانہ سے
اہل مشرق اور مغرب میں عام طور پر خلا ملا
ہو گا اور اہل مشرق رفتہ رفتہ اہل مغرب
کے رنگ میں اور اہل مغرب کسی قدر اہل
مشرق کے رنگ میں رنگے جائیں گے۔ تو نہ
باہم یہ حجاب رہے گا نہ مغائرت۔ دوستی اور
دشمنی کا حال تو خدا کو معلوم کہ دونوں میں تعلقات
دوستانہ ہوں گے۔ یا رقیبانہ۔ لیکن یہ بات
یقینی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا رازدان
بنائیں گے۔ اور موجودہ غلط فہمیاں ایکدوسرے
کے اقوال و افعال کے متعلق باقی نہیں رہیں
گی۔ اور دونوں ناواقفیت یا تعصب کی عینک اتار
کر ایک دوسرے پر نظر ڈالیں گے۔ ایک
دوسرے کو پہچان لیں گے اور مدت کے بچھڑے
مل جائیں گے۔ نہ مغرب ہمیں "پراسرار" مشرق

کہے گا نہ ہم اُسے " پر غرور غرب "۔ ایک زمانہ ایسا گزر چکا ہے جب دونوں ایک تھے۔ یورپ کی آبادی کا حصّہ کثیر اس وقت تک مشرقی آباو اجداد کا خون اپنی رگوں میں لئے ہوئے ہے اور بہت سی مشرقی رسوم و عادات اب تک اس میں باقی ہیں خود وہ مذہب جو جس کے تقدس میں تمام عالم عیسوی کو ناز ہے شرق سے اُنھیں ملا ہے۔ اتنے تعلقات اور رشتوں کے باوجود یہ جدائی اور یہ تجاہل۔ جیسے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی۔ اگر اِس ناآشنائی کو آشنائی سے مبدّل کرنا ہو تو اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ ایشائی جو یورپ کو جائیں وہ اہلِ یورپ کے عادات اور خُو بُو سے واقفیت پیدا کر کے جائیں تاکہ ان کو یورپ ایک مشکل معمہ نظر نہ آئے۔ اور اسی طرح اہلِ یورپ جو شرق اور بالخصوص ہندوستان کی سیر کو آئیں یا یہاں قیام کریں۔ وہ جامۂ اجنبیت کو تھوڑی دیر کے لیے الگ کر دیں۔ اہلِ ملک کے خیالات ان کی زبان اور اُن کے لٹریچر کے مطالعہ سے دریافت کریں اور پھر اُن سے ملیں۔ تو اُنھیں نظر آئے کہ ایشیا کی انسانیت بھی بجائے خود کیسی صفات کی جامع ہے۔ عرفی کا یہ شعر ہر زائر و سائر کو جو دوسرے ملکوں سے یہاں وارد ہو۔ اِس ملک کی طرف سے ایک

پُر مغز نصیحت کر رہا ہے - جو آج بھی ایسی ہی سچی اور کار آمد ہے - جیسی کہ عرفی کی زندگی میں تھی ؎

تو از ملکِ عراقی و از گوں کن عادت پیشین
اگر خواہی کہ حسن و رونق ہندوستان بینی

ایک شعبدہ باز

پنڈت رتن ناتھ سرشار

لبِ جوئبار ایک فراخ و وسیع میدانِ پُر بہار ہے - یہ سرسبز و شاداب مقام کسی زمانے میں تاجدارانِ ثریا جاہ و خسروانِ کجکلاہ کا عشرت کدہ تھا اور گو لبِ رود بار واقع ہونے سے اب بھی پُر فضا اور نزہت افزا ہے - لیکن جو لطف پیشتر تھا وہ اب کہاں - ممکن کیا تھا کہ پرندہ پر مارتا - اب یہ حال ہے کہ جا بجا کھنڈر اور پرانی عمارتِ عالی شان کی گری پڑی دیواروں کے ڈھیر ہیں - کہیں اونچے کہیں نیچے - اگلے وقتوں کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ زمانۂ سابق میں خاص اِس مقام پر نور کا عالم تھا - ایک احاطۂ فراخ میں جس نے دو میل زمین گھیر لی تھی - سو کمرے ایکدوسرے سے ملے ہوئے بنے تھے - جس کی تعمیر میں شاہِ فردوس آرام گاہ نے کم سے کم کروڑ روپیہ صرف کیا تھا - عمارت قابلِ دید تھی نہ شنید تھی شاہِ کجکلاہ کو صفائی کا انتہا سے زیادہ خیال تھا - اور لوگ بیان کرتے ہیں کہ اُن سو کمروں میں سے اگر کسی میں ایک پرِکاہ بھی نظر آتا - تو

خسروِ ذی جاہ از بس بد دماغ ہو جاتے - اور
جب تک کامل طور پر چپہ چپہ صاف نظر نہ
آتا کھانا نہ کھاتے - خدام باادب مزاج دان
اور خوش سلیقہ تھے ہزارہا آدمی خاص اس غرض
سے نوکر تھے - کہ صفائی کی طرف بدل متوجہ رہیں
ایک ایک کمرے میں لاکھوں کا اسباب اور سامان
شاہی ہر دم جھمکا رہتا تھا ٭

نقل ہے کہ ایک مرتبہ ایک شعبدہ باز نے
جو امریکہ کے ملک سے آیا تھا اور اپنے فن
میں ید طولیٰ رکھتا تھا - شاہِ عالی مقام ذوی المجد
والاحترام کو انواع و اقسام کے نادر نادر شعبدے
دکھائے - اور خلعت پر خلعت پائے - ایک
روز خسروِ عالی بارگاہ نے حکم دیا - کہ ہم کو کوئی
ایسا شعبدہ دکھاؤ جو کسی خاقانِ جہان و شہنشاہِ
زمان نے نہ دیکھا ہو - شعبدہ باز نے کہا - خدا
کے فضل سے مجھے اس فن میں وہ ملکہ حاصل
ہے - کہ اگر پیٹ بھر کھانا پاؤں اور حضور میرے
کمال کی قدردانی فرمائیں تو تمام عمر روز ایک
نیا شعبدہ دکھاؤں - تین دن کی مہلت کا طالب
ہوا اور اقرار کیا کہ تیسرے روز وہ شعبدہ
دکھاؤں کہ ساری خدائی میں کسی نے نہ دیکھا
ہو نہ سنا ہو - تیسرے روز شعبدہ باز کاملِ
فن بحضور شاہ حاضر ہوا - اور بصد ادب

عرض کی کہ غلام حسب ارشاد حاضر ہوا ہے۔ جس وقت حکم ہو شعبدہ دکھاؤں۔ شاہِ عالی مرتبت نے بہ طیبِ خاطر فرمایا کہ آج سہ پہر کو ما بدولت و اقبال ملاحظہ فرمائیں گے۔

حسب الحکم سلطان شہر بھر میں منادی کی گئی کہ آج سہ پہر کو ایک شعبدہ باز چابک دست جو اپنے فن کا مسلم الثبوت اُستاد ہے اور جس کی شعبدہ بازی کے تمام عالم میں جھنڈے گڑے ہیں۔ حضرتِ ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی کی فرمائش کے بموجب ایسا شعبدہ دکھانے والا ہے۔ جو دنیا سے نرالا ہے جس کسی کو دیکھنا ہو حاضر آئے۔ کرہم وھم کرہم وھم۔ اہلِ شہر وقت معینہ پہ جوق جوق آئے اور تھوڑی دیر میں کئی میل تک ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ ایک عالم مشتاق نظارۂ شعبدۂ دلربا تھا۔ جب جہاں پناہ کے حضور میں بار یابانِ دربارِ سلطان نے گذارش کی کہ پیر و مرشد لکھوکھا آدمی جمع ہیں۔ تو جہاں پناہ نے فرمایا۔ کہ شعبدہ باز کو ہمارے حضور میں حاضر کرو۔ شعبدہ باز فوراً حاضر آیا۔ جھک کر سات بار آداب بجالایا۔ شاہِ گیتی پناہ نے فرمایا۔ ساری خلقت ما بدولت و اقبال کے فرمان واجب الاذعان کے بموجب حاضر آئی ہے۔ کوئی ایسا شعبدہ دکھاؤ کہ حاضرین و ناظرین میں سے ایک آدمی بھی

محروم نہ جائے۔ شعبدہ باز نے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ کے ارشاد واجب الانقیاد کی بجا آوری بسر و چشم منظور۔ لیکن جان جوکھم ہے بس اتنا خیال رہے ؂

یہ کہہ کر شعبدہ باز جو ایک خوبرو جوان طناز تھا۔ شعبدہ دکھانے کے لیئے آمادہ ہوا۔ بامِ فلک احتشام پر بیش بہا شال کا بلند وسیع و فراخ خیمہ نصب ہوا۔ اور خسروِ ذی شان مع شاہزادگانِ عالم و عالمیان بصد آن بان متمکن ہوئے۔ شعبدہ باز نئے قسم کے زرق برق کپڑے پہن کر اپنی چھولداری سے باہر آیا۔ اور خوش نما پٹارہ کھول کر حاضرین کو دکھلایا کہ اگر کسی شخص کو شک ہو تو بغور دیکھ لے۔ اِس پٹارے سے ایک کم سن حسین و مہ جبین عورت نکلے گی۔ جہاں پناہ نے حکم دِیا کہ پٹارا ہمارے پاس حاضر کیا جائے۔ اِسی دم چوبداروں نے چٹکیوں میں پٹارا جہاں پناہ کے پاس پہنچایا۔ اور بادشاہ نے مع شاہزادگان نامدار کے ہر طرفہ بہت غور سے دیکھا۔ مگر پٹارے میں ایک سوراخ بھی نہ پایا۔ متحیر ہو کر وزرائے سلیقہ شعار اور اراکین باوقار سے کہا کہ ذرا سوچو تو اِس پٹارے میں کیونکر اِنسان چھپ سکے گا۔ وزرا نے بغور دیکھ بھال کر عرض کی کہ جہاں پناہ

بجز حیرت کے اور کیا گزارش کریں۔ اتنا سا پٹارا اس میں بلی کا بچہ تک نہ بیٹھ سکے۔ بھلا عورت کیونکر چھپ رہے گی۔ ایک ضعیف الاعتقاد آدمی نے کہا جہاں پناہ یہ سب جادو کا کھیل ہے۔ مگر مگر شاہِ ثریا جاہ جادو ٹونے کے قائل نہ تھے مسکرا کر خاموش ہو رہے اور پٹارا شعبدہ باز کے پاس بھیجدیا۔ اس نے پھر بآوازِ بلند کہا کہ جس کسی کو شک ہو خود دیکھ لے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اس پٹارے میں سے عورت نکلے۔ تو لوگ اپنے اڑھائی چاول گلائیں۔ جس کا جی چاہے اسی دم عقل دوڑائے اور جو کچھ کہنا ہو کہہ لے۔ اتنا ذرا سا پٹارا اور ایک سوراخ تک نہیں۔ اور ہلکا پھلکا۔ پچاس ساٹھ آدمی بھیڑ کاٹ کر شعبدہ باز کے پاس آئے ادھر اُدھر ہر سمت پٹارے کو دیکھا۔ مگر اپنا سا منہ لے کر چل دئیے۔ ایک شہزادۂ گردوں مدار نے حکم دیا۔ کہ دس معتبر اور ذی شعور آدمی پٹارے سے دس دس قدم کے فاصلے پر علیحدہ علیحدہ کھڑے دیکھتے جائیں کہ عورت اس میں سے کیونکر آتی ہے۔ شعبدہ باز نے پٹارا بند کر دیا اور تھوڑی دیر تک زبانِ انگریزی میں کچھ کہا اس کے بعد بآوازِ بلند للکارا کہ پٹارے کی طرف دیکھتے رہو

عورت اِس میں موجود ہے - وہ آئی - وہ آئی
نکل - نِکل - نِکل - نِکل - ایک دفعہ ہی بندوق
سر کی - دائیں پلک جھپکنے کی بھی دیر نہ ہوئی
تھی کہ پٹارے کا ڈھکنا از خود اُچک کر
دور گرا - اور چودہ پندرہ برس کی ایک گلبدن
غنچہ دہن یورپین لیڈی کا جھمگھٹا نظر آیا ؛
تماشائی دنگ کہ یہ مہ پارہ پری چہرہ اِس
پٹارے میں سے کیونکہ آئی - شعبدہ باز نے کیا
آفت ڈھائی کہ لاکھوں آدمیوں کی آنکھوں میں
خاک جھونک کر پٹارے میں سے یہ صورت دکھا
دکھائی - جہاں پناہ نے خوش ہو کر فرمایا کہ ایک
کمرے کا سارا سامان تم کو بخش دیا - شعبدہ باز
نے فرطِ غرور سے کہا کہ جہاں پناہ ابھی میرا
شعبدہ ختم نہیں ہے - یہ تو فقط ایک چٹکلا تھا
شاہِ عالی مقام اور بھی محظوظ ہوئے اور بصد
شوق تماشا دیکھنے لگے - شعبدہ باز نے ایک
ہاتھ بھر کی رسی سب کو دکھائی اور کہا کہ یہ
ہاتھ بھر کی رسی کائنات الجو کی حد تک پہنچے
گی - جو یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے -
وہاں ایک دیو رہتا ہے جس کا نام ونٹوسس
ہے - وہ دیو اِس رسی کے دیکھتے ہی از بس
خشمگین ہوگا - اور طیش کھا کر چاہے گا کہ
کل رسی کو گھسیٹ لے اور میں اِس کا سرا نہ

چھوڑوں گا - وہاں مجھ سے اور دیو سے لڑائی ہو گی
اور خدا نے چاہا تو میں سُرخ رو آؤں گا - لوگوں
نے اس بیان کو غور سے سُنا اور حسب درخواست
شعبدہ باز پانچ سَو آدمیوں کو حکم دیا گیا کہ بآواز
بلند کل حاضرین کو اس بیان سے مطلع کریں کہ رسی
جو دیکھی گئی تو بس ایک ہاتھ بھر کی تھی - بڑھتی تھی
نہ گھٹتی تھی - رسی لے کر شعبدہ باز نے پھر انگریزی
میں کچھ کہا اور ایک دفعہ بندوق داغ کر رسی جو
پھینکی تو بڑھتی ہی چلی گئی - کوئی آدھ گھنٹے کے
عرصے میں لوگوں نے دیکھا کہ آسمان سے جا لگی -
اور کھٹ کی آواز آئی - حاضرین مقامِ مذکور کے
علاوہ اِن لوگوں نے بھی یہ انوکھا شعبدہ دیکھا
جو شہر میں تھے - اِس وقت یہ کیفیت تھی کہ
کوٹھے پھٹے پڑتے تھے - ہر محلے کے زن
و مرد کوٹھوں پر سے سیر دیکھتے تھے - جسے
دیکھو آسمان کی طرف نظر ہے - ادھر کھٹ کی
آواز آئی - اِدھر آسمان پر گُلِ لالہ کھِل گیا - اور
تماشائیوں کی آنکھیں جھپک گئیں - مشرق سے
مغرب تک آسمان سرخا سرخ نظر آتا تھا - اِس کے
بعد گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا - اب لوگ متوحش تھے
کہ یا اللہ - یہ کیا ماجرا ہے - دیکھتے ہی دیکھتے
وہ تاریکی بھی دُور ہو گئی - مگر ایک سیاہ فام آدمی نظر
آیا - ٹانگیں بیس بیس گز کی - ہاتھ - پاؤں - آنکھ

ناک - کان سب بھیانک - رسّی کو شعبدہ باز نے بہت زور سے پکڑا - مگر دیو نے اِس زور سے گھسیٹی - کہ شعبدہ باز بھی ساتھ ہی چلا گیا - دم کے دم میں رسّی اور شعبدہ باز اور دیو سب غائب - تب تو تماشائی اور بھی متحیر ہوئے کہ یہ عجیب بات ہے - ہاتھ بھر کی رسّی اور آسمان بھر پہ منتہی ہوئی اور پھر مطلع صاف ۔

دیو کا نظر آنا اور شعبدہ باز کا جانا اور دونو کا غائب ہونا اور رسّی کا کھونا - ان سب واقعات سے نہایت ہی حیرت ہوتی تھی - کل تماشائی مضطرب اور ششدر تھے - مگر شعبدہ باز کی حور طلعت بیوی مسکراتی جاتی تھی ۔

جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اِس زنِ ملک فریب کو لے آؤ - مقربانِ بارگاہِ سلطانی نے جا کر کہا کہ حضرتِ سلطانِ عالم نے تمھیں یاد فرمایا ہے اس غیرتِ خوبانِ فرخار نے نہایت کج ادائی سے کہا کہ کیا مجال! جب تک میرا شوہر نہ آئے گا - اِس جگہ سے ہرگز نہ ہٹوں گی - اتنے میں وہ غیرتِ حورِ خُلد از قصور بصد شان دلربائی چمک دمک کر بغیر کسی چیز کے سہارے ہوا میں کھڑی ہو گئی - تماشائیوں نے نعرۂ سبحان اللہ بلند کیا - اس وقت اِس نازنین کا جمالِ مبین دیکھنے کے قابل تھا - یہی معلوم ہوتا تھا

کہ حسن کی تصویر کا نمبر قدرت نے ہوا پر کھینچ دی ہے۔ وہ ناز انداز کہ نہ دیکھا نہ سنا۔ اس پر بستم یہ ڈھایا کہ ہوا پر ہی ناچنے لگی۔ تماشائی ہزار جان سے عاشق ہو گئے۔ حضرت شاہ جم جاہ کی تو یہ کیفیت ہوئی کہ جان پر بن آئی تھی۔ بے اختیار جی چاہتا تھا کہ خیری نصیب ہو مگر یہ حور شمائل ضرور ہماری ہو رہے۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ مطلع صاف ہے گرد و غبار سرخی تاریکی کچھ بھی نہیں ہے۔ شک کی جگہ یقین ہوا کہ شعبدہ باز کو دیو نے قتل کر ڈالا ❋

بادشاہ کی تو یہ کیفیت تھی۔ اب ولی عہد تاج و تخت کا حال سنئے کہ ان کے چہرے سے جنون کی کیفیت صاف ظاہر ہوتی تھی اپنے آپ میں نہ تھے۔ ؎

دل مے رود ز دستم صاحب دلان خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

تماشائیوں میں بھی اکثر نوجوان بجوش کھا گئے۔ اتنے میں اس بُتِ طنّاز و سراپا ناز کی زلفِ عنبر بار جو کھل گئی تو سنبیں کمر کی خبر لائیں اور رُخِ تاباں کے ارد گرد ہالۂ سیاہ

کی طرح ہرائیں ۔

آخر وہ ناظورۂ دلفریب ۔ حاضرین اور ارا کین و شہزاد گان با تمکین کو اپنے جمالِ مبین کا فریفتہ و شیدا کر کے ہوا ہی پہ سے اٹھکیلیاں کرتی ہوئی زمین پر آئی ۔ اُدھر زمین پر اس عابد فریب عدوئے صبر و شکیب نے قدم رکھا ۔ ادھر آسمان پر حشر بپا ہوا بادل کے ٹکڑے ہٹتے ہی دیو ونٹوسس نمودار ہوا اور دُوسرے ٹکڑے سے شعبدہ باز نکلا ۔ شعبدہ باز کے دیکھتے ہی تماشائیوں نے غل مچایا اور ادھر دونوں میں لڑائی ہونے لگی ۔ دیو اس زور سے چیخ اٹھا کہ گہوارۂ زمین ڈانوا ڈول ہو گیا ۔ شعبدہ باز بھی رعد کی طرح گرجنے لگا ۔ دیو نے اپنا منہ جو قعرِ جہنم کا نمونہ تھا کھولا اور شعبدہ باز کی طرف جھپٹا ۔ شعبدہ باز کی بیوی نے ایک سبز کپڑا اوپر کی طرف پھینکا ۔ وہ کپڑا سیدھا اڑتا ہوا دیو کے سر پہ پہنچا ۔ اور وہاں گولا بن کر پھٹا ۔ تو دیو نظر سے غائب ہو گیا اور ایک پارۂ ابر سے نکلا ۔ اس مرتبہ دیو کے ہاتھ میں ایک بانس تھا ۔ جس سے وہ شعبدہ باز کے سر پہ چوٹیں لگاتا تھا ۔ مگر شعبدہ باز ہر بار بچ بچ جاتا تھا ۔ ایک مرتبہ شعبدہ باز نے بانس کو پکڑ لیا ۔ اب دل

لگی دیکھیئے کہ ایک طرف سے شعبدہ باز اور دوسری جانب سے دنتوسس زور کر رہا ہے۔ جب دنتوسس کسی قدر غالب آیا اور شعبدہ باز کا دم پھول گیا۔ تو اِس حور طلعت نے ایک چاقو آسمان پر پھینکا۔ چاقو نے اِس بانس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ آدھا دیو کے پاس اور آدھا شعبدہ باز کے ہاتھ میں۔

ولی عہد نے اِس عورت سے پوچھا کہ لڑائی کا کیا انجام ہوگا؟

لیڈی (ل) (یعنی شعبدہ باز کی ہمراز) خدا جانے ؂

ولی عہد۔ آخر کچھ معلوم تو ہو۔

ل۔ رتر مٹ نو ہو کر، فتح یا شکست ؂

ولی عہد۔ شکست کا انجام کیا ہوگا؟

ل۔ موت ؂

ولی عہد۔ تو لڑتے کیوں ہیں پھر؟

ل۔ اِن کی مرضی ؂

ولی عہد تم اِن کو منع کیوں نہیں کرتیں۔

ل۔ (مسکرا کر) وہ آسمان پر ہیں زمین پر منع کیوں کر کروں ؂

بادشاہ۔ ہماری عقل دنگ ہے۔

ل۔ ہوا ہی چاہے۔ اِن کے شعبدوں سے دنیا کی عقل دنگ ہے ؂

بادشاہ - خدا کرے زندہ آئیں ۔

ل - بس اب باتیں نہ کیجئے - مجھے اُدھر دیکھنے دیجئے ۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دیو اور شعبدہ باز میں تلوار چل گئی - اودھر دیو تیغِ دو پیکر سونت کر جھپٹا - اور شعبدہ باز نے سبز کاشانی مخمل کے غلاف سے شمشیر خارا شگاف چمکائی - دونو پیترے بدل بدل کر وار کرنے لگے - دیو سے ایک مرتبہ تلوار چھٹ گئی - مگر دوسرے ہاتھ سے اُسے فوراً روک لی - شعبدہ باز نے کڑک کر مونڈھے پر تلوار لگائی - مگر ہاتھ چھچھلتا ہوا پڑا - دیو نے خشمگیں ہو کر ایک اور تلوار دستِ چپ میں لی اور دونوں تلواروں سے حملہ کرنے لگا ۔

اس سانحہ ہوش ربا کو دیکھ کر وہ زن خوب رو دھاڑیں مار مار کر رونے لگی - ادھر آسمان پر یہ ہنگامہ بپا تھا - ادھر زمین پر شور و بکا تھا - اِس معشوق شیریں حرکات کے رونے سے کل تماشائیوں کا دل بھر آیا - ہر فردِ بشر زار زار رونے لگا ۔

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ دونوں نے تلواریں پھینک دیں اور دور دور کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو گھورنے لگے - اِس پر زنِ ستم رسیدہ نے بہ آوازِ بلند کچھ کہنا شروع کیا - جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنے شوہر کو کچھ سمجھاتی ہے ۔

ل۔ بائیں آنکھ۔ بائیں آنکھ - چرب - چرب
چرب ؎
لوگ متحیر کہ یا الٰہی بائیں آنکھ سے کیا مطلب
ہے - اور یہ چرب چہ معنی دارد ؎
اس نے اشارے سے کچھ پوچھا۔
ل - فول آن - آن - آن -
لوگوں نے دیکھا کہ لیڈی کے آن آن کہنے سے
شعبدہ باز آگے کی طرف بڑھتا جاتا ہے ؎
ل- رائٹ ہینڈ - یو فول - رائٹ ہینڈ -
شعبدہ باز دائیں طرف آگیا اور آتے ہی دیو کے
سر پر اس زور سے دو ہتھڑ لگایا - کہ دیو پیچھے
ہٹا ؎
ل- ہولڈ آن -ہولڈ آن -
شعبدہ باز اسی مقام پر کھڑا رہا - تو دیو نے
جھپٹ کر ایک چپت لگائی اور شعبدہ باز کی
زبان سے ہائے کا لفظ بے اختیار نکل گیا
اس پر لیڈی نے زمین پر مارے غصے کے
پاؤں کو زور سے دے پٹکا ؎
شعبدہ باز اس صدمے سے نیم جان ہو گیا
تو دیو خوب ہی زور سے ہنسا - اور اس کے
بڑے بڑے دانت دیکھ کر اشاعت میں کوئی
دو تین ہزار بزدلوں نے مارے ڈر کے آنکھیں
بند کر لیں ؎

شعبدہ باز یہ سُن کر دنٹوسس پر جھپٹا اور جھپٹتے ہی جپت دی تو دیو سر سہلاتا ہوا پیچھے ہٹا ۔

پھر بیڈی نے غل مچایا - ہولڈ آن - ہولڈ آن - یعنی آگے بڑھ کر ایک اور دے لیکن شعبدہ باز پھر رُک گیا - اس پر بیڈی بہت جھلائی ۔

اتنے میں دیو نے ایک ہاتھ کاٹ ڈالا اور کٹا ہوا ہاتھ سیدھا اس چھولداری کے قریب گرا - بڑا غل مچا - لاکھوں آدمی ایک دفعہ ہی چلا اُٹھے - اور وہ بتِ پندار فرطِ الم سے زمین پر گر پڑی ۔

حضرتِ جہاں پناہ نے حکم دیا - کہ اس کو بہ آرام تمام کمال ادب و تعظیم کے ساتھ اُٹھا لاؤ - چنانچہ خدام ذوی الاحترام نے ویسا ہی کیا ۔ اتنے میں دیو اور شعبدہ باز پھر جُٹ گئے ۔ رُنہ کھولا - اور لپک کر شعبدہ باز کو ... کھایا - تھوڑی دیر میں اس بیچارے کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ کر گر پڑا - اور پھر غل مچا - دس منٹ تک برابر اس قدر غل مچتا رہا - کہ کان پڑی آواز کسی کو سنائی نہیں دیتی تھی ۔

دیو کے ہاتھ میں ایک خارا شگاف پنجہ

نظر آیا - اور لوگوں نے دیکھا - کہ اس نے
ایک ہاتھ ایسا بھرپور لگایا - کہ شعبدہ باز کی
دونوں ٹانگیں کٹ کر گر پڑیں - اس کے
بعد دھڑ کے بھی کوئی بہتر ٹکڑے کر ڈالے
اور سر دبو لے بھاگا ؎

خلقِ خدا اس انوکھے شعبدے کو حیرت
کی نظر سے دیکھتی تھی - شعبدہ باز کی یہ
گت بنی تو وہ پری جیسی بجلی کی طرح چمک
دمک کر بادشاہ کے سامنے آئی - اور دونو
ہاتھ اونچے کر کے کچھ کہا - تو چند بُونے نظر
آئے - اور وہاں خود بخود آگ پیدا ہو
گئی - اس آگ میں کے شعلے آسمان کی خبر
لاتے تھے - وہ شعلہ رُو جل بھُن کر خاک
ہو گئی - اور بونوں نے اس خاک کو اُٹھایا -
تو ہوا سے باتیں کرتے جانے لگے - دم
کے دم میں نظر سے اوجھل ؎

شاہِ زماں انگشت حیرت بدنداں - خلق
خدا گریہ کناں - ایسا شعبدہ کسی نے کبھی کاہے
کو دیکھا تھا - عین مایوسی کی حالت میں لوگ اپنے
اپنے گھر جانے کو ہی تھے - کہ آسمان پر ایک
شعلہ نمودار ہوا - دیکھتے دیکھتے اس شعلہ
سے ایک ہاتھ نکلا - پھر دوسرا ہاتھ ظاہر ہوا
اس کے بعد ایک ٹانگ دکھائی دی - تماشائی

بغور و تعمق دیکھتے جاتے تھے۔ ان لاکھوں آدمیوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی نظر آسمان کے رُخ نہ ہو۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد اس شعلے میں سے ایک آدمی نکلا۔ دیکھا تو وہ شعبدہ باز ہے۔ اس وقت وہ شور مچا کہ الاماں۔ شعبدہ باز خود زمین پر آیا۔ اور شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر آداب بجا لایا۔ تماشائی متحیر تھے کہ یا الٰہی یہ بشر ہے یا فرشتہ!

شعبدہ باز (ش) (بادشاہ سے) جہاں پناہ اس وقت میں بالکل شل ہو گیا ہوں ٭

بادشاہ (با) کارے کردہ! شاباش!

ش۔ گھنٹوں لڑائی رہی۔ طرح طرح کی مصیبت سہی ٭

ولی عہد۔ بارے صحیح سلامت تو آئے ٭

ش۔ حضور کے اقبال سے ٭

وزیر۔ تم باکمال آدمی ہو ٭

ش۔ جہاں پناہ! وہ میری برق دم جورو کہاں ہے؟

با۔ کمال افسوس ہے کہ تمہاری جانسوز فراق دیکھ کر وہ بیچاری جل مری ٭

ش۔ کیا جل مری! اے حضور!

ولی عہد۔ (آبدیدہ ہو کر) ہائے افسوس! ہائے افسوس!

ش - حضور میری بیوی مجھ کو مل جائے ورنہ
میں اپنی جان دے دوں گا - اور چاہے حضور
توپ کے منہ سے اڑا دیں - مگر میرا دل یہ
گواہی دیتا ہے کہ مرزا ولی عہد بہادر نے اس
کو گھر ڈال لیا ہے

با - اس وقت تم جو چاہے کہو - تمہارا
قصور قابلِ معافی ہے

ش - حضور میری جورو تمام امریکہ کی لیڈیوں
میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہے - حسن و جمال
میں اپنی آپ ہی نظیر ہے - مرزا ولی عہد بہادر
نام خدا ابھی جوان ہیں اور جوان کیا معنی
عنفوانِ شباب ہے

ولی عہد - یہ لاکھوں آدمی دیکھ رہے
ہیں کہ وہ جل کر خاک ہو گئی - اور اِس
تودۂ خاک کو چھ بونے اٹھا کر لے گئے -

ش - جہاں پناہ غریبوں پر کرم کرنا چاہیے

با - تم سب سے پوچھ کر دیکھو - کہ کیا
ہوا ؟

ش - حضور ! یہ سب حضور کی رعایا ہیں -
میری سی کون کہے گا بھلا بس صاف ظاہر ہے
کہ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی اور اس کا چہرۂ
نورانی میرا دشمن ہوا اور مرزا ولی عہد بہادر
کو بادشاہ ذی جاہ کا لڑکا اور کلے ٹھلے کا گبرو

دیکھ کر رہ گئی - اب میں نے اس سے
ہاتھ دھویا -

با- بولو تم کو کیا انعام دیں ؛
ش- جہاں پناہ! جب تک میری بیوی مجھے
نہ ملے گی - میں کچھ نہ لونگا - اور اپنی جان دیدونگا
ولی عہد - یا الہٰی اس کو کیونکر کوئی سمجھائے
وزیر - بڑی خرابی ہے ؛
ش - ہاں جن کی خرابی ہے - اس کی ہے مرزا
ولی عہد بہادر کا تو کچھ نہیں بگڑا - مجھ پر البتہ
اوس پڑ گئی - ہائے ایسی ماہ رو - اب بھلا
مجھے کہاں ملے گی ؛
وزیر - تم ذرا دم تو لو - ہم کل باتیں تم
کو سمجھا دیں گے ؛
ش - بس میں سمجھ گیا - فیری - فیری - ڈیر فیری!
شعبدہ باز نے جو اپنی پیاری بیوی فیری کو تین
بار آواز دی تو فیری نے کہا - ہیلو ڈیر! یہ کہہ
کر وہی برق وش جو ابھی ابھی جل کر خاک ہو
گئی تھی - بصد ناز و انداز مرزا ولی عہد
بہادر کی کرسی کے نیچے سے نکل کھڑی ہوئی
اور شعبدہ باز نے قہقہہ لگا کر یوں زبان
کھولی :-
ش - دیکھا میں تو کہتا ہی تھا - کہ مرزا ولی عہد
کا اس میں ہاتھ ہے ؛

ل - یہ تو مجھ کو اپنے گھر میں ڈا لے بیٹے تھے ٭

ش - میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا ٭

اس شعبدے سے خسرو گیتی پناہ از بس محظوظ ہوئے - اور بہ طیبب خاطر فرمایا کہ جو انعام مانگے وہ دیا جائے - شعبدہ باز نے عرض کی جہاں پناہ! میں تو ایک غریب آدمی ہوں - لیکن حضور کے غلاموں کو میں نے خوش کردیا اب حضور ہی زبان مبارک سے کچھ فرمادیں ٭

با - دس کمروں کا پورا سامان دیدیا جائے ٭

ش - (آداب بجا لاکر) حضور نے میری بڑی قدردانی کی ٭

لفظ

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

جس طرح حرف صوت کی نمائندگی کرتا ہے لفظ جذبات - احساسات اور تصورات کی نمائندگی کرتا ہے - لفظ کے اجزائے ترکیبی حرف ہیں اور زبان کے اجزائے ترکیبی لفظ ہیں ۔

لفظ کی اہمیت کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ "کن" سے یہ دنیا یہ تمام کائنات پیدا ہوئی - بتایا جاتا ہے کہ لفظ "اوم" کی عظمت اور برکت بیان سے باہر ہے - یہ ذکر اس غرض سے کیا گیا - کہ لفظ محض لفظ کی اہمیت پڑھنے والے کے دل پر نقش ہو جائے - لفظوں سے عبارت اور عبارتوں سے ادب کی تشکیل ہوتی ہے - لفظ ہی زبان کا سرمایہ اور مول ہوتے ہیں - لفظوں سے ایک زبان اور ادب کا درجہ قائم ہوتا ہے - انسانوں کی طرح لفظوں پر بھی جوانی - بڑھاپے اور موت کا عمل ہوتا ہے - چنانچہ لفظ پیدا ہوتے ہیں - جوان ہوتے ہیں سٹھیاتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں - زبان میں رائج ہونا

لفظ کی جوانی ہے۔ کم استعمال میں آنا اس کا بڑھاپا ہے۔ اور متروک ہو جانا اس کی موت ہے۔

علم ادب کی بارہ قسموں میں اگرچہ اول نمبر علم لغات کو دیا گیا ہے۔ لیکن متقدمین کے نزدیک علم لغات کی معنی متن یعنی لفظ اور اس کے معنی تک محدود تھی۔ اس کی صرفی اور صوتیاتی حیثیت کی طرف برائے نام توجہ تھی۔ ایسے لفظ بہت سے ہیں۔ جو اپنی تاریخ میں اپنا شجرۂ نسب پوشیدہ رکھتے ہیں اور بہت سے زمانے کے انقلابوں اور قوم کے سانحوں کی تاریخ کے امانت دار ہیں۔ بہت لفظ ایسے ہیں۔ جو ایک قوم کی سیاسی اخلاقی یا معاشرتی ترقی یا زوال کی روداد اپنے میں لئے ہوتے ہیں۔ ان سب امور کے دفتر کو طلسم لغات کہنا درست ہوگا۔ آگے چل کر ان امور کے زیر نظر کی حیثیت سے بحث کی جائے گی۔ اس بارے میں اردو کے الفاظ کو ادبی اور تاریخی روشنی میں دیکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔

لغات کی قدر دنیا کو نون اور ہیچ اور بیجروندہ کوئی کچھ ہی کہے۔ لغات کی ایک مکمل کتاب کو اس کی سوانحمری سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ کوئی چیز کوئی سانحہ اور واقعہ ایسا نہیں ہوتا جو اس وقت ظہور میں آچکا ہو اور اس کتاب میں درج نہ ہو۔ اگر ایک قوم کی تاریخ کے دفتر فنا ہو جائیں۔ مگر اس کی

زبان کا لغات موجود ہو تو اس کی مدد سے اس قوم کی تاریخ پھر مرتب ہو سکتی ہے۔ مثال کے لئے ایک لفظ ناؤ کو لیجئے:

ناؤ پانی میں چلنے والی سواری کو ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ آجکل ہندوستانی سمندری قوم نہیں مانے جاتے اور نہ وہ مغربی نفس معنی میں سمندری قوم ہیں ہی لیکن یہی ہندوستانی ناؤ ہند کے سمندروں سے چل کر مغرب میں پہنچی اور وہاں اس نے (NAVY-NAUTICAL-NAVIGATION) اور (NAUSEA) پیدا کئے۔ ہومر جہاز کو NAUS کہتا تھا۔ ناو جیسی ایک اور آبی سواری کو ہمارے ہاں بجرا کہتے ہیں اس لفظ سے اٹلی کا BARGE اور لاطینی BRIG بنا۔ اور BARGAIN کی اصل بھی یہی لفظ بجرا بتایا جاتا ہے بس ناؤ اور بجرا یہ دو لفظ اس امر کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اہل ہند جہازرانی اور سمندر کے سفر سے بیگانہ نہیں تھے۔ اگرچہ اس وقت وہ بحری قوم نہیں ہیں آپ نے دیکھا کیونکہ لفظ نے مردہ تاریخ کو زندہ کر دیا۔ لانچ (LAUNCH) کا لفظ بھی بہ نیگنڈی مشرق سے یورپ کو لے گئے۔ اور میرا خیال ہے کہ بیچ (BEACH) کا لفظ بھی ہندوستان سے یورپ کو گیا۔ بیچ اس ریتلے میدان کو کہتے ہیں۔ جو ساحل اور سمندر کے پانی کے بیچ میں واقع ہو۔

الفاظ کون بناتا ہے | عالم اصطلاحیں گھڑتا ہے۔ ادیب محاورے بناتا ہے۔ شاعر صنائع بدائع کی پیدائش کا سبب

ہوتا ہے۔ لیکن عام الفاظ عام لوگ بناتے ہیں۔ ان میں بڑا حصہ اہلِ حرفت کا ہے۔ ان کا تصرف کا سلیقہ اور تخلیق لفظ کی قابلیت حیرت انگیز ہے۔ ورلیں۔ دونتا۔ کھڑکی۔ نلا۔ گرائی آری۔ رندہ۔ کھرپا۔ کرنی۔ بسولی۔ دوائی یہ سب لفظ نقاّت یا ادیبوں یا شاعروں نے پیدا نہیں کئے۔ بلکہ ان لوگوں نے پیدا کئے جن کے پیشے میں ان کی ضرورت تھی۔ سپاہی کے ایک اوزار تلوار کو لیجئے۔ اصل میں یہ ترّوار تھا۔ تَرو درخت کو کہتے ہیں پہلے درخت کاٹنے کا ایک اوزار بنایا گیا اور ترو کی نسبت سے اُسے ترّوار کہنے لگے۔ پھر اس سے جانور بھی مارنے لگے۔ رفتہ رفتہ ترقی کرتے کرتے وہ اوزار جو درخت کاٹنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ سپاہی کا نہایت کار آمد ہتھیار بن گیا اسی طرح بہت سے لفظوں کی سوانح عمری مرتب ہو سکتی ہے لفظیت اور معنویت کا مطالعہ اور تحقیق نہایت دلچسپی کے علاوہ لسانیات کی جان ہے۔

بھادوں کی سوہانی پھوار دیکھ کر انسان نے اپنی تفریح کیلئے فطرت کی وارفتگی اور غیر مستقل مزاجی سے مقابلہ کیا، خم نمہ اور نال سے کام لیا۔ جس کے نتیجے کو وہ پھوارا کہتا ہے۔ اب ذ جب چاہتا ہے پھوار کے مزے لوٹتا ہے۔ فارس کی زبان میں پھو نہ تھی۔ فوارہ کہنے لگے۔

جاپانی میں ہندی لفظ اپنے ماخذ کی تحقیق سے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ کیا کیا لائے۔ جاپان کی زبان میں ہندوستانی زبان کے الفاظ کا وجود اس امر کی خبر دیتا ہے کہ جاپان کی کلچر ہندوستان کی کلچر سے کہاں تک متاثر و مستفید ہوئی۔ بہت سے لفظ

ہمارے وطن کے لہجے کے خفیف تغیر کے ساتھ جاپانی میں موجود اور اپنائے ہوئے ملتے ہیں ان میں سے ایک لفظ بندہ ہے جو جاپانی خط کے آخر میں اپنے نام کے پہلے لکھتا ہے۔ جیسا کہ ہندوستان میں بڑوں کے نام خطوط کے بارے میں اب تک کم و بیش دستور ہے۔

لفظوں پر ذی عروج ناموں کا تاریخی اثر یا ان کا ارتقا

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم باشان ہستی سے منسوب ہو کر ایک لفظ کے معنی خاصہ اور ممتاز ہو سکتے ہیں۔ جیسے (۱) جدھشٹری راستبازی (۲) نوشیروانی انصاف (۳) سارنگی (۴) سلیم شاہی (۵) جہانگیری (۶) نادری - نادری حکم - نادر گردی - (۷) مرہٹی گمس گمس - (۸) سکھا شاہی وغیرہ۔

تشریح :-

(۱) پانڈوں کا بڑا بھائی جدھشٹر راست بازی اور سچ بولنے کے لئے مشہور تھا - جب یہ صفت نسبتی سچائی کے ساتھ مربوط ہوئی تو اس لفظ کے معنی میں بہت ترقی ہو گئی۔

(۲) عدل یا انصاف ہمیشہ اعلیٰ صفت سمجھے جاتے ہیں - یہاں تک کہ خدا کے ناموں میں "نیائکاری" کا لفظ داخل تھا۔ نوشیرواں عدل گستری میں تاریخی شہرت رکھتا ہے - اس نام سے نسبت پا کر عدل کی صفت اور بین ہو گئی۔

(۳) سارنگی خود بول رہی ہے - کہ میں سارنگ دیو کی دست پرداختہ ہوں۔

ل؎ دیکھو مسٹر خجر تکا کوشو کا مضمون - رسالہ ینگ ایسٹ مطبوعہ ٹوکیو بابت اپریل ۱۹۲۶ء میں۔

(٤) ایک خاص وضع کی جوتی جو شہزادہ سلیم سے منسوب اور دوسری وضع کی جوتیوں سے متمیز ہے۔

(٥) جہانگیری۔ پہنچے کا زیور جو ملکۂ نورجہان نے اختراع کیا اور جہانگیر بادشاہ کے نام سے منسوب کیا۔

(٦) نادرشاہ کی کڑی سیاست۔ استبداد اور جلال مغلوب ہیں۔ اس شخصیت سے منسوب ہو کر کنجنے میں نادری اور سیاسیات میں نادری حکم یعنی اٹل حکم اور نادرگردی یعنی استبداد یہ مرکب لفظ وضع ہوئے۔

(٧) مرہٹوں کی حکومت میں دفتر کے پیچیدہ دستور العمل کی وجہ سے جسے آج کل کے زمانے کا لال فیتا سمجھئے معاملات کے فیصل ہونے میں بہت دیر لگتی تھی۔ اور محکمے کی رپورٹوں میں قلم بہت گھسایا جاتا تھا۔ اس وجہ سے مرہٹی گھس گھس کا وجود ہوا۔ یعنی معاملات کے طے ہونے میں غیر معمولی اور بے ضرورت دیر لگنا۔

(٨) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد پنجاب میں طوائف الملوکی۔ بے ضابطگی اور بد انتظامی کا غلبہ رہا۔ اس سے سکھا شاہی کا مرکب پیدا ہوا۔

عام لفظ یا رس کا اثر قبول کرتے ہیں

عربی میں مدینہ محض شہر کے معنی رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی مدینہ سے مدنیت اور تمدن مشتق ہیں۔ لیکن جب سے پیغمبر اسلام مکے سے ہجرت کر کے اس شہر میں پناہ گزین ہوئے اور آخر تک وہیں رہے لفظ مدینہ کو علم کا امتیاز حاصل ہو گیا اور اب مدینہ کہیں یا مدینہ منورہ۔ مراد وہی خاص شہر ہوتا ہے۔ یہ ظرف اس

لفظ کو محض پیغمبر اسلام کی قیامگاہ ہونے سے نصیب ہوا اسی کو پارس کا اثر کہا گیا ہے۔ لوہا پارس پتھر سے چھو کر سونا بن جاتا ہے۔ یہ تو محض افسانوی گپ ہے۔ مگر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک لفظ کسی ممتاز شخصیت کی قربت سے کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔

یہی حال لفظ گنگا کا ہے۔ ویدک عہد میں گنگا صرف دریا کا مترادف تھا۔ آریہ لوگ جب ہندوستان میں پھیلے اور ان کو عروج ہر قسم کا حاصل ہوا اور انھوں نے ایک خاص دریا کے پانی کی جانچ کی جو ہردوار کے مقام پر میدان میں داخل ہوتا ہے۔ تو گنگا صرف اسی ایک دریا کا نام رہ گیا ہے۔ اور مدینہ کی طرح قلم کی حیثیت اس کے حصے میں آ گئی۔

یہی حال حج اور یاترا کا ہے۔ دونوں کے معنی تھے جانا سفر کرنا۔ مگر اب یہ لفظ ایک خاص معنی کے حامل ہیں جن کی تشریح کی ضرورت نہیں رہی۔ یہی کیفیت شہید۔ عید۔ دسہرہ اور پیغامبر جیسے لفظوں کی ہے۔

ابھی جو بیان ختم ہوا ہے۔ اسے لفظوں کا ارتقا سمجھنا چاہیئے۔ انسانوں اور قوموں کی طرح لفظوں کو بھی تنزل کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔

لفظوں کا تنزل | بعض لفظ اپنے عظیم الشان بلکہ مقدس مقام سے گر کر بالکل مختلف بلکہ ذلیل المعنی میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ دو مثالیں ہیں :-

لن ترانی - یہ کلمہ خدا کی طرف سے حضرت موسیٰؑ کی جانب

خطاب ہوا تھا۔ مگر اب بیجا شیخی اور ڈینگ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔

صلواۃ ۔ اس لفظ کے معنی ہیں رحمت ۔ درود اور یہ لفظ پیغمبر اسلام کے نام سے خاص تعلق رکھتا تھا اور رکھتا ہے لیکن اردو میں اسکے معنی ہوئے برا بھلا کہنا ۔ گالی گلوچ۔

رام کہانی نام تھا سری رام چندر کی زندگی کے حالات کا اب فضول طویل کلام کے معنی میں یہ مرکب لفظ استعمال ہوتا ہے۔

دیو پہلے دیوتا ۔ یعنی غیر معمولی قوائے روحانی اور فوق البشر اوصاف رکھنے والے کو کہتے تھے ۔ اور اب اندر سبھا کا لال دیو اور کالا دیو آپ جانتے ہی ہیں۔

یہی حال یارِ غار اور لل آعوذی ۔ گورو گھنٹال ۔ بگلا بھگت ۔ چالاک ۔ شیخی اور مشیخت وغیرہ کا ہے۔ لفظوں کے معنوی تنزل کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ یہاں اسی قدر کافی سمجھی جاتی ہیں

بعض الفاظ اہلِ زبان کی اعلیٰ کلچر کا ثبوت ہیں

بھنگی کی افادیت اور نفس کشی ظاہر ہے ۔ اس نے مہذب اور شائستہ جماعت میں مہتر اور حلال خور جمعدار اور پہلوان نام پائے ۔ نہایت ناکامیاب شخص کو بختاور اور کند ذہن اور نا سمجھ کو خوش فہم اور نحوست لانے والے کو سبھو قدم ۔ اندھے کو حافظ اور سورداس کہا گیا ۔ ایسے شخص کو جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ہر شخص کے تمسخر اور پھبتی کا شکار ہو ۔ نقلِ محفل کہا گیا ۔ بحث یا معاملے میں فریق مخالف کے نامعقول عذر کو عذرِ لنگ نام دیا گیا ۔ دہات کے رہنے والے کو اس کی حیثیت کی تمیز کئے بغیر چودھری کہتے ہیں ۔ اور کمہار کو بھگت جی ۔ اسی

نوع میں آتا ہے۔ سنگترے کو رنگترہ کہنا اور شراب کو رام رنگی کہنا

لفظ رسوم کا آئینہ دار

راجپوتوں میں رسم تھی۔ جب کوئی نہایت دشوار کام یا مہم پیش آتی تو سب سرداروں کو جمع کیا جاتا وہ ایک حلقہ باندھ کر بیٹھتے۔ بیچ میں پان کا ایک بیڑا رکھ دیا جاتا۔ اس کام کی مہمیں یا دقتیں وغیرہ جتائی جاتیں اور دعوت دی جاتی کہ جو رضا کاری کے طور پر اس کام کا ذمہ لے وہ سامنے آ جائے۔ جو شخص اس کام کا ذمہ لیتا وہ وہ اس بیڑے کو اٹھا لیتا اور اب بیڑا اٹھانے کے معنی قرار پائے کسی مشکل کام کے سرانجام کی ذمہ داری لینا مُردے کے پھول۔ جوہر (جیوہر) اور ساکھا وغیرہ اسی ذیل میں آتے ہیں:۔

لفظ کا اپنی اصل چھپانا

بعض لفظوں کی اصل دریافت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس خاندان کے وہ ظاہرا معلوم ہوتے ہیں حقیقت میں اس سے نہایت مختلف الاصل ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں مُقیش کو لیجئے۔ لغات میں اس کے معنی یہ دئے گئے ہیں:۔

مقیش ۔ ع ۔ وہ شے جس پر چاندی یا سونے کے چپٹے اور باریک تار لپٹے ہوں۔ چاندی کی چوڑی۔ چاندی کے تار۔

ہماری زبان میں محض چاندی یا سونے کے تاروں کو مقیش کہتے ہیں۔ یہ لفظ مقیش عربی نہیں۔ معرب تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی شکل اور صورت عربی زبان کی سی ہے۔ اردو لغات میں مقیش کو اردو لکھا ہے۔ وہ اردو

ہو عربی یا معرب - اس کی اصل چھپی ہوئی ہے - اس کا پتہ اپنے وجود سے ظاہر نہیں ہوتا - اسی کو میں اصل چھپانا کہتا ہوں۔

سنسکرت میں مکیش آفتاب کا نام ہے - اور کیش بالوں کو کہتے ہیں - دونوں لفظوں کے مرکب کے معنی ہوئے سورج کی کرن - جب مقیش کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹ کر ایک طرف سے ڈورے میں گوندھ دیتے ہیں اور پوشاک کے حاشئے پر باہر کو نکلا ہوا ٹانک دیتے ہیں - تو ساحلی کی اس چیز کو کہتے بھی کرن ہیں - یہ خفا اس وقت ہوتی ہے. جب ایک لفظ اپنے وطن سے باہر اور دور چلا جاتا ہے۔[1] سید مہدی کمال لکھنوی اس مقیش کو ہندی بتاتے ہیں۔

ایسا ہی ایک لفظ کتن ہے - اہل ہند نے سب سے پہلے روئی کات کر اس کا کپڑا بنایا - یہ کتن عرب میں جا کر قطن بنا اور یورپ میں جا کر کاٹن ۔

یہ تو ہوا لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا - کہ فوجی اور نیم فوجی ادنیٰ عہدے داروں کی وردی میں آستینوں پر جو خاص نشانات کپڑے کے کاٹ کر سی دیتے ہیں جن سے ان کی منصبی حیثیت معلوم ہوتی ہے اور جنھیں انگریزی میں بیج کہتے ہیں - اس بیج کا بلا کیونکر بن گیا ۔

---

[1] دستور الفصحا - صفحہ ۴۰

اُردو شاعری

پنڈت برج نرائن چکبست

اُردو شاعری کے فروغ کا آغاز اسلامی تہذیب کے اُنحطاط کے دور میں ہوا۔ جبکہ عیش پرستی و کاہلی نے ہمارے ہموطنوں کے خیالات و جذبات کی روحانی آگ کو قریب قریب ٹھنڈا کر دیا تھا۔ قومی زندگی کی نبض سُست ہو چکی تھی۔ جو کچھ بلند خیالی و وضعداری اور عالی حوصلگی کے جوہر باقی رہ گئے تھے۔ ان کی ہستی بجھتے ہوئے چراغوں کی روشنی سے زیادہ نہ تھی۔ تاہم اِس بد نصیبی کے دَور میں اُردو زبان کی خوش قسمتی سے چند ایسے باکمال پیدا ہو گئے ہیں جو شاعری اور زباندانی کے جوہر اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور جنکے دلوں میں اس قومی زوال کے زمانے میں بھی اپنے بزرگوں کی قدیم حمیت و تہذیب کا اثر باقی تھا۔ میرؔ و سوداؔ۔ آتشؔ و غالبؔ و انیسؔ نے اپنی شاعری سے جو چراغ روشن کیے انھیں زمانے کی ہوا پُورے طور سے گل نہیں کر سکی ہے۔ مگر باوجود ان قدرتی جوہروں کے زمانے کا رنگ ان کے کمال کا دشمن تھا۔ جس دُنیا میں وُہ رہتے تھے اس کے عام پسند خیالات و جذبات کے حلقوں میں ان کے دل و دماغ جکڑے ہوئے تھے۔ اکثر وہ ان بلند پا بندیوں

سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اپنی قومی تہذیب و تربیت کے محدود دائرے سے مجبور ہو جاتے تھے۔ شاید یہی خیال غالب کے دل کو ستا رہا تھا۔ جب اس نے یہ شعر کہا ہ

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کیلئے

یا میر انیس نے انھیں پابندیوں سے عاجز آکر مرثئے کا وسیع میدان تلاش کیا۔ لیکن باوجود ان امنگوں کے ہمارے قدیم شاعروں کے مذاق سخن کے آئینے پر بہت کچھ مصنوعی شاعری کا گرد و غبار جم گیا اور ان کا دامن اکثر غیر پاکیزہ خیالات و جذبات کے کانٹوں سے الجھ کر رہ گیا۔ اگر زمانہ کروٹ لیتا اور قومی زندگی میں شاعرانہ مذاق کی ترقی کا پہلو قائم رہتا تو بعد کی نسل قدیم شعراء کے جوہروں کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتی اور جو عیب ان کے کلام میں موجود تھے ان سے زبان و شاعری کو پاک کر دیتی۔ مگر دنیا دوسرے رنگ پر جا رہی تھی۔ نئی تہذیب کی اشاعت نے طبیعتوں کا رنگ کچھ اس طرح بدل دیا تھا۔ کہ صحیح مذاق سخن کا قائم ہونا دشوار تھا ؀

انگریزی تعلیم نے رفتہ رفتہ جو بیداری پیدا کی ہے اُسے بھول جانا قومی احسان فراموشی ہے۔ مگر اس کا ایک مرئی اثر ہمارے اخلاق پر بہت خراب پڑا شاید یہ تھا کہ تعلیم محض ذریعۂ معاش ہو گئی۔ علم و ادب کی تحصیل سے جو روحانی سرور کا سرمایہ دلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ وہ بالکل نظر انداز ہو گیا۔ اس زمانے

میں کثرت سے ایسے تعلیم یافتہ بزرگ ملیں گے۔ جنھیں اردو، فارسی، ہندی۔ انگریزی کے مذاقِ سخن سے ذرا بھی مس نہیں ہے۔ ان کی زندگی شاعرانہ لطافتوں کے اثر سے بالکل خالی ہے۔ تعلیم نے ان کی آنکھیں صرف اس قدر روشن کر دی ہیں کہ وہ کھوٹے کھرے روپے کو پرکھ سکیں۔ قومی مفلسی نے تعلیم کے اس تجارتی شوق پر تازیانہ کا کام کیا ہے۔ وہ لطیف جذبات و خیالات جن کا تازہ کرنا تعلیم کا اصل منشا ہے اور جن کی نشو و نما سے انسان دنیا کے گرد و غبار سے ہٹ کر روحانی لطافتوں کا حظ اٹھا سکتا ہے۔ روز بروز سرد ہوتے جاتے ہیں اس تجارتی تعلیم کے طوفان میں جبکہ شاعرانہ جذبات کی تربیت کی اصلاح کا راستہ بند ہو رہا ہے۔ مذاق سخن کی صحت کی اُمید رکھنا فضول ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا مذاقِ سخن صحیح و درست نہیں ہے۔ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات عموماً اردو۔ فارسی۔ ہندی۔ یا سنسکرت کی شاعری سے ناآشنا ہیں۔ اُنھوں نے اپنا مذاقِ سخن انگریزی نظم کے مطالعہ سے قائم کیا ہے۔ لیکن ان کے معیارِ سخن کا دار و مدار بہت کچھ انگریزی شاعری کی غلط تعبیر پر ہے۔ انگریزی نظم کے جس پہلو کا اثر اِن کے دماغ پر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق محض خیالات سے ہے۔ اِن کے دِل انگریزی نظم کے اِس لطیف پہلو سے پورے طور پر آشنا نہیں ہیں۔ جس کی بنیاد جذبات کی لطافت و نزاکت پر ہے۔ اور جو اصلی جزو شاعری ہے۔ انگریزی نظم اِن کے دماغ کو ضرور روشن کر دیتی ہے۔ مگر

ان کے دِلوں میں جذبات کی آگ نہیں بھڑکاتی۔ چنانچہ نئی تعلیم کے معصوم بندے یہ خیال کرنے لگے ہیں۔ کہ شاعری کی وقعت کا دار و مدار صرف خیالات کی بلندی و پاکیزگی پر ہے۔ انگریزی نظموں میں آزادی و حبِ الوطنی کے خیالات دیکھتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں۔ اُردو شاعری میں انھیں اس قسم کے خیالات کا پتہ نہیں ملتا۔ لہٰذا اس کے مطالعہ کا بار ان کی نگاہیں نہیں اٹھاسکتیں نفسِ شاعری کے جوہر لطیف کا زبان یا قلم کی مدد سے خاکہ کھینچنا دشوار ہے۔ یہ ویسا ہی ہے کہ سُریلی آواز کے سننے سے۔ دریا کی لہروں پر چاند کی روشنی دیکھنے سے انسان کے دل پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسکے بیان کرنے کی کوشش کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری و زبان کے جادو کی تشریح و تعریف زبان و قلم کے اختیار سے باہر ہے بقول شاعر؎

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو؟
زبان دِل کے لئے ہے نہ دل زبان کیلئے

مگر بادی النظر میں شاعری کے دو پہلو ہیں۔ ایک کا تعلق خیال سے ہے۔ دوسرے کا زبان سے۔ جس کو خیالات کا پیرہن یا لباس سمجھنا چاہیئے۔ خیالات کا اظہار پاکیزہ اور سلیس نثر میں بھی لطافت کیساتھ ہوتا ہے مگر شاعر کے خیالات دِلی جذبات کے رنگ میں ڈوبے ہوئے نکلتے ہیں اور زبان میں خاص تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ شاعرانہ خیالات کے پھولوں کی نشوونما محض دِماغ کی

پھلواڑی تک محدود نہیں رہتی۔ شاعر کے دلی جذبات کی برقی حرارت اِن پھولوں کا عطر کھینچ لیتی ہے۔ اِسی کا نام شاعرانہ لطافت ہے۔ اِس شاعرانہ لطافت و تاثیر کے عام کرنے کا ذریعہ شاعرانہ زبان ہے۔ شاعر بھی وہی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ جو اس کے ہم وطنوں کی زبان پہ ہوتے ہیں۔ مگر اُنھیں الفاظ کی اُلٹ پھیر سے اپنے بیان میں عالمِ تصویر پیدا کر دیتا ہے اور محض عالمِ تصویر ہی نہیں پیدا کر دیتا ہے۔ بلکہ اس کے الفاظ میں ایک راگ کی تصویر نمایاں ہو جاتی ہے۔ جو فنِ موسیقی کی راگ راگنی سے الگ ہے۔ اگر انگریزی شاعری کو اس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہمارے تعلیم یافتہ حضرات مغربی نظم کے پڑھنے سے دماغی حظ ضرور حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن نہ انداز کلام کی شاعرانہ لطافت اُنکے دِلوں میں برقی حرارت پیدا کرتی ہے نہ زبان کی مصوّری کا انھیں حس ہوتا ہے نہ الفاظ کا راگ ان کے کانوں کی فضا میں سماتا ہے۔ اِن کا دماغ بہ خوب پہچان لیتا ہے کہ کِس قِسم کے خیالات نظم کئے گئے ہیں۔ مگر اِن کا دِل جیسے خیالات کا ذخیرہ خیال کرنا چاہیئے۔ یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان خیالات کے ادا کرنے کا شاعرانہ انداز کیا ہے؟ اِن کے کان یہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر نے معمولی انداز میں کیا جادو بھر دیا ہے۔

ایسا ہونا ایک حد تک لازمی ہے جس زبان میں انگریزی شاعری ہے اس زبان کے الفاظ سے ہمارے کان قدرتی طور پر

سے بیزمانوس ہیں۔ ان کا قدرتی نغمہ ہمارے لئے خلق نہیں ہوا تھا۔ جس تہذیب کے عالم میں مغربی شاعروں کے رنج وراحت کے جذبات نے نشو و نما پائی ہے۔ ہماری سوسائٹی کی دنیا اس سے دور اور الگ ہے۔ مغربی دنیا کے قدیم مذہبی اور قومی کارنامے جو وہاں کے سورماؤں اور پیغمبران دین کی ذات کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن کی بدولت وہاں کے اکثر دریا۔ پہاڑ یا اکثر قدرتی منظر قومی شاعری کے سرمایۂ ناز ہو گئے ہیں۔ ہمارے دلوں میں تاثیر کی گرمی نہیں پیدا کر سکتے۔ ایسی حالت میں مغربی نظم کے اصلی شاعرانہ پہلو کا اندازہ کرنا جس کا تعلق خاص جذبات سے ہے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔

ممکن ہے چند ایسے ارباب وطن ہوں جنھوں نے انگلستان کی بود و باش کی وجہ سے اور قدرتی ذہانت کے صدقہ میں مغربی سوسائٹی کے قومی و مذہبی خیالات و جذبات کا رنگ پورے طور سے پہچان لیا ہو۔ اور جنھوں نے انگریزی زبان پر ایسا عبور حاصل کر لیا ہو کہ انھیں اس ساز کے تمام پردوں سے واقفیت حاصل ہو گئی ہو۔ ایسے حضرات انگریزی نظم کی شاعرانہ لطافت سے ضرور حظ اٹھا سکتے ہیں مگر عام طور سے شکسپیر و ملٹن کی جو ثنا و صفت انگریزی داں نوجوانوں کی زبان سے سننے میں آتی ہے وہ بہت کچھ فرہنگوں کی بدولت ہوا کرتی ہے۔ میر تقی میر جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو یہاں کے چند بزرگ اُن سے ملنے گئے اور کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میر صاحب نے کہا کہ آپ حضرات میرا

کلام سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ بیچارے اپنا طیش ضبط نہ کر سکے اور کہہ اُٹھے کہ جناب ہم فردوسی اور نظامی کے کلام سمجھ سکتے ہیں مگر آپ کا کلام ایسا ہے کہ اس کی قدردانی ہمارے اختیار سے باہر ہے۔ میر صاحب نے جواب دیا کہ فردوسی اور نظامی کے کلام کی فرہنگیں چھپ گئی ہیں۔ مگر میرے کلام کی ابھی کوئی فرہنگ نہیں چھپی ہے۔ اس لیے آپ اس کی خوبی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

عام طور سے انگریزی قدردانوں کی حالت اس سے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ وہ فرہنگ کے مطالعہ سے شیکسپیر کے کلام پر وجد کرنا سیکھ لیں۔ مگر وہ اس قدردانی کے جذبہ کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جس نے کارلائل کو یہ لکھنے پر مجبور کیا کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کی سلطنت زیادہ عزیز ہے کہ شیکسپیر؟ تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ چاہے ہندوستان کی سلطنت نکل جائے مگر انگریزی قوم شیکسپیر کا دامن نہیں چھوڑ سکتی۔

کیا یہ خامی ہمارے لئے باعث شرم نہیں ہے؟ کوئی انگریز کتنا ہی ہندی زبان سے واقف کیوں نہ ہو مگر تلسی داس کی شاعری کا اثر و نغمہ اس کے دل میں وہ کیفیت پیدا نہیں کر سکتا۔ جس کا لطف اَن پڑھ ہندو رامائن میں ذوق مزہ اٹھاتے ہیں۔ غیر ملک کا باشندہ تلسی داس کے خیالات کی بلندی و پاکیزگی کی داد دے سکتا ہے۔ مگر زبان و شاعری کے جوہروں کو نہیں پرکھ سکتا۔ نہ ان جذبات کی تاثیر قبول کر سکتا ہے۔ جو ہندوؤں کی قومی تہذیب کے

ٹکسالی سکتے ہیں۔ اس قدر خامی کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ جس حالت میں ہم اپنی مادری زبان کی شاعری سے حظ نہیں اُٹھا سکتے۔ ہمارے لئے کسی غیر زبان کے مذاق سخن کی قدر شناسی سخت دُشوار ہے۔ شاعری سے حظ اٹھانے کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا تو انسان کے دل میں قدرتی طور سے شاعرانہ مذاق کا جوہر موجود ہو یا اس کے جذبات کی تربیت و اصلاح سے اس کی طبیعت میں سخن فہمی کا سلیقہ پیدا ہو گیا ہو۔ شاعرانہ لطافت و نزاکت کا حظ حاصل کرنے کے لیے محض دماغی تربیت کافی نہیں ہے ممکن ہے۔ کہ انسان کا دماغ فلسفہ اور منطق کے نور سے آئینہ ہو۔ مگر شاعرانہ مذاق کے جوہر سے خالی ہو۔ خیالات اور زبان کی شاعرانہ لطافت کا اثر قبول کرنے کے لیے انسان کی ہستی کے اس جزو لطیف کے نشوونما کی ضرورت ہے جس کا تعلق جذبات سے ہے۔ جس طرح فلسفہ و ریاضی کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے خاص قسم کی دماغی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح طبیعت میں شاعرانہ مذاق سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے فطرتی جذبات کی اصلاح و تربیت لازمی ہے۔ اپنی زبان کی شاعری کے مطالعہ سے اس قسم کی اصلاح و تربیت کا سرانجام آسانی سے ہو سکتا ہے مادری زبان کے الفاظ کا نغمہ کانوں میں بلا تکلف گھر کر لیتا ہے اور قومی شاعروں کے کلام میں رنج و راحت کے جذبات کے نشتر موجود ہیں وہ دل میں چبھ جاتے ہیں اور دبی ہوئی امنگوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ اسی کا نام

شاعرانہ تربیت ہے اگر کوئی شخص چاہے۔ کہ بغیر اس تربیت کے محض غیر زبان کی فرہنگوں میں نفس شاعری کے متعلق مضامین پڑھ کر صحیح مذاقِ سخن قائم کر لے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے ؛

افسوس ہے تو اس قدر کہ یہ خوش قسمتی ہمارے حصہ میں نہیں آئی۔ ہمارے تعلیم یافتہ عزیزانِ وطن نے اپنی زبان و شاعری سے بے خبر رہ کر انگریزی شاعری کا جو غیر صحیح اندازہ کیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا مذاق سخن بگڑ گیا۔ ہمیں اپنی قدیم شاعری کے قابل قدر ذخیرے سے شرم آنے لگی اور نئی شاعری کے نقیب سے جس طرز کلام کی بنیاد پڑی۔ اس کی وقعت نثر کا نظم سے زیادہ نہ تھی۔ یہ خیال عالمگیر ہو گیا کہ محض بلند و پاکیزہ خیالات کا بُرے بھلے الفاظ میں نظم کر دینا معراج شاعری ہے۔ جذبات کی لطافت کا خیال نظر انداز ہو گیا۔ زبان کے نغمے سے کان نا آشنا ہو گئے۔ محض تنگے بوچے خیالات کی تصویریں کاغذ کے صفحوں پہ نظر آنے لگیں ؛

اُردو زبان پہ مولانا حالی کا جو احسان ہے۔ اس کی یاد دلوں میں تازہ رہے گی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے۔ جنھوں نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اُردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہئے اور یہ معمولی بات نہ تھی مگر اپنے انگریزی دان احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اُردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اس عیب سے

خالی نہ تھا۔ جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مولانا کی ایک رباعی اس وقت تمثیلاً یاد آ گئی۔ ؎

ہے دھونے کی اسے رفا مرجا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے کپڑے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

جو خیال ان دونوں شعروں میں نظم کیا گیا ہے۔ وہ نہایت اعلیٰ درجے کا اصولِ اصلاح ظاہر کرتا ہے مگر اظہارِ خیال کا طریقہ شاعرانہ نہیں ہے۔ اور اگر پاکیزہ و سلیس نثر میں یہ خیال ادا کیا جائے۔ تو اس نظم سے زیادہ دلکش ثابت ہوگا۔

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ مولانا حالی نے اردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصولِ اصلاح کو مدِنظر نہیں رکھا۔ اردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبے تھے انھیں اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبے باقی رہے نہ دامن کا ایک تار باقی رہا۔

قدیم اردو شعرا کے کلام میں بہتیرے ایسے خیالات ملیں گے۔ جنھیں موجودہ زمانے کا مذاق قبول نہیں کرسکتا یا موجودہ معیار کے مطابق پایہ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آ کر ہمیں ان کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہیئے۔ اور یہ خیال نہ کرنا

چاہیئے۔ کہ محض پند و نصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اردو شاعروں کے خیالات بلند نہ ہوں۔ مگر اِن کا اندازِ سخن شاعرانہ ہے۔ اِن کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہیں اِن میں اِن کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے۔ یہی شاعری ہے۔

اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقعت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا تو اِن کی شاعری کا قصور نہ تھا۔ بلکہ اپنی قومی بے خبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی۔ وہاں انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاقِ سخن بھی اُلٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آیندہ اصلاح و ترقی کے لیئے قدیم شعراء کے اندازِ سخن اور رنگِ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لیئے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ جس غیر صحیح مذاقِ سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگِ سخن کی قدر نہ کر سکے۔ اس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے۔

رقعات
مرزا اسد اللہ خان غالب
منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

(۱)

صاحب تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ اور کیا واقع ہوا۔ وہ ایک جنم تھا۔ کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے۔ اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملات مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے۔ دیوان جمع کئے۔ اسی زمانہ میں ایک بزرگ تھے۔ کہ ہمارے تمہارے دوست دلی تھے۔ اور منشی نبی بخش ان کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا۔ نہ وہ اشخاص نہ وہ معاملات نہ وہ اختلاط نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہ مثل پہلے جنم کے ہے یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا۔ اس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمہارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہ ہو۔ آج

کیا۔ اور میں جس شہر میں رہتا ہوں اس کا نام دلی
اور محلے کا نام بلی ماروں کا محلہ ہے۔ لیکن ایک
دوست اس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا
واللہ ڈھونڈنے کو ایک مسلمان اس شہر میں نہیں
ملتا۔ کیا غریب کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں۔ تو باہر
کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔ اب
پوچھو کہ کیونکر۔ مسکن قدیم میں بیٹھا رہا۔
صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے
مکان میں نو دس برس سے کرایہ پر رہتا ہوں۔
اور یہاں قریب کیا دیوار بدیوار ہیں۔ گھر حکیموں
کے۔ اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والئ
پٹیالہ کے۔ راجہ صاحبان عالی شان سے عہد لے
لیا تھا کہ بر وقت غارت دلی یہ لوگ بچ رہیں
چنانچہ بعد فتح راجہ کے سپاہی یہاں آ بیٹھے۔ اور
یہ کوچہ محفوظ رہا۔ ورنہ میں کہاں اور یہ شہر
کہاں۔ مبالغہ نہ جاننا۔ امیر غریب سب نکل
گئے۔ جو رہ گئے وہ نکالے گئے۔ جاگیردار
پنشن دار۔ دولت مند۔ اہل حرفہ کوئی بھی نہیں
ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان
قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس و دار و گیر
میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ نوکر اس ہنگام میں نوکر
ہوئے اور ہنگامہ میں شریک ہوئے ہیں۔ میں
غریب شاعر دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر

کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں - خواہ اس کو
نوکری سمجھو - خواہ مزدوری جانو - اس فتنہ و آشوب
میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا - صرف
اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا - اور نظر اپنی بے گناہی
پر شہر سے نکل نہیں گیا - میرا شہر میں ہونا حکام
کو معلوم ہے - مگر میری طرف بادشاہی دفتر میں
سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات نہیں گئی
لہذا طلبی نہیں ہوئی - ورنہ جہاں بڑے بڑے
جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئیں۔
وہاں میری کیا حقیقت تھی - غرضکہ اپنے مکان
میں بیٹھا ہوں - دروازے سے نہیں نکل سکتا
سوار ہونا اور کہیں جانا بڑی بات ہے - رہا یہ
کہ کوئی میرے پاس آئے - شہر میں ہے کون
جو گھر میں آوے - گھر کے گھر بے چراغ
پڑے ہیں - مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں
جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک
یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بدستور ہے - کچھ
نیک و بد کا حال مجھے معلوم نہیں - بلکہ ہنوز ایسے
امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں - دیکھئے انجام
کار کیا ہوتا ہے - یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر
ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا - تم زنہار
یہاں کا ارادہ نہ کرنا - دیکھا چاہئے کہ مسلمانوں
کی آبادی کا حکم ہوتا ہے - یا نہیں - بہر حال منشی

صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا
اس وقت تمہارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے
یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا ۞

۱۴۲

کیوں صاحب مجھ سے کیوں خفا ہو۔ آج مہینہ
بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائیگا
کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر
الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے
پاس دو چار دوست نہ بیٹھے ہوں۔ اب یاروں
میں شیو جی رام برہمن اور بالمکند اس کا بیٹا۔ یہ دو
شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گذر
کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع
سے خطوط آتے رہتے تھے۔ ان دوستوں کا
حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔
وہ آمد خطوط کی موقوف۔ میرٹھ تین صاحبوں
کے آنے کی توقع۔ اس میں دو دونوں صاحب
گاہ گاہ۔ ایک تم ہو کہ ہر مہینہ میں ایک دو بار
مہربانی کرتے ہو۔ سنو صاحب اب یہ اور لازم
کرو۔ ہر مہینے ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام
آ پڑا تو دو خط تین خط۔ ورنہ صرف خیر و عافیت
لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔ بھائی
صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوگئے کہ آیا تھا۔
اس کا جواب بھیج دیا گیا ۞

مولوی قمر الدین خان یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔ بہر حال اگر آپ آزردہ نہیں۔ تو جس دن میرا خط پہنچے۔ اس کے دوسرے دن اس کا جواب لکھیے۔ اپنی خیر و عافیت منشی صاحب کی خیر و عافیت۔ مولوی صاحب کا احوال اس کے سوا گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظ مناسب وقت میں ضرور لکھنا۔ راجہ جو وہاں آیا ہوا ہے۔ اس کی حقیقت۔ دھولپور کا ملک صاحبان عالی شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا کیا حال ہے وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں۔

غالب شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

(۱۳۸)

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں۔ یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو ایک دو شام کو میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور

جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے یہ کیا سبب دس دس
بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا - یعنی تم نہیں آئے
خط لکھو صاحب نہ لکھنے کی وجہ لکھو - آدھ آنے
میں بخل نہ کرو - ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو -

غالب سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۴۴)

دیکھو صاحب! یہ باتیں ہمیں پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے
کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو - اور مزا
یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو یہ کہو گے کہ میں
نے دوسرے ہی دن تو جواب لکھا ہے - لطف اس
میں یہ ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے ۔

آج تک راۓ امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی
نہیں جائیں گے - تمہارا مدعا حاصل ہو گیا ہے - جس
دن وہ آئے تھے - اسی دن مجھ سے کہہ گئے تھے
اور میں بھول گیا اور اس خط میں تم کو نہ لکھا صاحب!
وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کئی ایک مجلد مرزا تفتہ
کے دیوان کے اور کئی نسخے تضمین اشعارِ گلستان کے
ان کی خواہش کے بموجب کوئی پارسی ہے - بمبئی میں
اس کے پاس بھیجدئے ہیں - یقین ہے کہ وہ ایران کو
ارسال کرے گا - امید سنگھ نے اس پارسی کا نام بھی لیا
تھا میں بھول گیا - اب جو تم کو اس خیال میں مبتلا پایا تو
ان کا بیان مجھ کو یاد آیا جانتا ہوں کہ یہاں کہاں رہتے
ہیں - دوبارہ ان کے گھر گیا بھی ہوں مگر محلے کا نام نہیں

جانتا۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔ میر بادشاہ صاحب سے عند الملاقات میری دعا کہہ دینا۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفدا تخلص کہ میں نے آگے ان کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ ناگاہ مجھ سے آکر ملے۔ تمہارا حال پوچھتے رہے۔ میں نے کہہ دیا کہ بخیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ کیا وہ تمہارے آشنا ہیں؟ اُنھوں نے کہا "صاحب وہ بزرگ اور اُستاد ہیں۔ میں اُن کا شاگرد ہوں۔" کہیں میرٹھ کے علاقے میں نوکر ہیں۔ بسبیل ڈاک آئے تھے اور آج ہی بسبیل ڈاک انبالہ کو گئے۔ انبالہ ان کا وطن ہے۔ اور نوکر بھی اِسی ضلع میں ہیں۔

غالبؔ۔ نگاشتہ دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء

(۵)

برخوردار مرزا تفتہ۔ دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم اچھے اور ہم مفقود۔ اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن داران ماہ بماہ نہ پائیں۔ سال میں دو بار بطریق ششماہ فصل بفصل پایا کریں۔ ناچار ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تاکہ مدام بھر کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھ مہینے تک اسی طرح گنواں دینا پڑے گا۔ ایک معقول رقم گھاٹے میں جائے گی۔

رحم ہے مُردے کی چھاتی ایک خلق کا ہے اس خلق پر مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

دس گیارہ برس سے اس تنگنائے میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بماہ چار روپے دیا کیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپے یکمشت دیا گیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے۔ اُس نے مجھ سے پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو میں اُٹھوں۔ سید دیدہ نے مجھ کو عاجز کیا اور مار مار لگا دی۔ وہ صحن پاخانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول۔ اس میں پاٹ بچھ گئی۔ رات کو وہیں سو رہا۔ گرمی کی شدت۔ پاٹ پر کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ کلکتہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزاریں۔ دوشنبہ کو بھائی کو ایک مکان ہاتھ آ گیا۔ وہاں جا رہا۔ جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اس مکان کے بہشت ہے۔ اور یہ خوبی ہے کہ محلہ وہی بلّی ماروں کا۔ اگرچہ یہ ہوں کہ اگر یہیں اور مرتے ہیں جا رہتا تو تا صدان ڈاک وہیں پہنچتے۔ یعنی اب اکثر خطوط الاں کنوئیں کے پیچ سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہونچتے ہیں۔ بہر حال تم وہی بلّی ماروں کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ وہ مسودہ تمہارے اور ایک میر صاحب کا یہ تین کاغذ دھرے ہیں۔ وہ ایک دن میں بعد اصلاح ارسال کیے جائیں گے۔

خاطر عاطر جمع رہے۔ صبح جمعہ ۲ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء غالب

(۱۲۳)

مرزا تفتہ جو کچھ تم نے لکھا۔ یہ جملہ دردمندی ہے۔ اور بدگمانی۔ معاذ اللہ تم سے اور آزردگی۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ تمام ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں۔ جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم کون سی ایسی بات لکھو گے کہ موجب ملال ہو۔ رہا غماز کا کہنا۔ اس کا حال یہ ہے۔ کہ میرا حقیقی بھائی کل ایک تھا وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا۔ مثلاً جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمہاری برائی کرتا تو میں اس کو جھڑک دیتا اور اس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی اب مجھ میں کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گذر گئی۔ لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمہاری پختہ ہو گئی۔ خاطر میری جمع ہے۔ کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤ گے۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں۔ بکار آمدنی نہیں۔ خیر کبھی دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے تین بات جمع ہوئیں۔ میری کاہلی۔ تمہارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا۔ کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظر ان مراتب پر کاغذ پڑے

رہے - لالہ بالمکند بے صبر کا ایک پارسل ہے - کہ
اس کو بہت دن ہوئے آج تک سرنامہ بھی
نہیں کھولا - نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں
پڑی ہوئی ہیں ؎

شعر نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمہارا کل آیا - آج اس وقت کہ سورج
بلند نہ ہوا - اس کو دیکھا اور لفافہ کیا - آدمی کے
ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا - غالب ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء

(کہ)

میرے مہربان - میری جان - میرزا تفتہ سخندان تمہارا
سکندرہ آباد ہونا اور میرے خط کا تمہارے پاس
پہنچنا تمہاری تحریر سے معلوم ہوا - زندہ رہو اور خوش
رہو - میں شعر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا
بھیک مانگنے آیا ہوں - روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا
سرکار سے ملتی ہے - وقت رخصت میری قسمت اور
منعم کی ہمت - نواب صاحب از روی صورت روح
مجسم اور با اعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں - خزانہ فیض
کے تحویلدار ہیں - جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا
ہے - اس کے ملنے میں دیر نہیں لگتی - ایک لاکھ کئی
ہزار روپیہ سال غلہ کا محصول معاف کر دیا - ایک اہلکار
پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا - اور بیس ہزار روپیہ
نقد دیا - منشی نول کشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی -

خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پہ نہیں کھلی۔ بھائی مصطفیٰ خاں صاحب بتقریب تہنیت مسند نشینی و شمول جشن آنے والے ہیں۔ اس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع۔ ۵ دسمبر کو خلعت کا مسموع۔

نجات کا طالب غالبؔ۔ دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء

(۸)

دیکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی سے معاف
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور پہلے تم کو یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں مرزا حاتم علی مہر کی جناب میں میرا سلام کہنا اور میرا شعر میری زبان سے پڑھنا۔

شرطِ اسلام بود ورزش ایمان بالغیب
اے تو غائب زِ نظر مہر تو ایمان من است

تمہارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔ سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو اور وہ اس میں بے تکلف عمر بسر کرے۔ اس کا نام عیش ہے۔ تمہاری توجہ مفرط بطرفِ شعر و سخن تمہاری

شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے اور بھائی یہ جو تمھاری حق گستری ہے اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا۔ مگر ہاں اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے۔ سو گاہ گاہ جب دل الٹنے لگتا ہے۔ تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں۔ ؎

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اس کا بیان تو معلوم۔ مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ انگریز کی قوم میں سے جو ان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز کچھ دوست۔ کچھ شاگرد۔ کچھ پیارے۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے۔ جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو اس کی

زینت کچھ کہہ نہ دو شوالہ ہو۔ ہائے ہائے اتنے پالے
مرے کہ جو اب بچہ مرے گا تو پھر کوئی رونے
والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

جیل سے لکھا ہوا ایک مکتوب

مولانا ابوالکلام آزاد

قلعہ احمد نگر

۱۵ر اگست ۴۲ء

مارا زبانِ شکوہ ز بیدادِ چرخ نیست
از ما خطے بہ مہرِ خموشی گرفتہ اند

صدیق مکرم — وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے۔ صراحی لبریز ہے۔ اور جام آمادہ۔ ایک دور ختم کر چکا ہوں۔ دوسرے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا ہوں ۔

درین زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مےِ ناب و سفینۂ غزل است
جریدہ رو کہ گذرگاہِ عافیت تنگ است
پیالہ گیر کہ عمرِ عزیز بے بدل است

طبیعت وقت کی کشاکش سے یک قلم فارغ اور دل فکر احوال سے بکلی آسودہ ہے۔ اپنی حالت دیکھتا ہوں۔ تو وہ عالم دکھائی دیتا ہے۔ جس کی خبر خواجۂ شیراز نے چھ سو سال پہلے دے دی تھی۔ زندگی کے چالیس سال طرح طرح کی کاوشوں میں بسر ہو گئے

مگر اب دیکھا تو معلوم ہوا کہ ساری کاوشوں کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کہ صبح کا جانفزا وقت ہو اور چین کی بہترین چائے کا پے در پے فنجان سے

چل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت
تدبیر ما بہ دست شراب دو سالہ بود

آج تین بجے سے کچھ پہلے آنکھ کھل گئی تھی صحن میں نکلا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ صرف احاطہ کے باہر سے پہرہ دار کی گشت و بازگشت کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہاں رات کو احاطہ کے اندر وارڈوں کا تین تین گھنٹے کا پہرہ لگا کرتا ہے۔ مگر بہت کم جاگتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی سامنے کے برآمدے میں ایک وارڈ کمبل بچھائے لیٹا تھا اور زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ بے اختیار مومن خان کا شعر یاد آگیا سے

ہے اعتماد مرے بخت خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لئے

زندانیوں کے اس قافلے میں کوئی نہیں۔ جو سحر خیزی کے معاملے میں میرا شریک حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں سے

دائم گلے بقافلہ بودہ ست پاسباں
بیدار شو کہ چشم رفیقاں بخواب شد

سوچتا ہوں۔ تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملے میں بھی ساری دنیا سے اُلٹی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے لیے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا۔ وہی میرے لیے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ خواب شیریں کے مزے لیں۔ میں اس لیے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداریوں کی تلخ کامیوں سے لذت یاب ہوتا رہوں ؎

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
ویں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا۔ کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ جب وہ جاگتی ہے تو میں سو رہتا ہوں جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ ع

خواب غفلت ہمہ را بردہ و بیدار یکے است

خلائق کے کتنے ہی ہجوم میں ہوں۔ لیکن اپنا وقت صاف بچا لیتا ہوں۔ کیونکہ میری اس خلوت در انجمن پر کوئی ہاتھ ڈال ہی نہیں سکتا۔ میرے عیش و طرب کی بزم اس وقت آراستہ ہوتی ہے جب نہ کوئی آنکھ دیکھنے والی ہوتی ہے نہ کوئی کان سننے والا۔ رضی دانش نے میری زبان سے کہا تھا ؎

خوش زمزمۂ گوشۂ تنہائی خویشم
از جوش و خروش تگ و بلبل خرم نیست

ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دِل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی - صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے اس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں - راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں ؎

ازاں بہ دیر مغانم عزیز می دارند
کہ آتشے کہ نہ میرا ہمیشہ در دل ماست

دِن بھر اگر سوز و تپش کا سامان نہ بھی ملے - جب بھی چولہے کے ٹھنڈے پڑ جانے کا اندیشہ نہ رہا - عرفی کیا خوب بات کہہ گیا ہے ؎

سینہ گرم نہ داری مطلب صحبت عشق
آتشے نیست چو در مجمرہ ات، عود مخر

اس سحر خیزی کے لئے والد مرحوم کا منت گزار ہوں - اِن کا معمول تھا - کہ رات کی پچھلی پہر ہمیشہ بیداری میں بسر کرتے - بیماری کی حالت بھی اِس معمول میں فرق نہیں ڈال سکتی تھی - فرمایا کرتے تھے کہ رات کو جلد سونا اور صبح جلد اُٹھنا - زندگی کی سعادت کی پہلی علامت ہے - اپنی طالب علمی کے حالات سناتے کہ دہلی میں مفتی صدر الدین مرحوم سے صبح کی سنت و فرض کے درمیان سبق لیا کرتا تھا - اور اِس امتیاز پہ نازاں رہتا تھا کیونکہ وہ چاہتے

تھے۔ مجھے خصوصیت کے ساتھ اَوروں سے علیحدہ سبق دیں اور اِس کے لئے صرف وہی وقت نکل سکتا تھا۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ فیض مجھے نانا رکن المدرسین سے ملا۔ اور وہ بھی شاہ عبدالعزیز سے علی الصباح سبق لیا کرتے تھے۔ اور پچھلی پہر سے اٹھ کر اس کی طیاری میں لگ جاتے تھے۔ پھر خواجہ شیراز کا یہ مقطع ذوق لے لے کر پڑھتے ؎

مرد بخواب کہ حافظ بہ بارگاہِ قبول
ز وردِ نیم شب و درسِ صبح گاہ رسید

میری ابھی دس بارہ برس کی عمر ہوگی کہ یہ باتیں کام کر گئیں تھیں۔ بچپنے کی نیند سر پہ سوار رہتی تھی۔ مگر اس سے لڑتا رہتا۔ صبح اندھیرے میں اُٹھتا اور شمعدان روشن کر کے اپنا سبق یاد کرتا۔ بہتوں سے منتیں کیا کرتا تھا کہ صبح آنکھ کھلے تو مجھے جگا دینا۔ وہ کہتی تھی یہ نئی شرارت کیا سوجھی ہے اس خیال سے کہ میری صحت کو نقصان نہ پہنچے۔ والد مرحوم روکتے۔ لیکن مجھے کچھ ایسا شوق بڑھ گیا کہ جس دن دیر سے آنکھ کھلتی دن بھر پریشان سا رہتا۔ آنے والی زندگی میں جو معاملات پیش آنے والے تھے۔ یہ اُن سے میرا پہلا سابقہ تھا۔

یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور عالم تنہائی کی خلوت اندوزیوں کا پورا پورا لطف اٹھا رہا ہوں گویا سادگی

دنیا میں اس وقت میرے سوا اور کوئی نہیں بستا۔ کہہ نہیں سکتا۔ تنہائی کا یہ احساس میری طبع خلوت پرست کی جولانیوں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا کرتا ہے۔ بیدل کی خیال بندیوں کا غلو بے کیف ہو۔ لیکن اس کی بحر طویل کی بعض غزلیں کیفیت سے خالی نہیں ہیں ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہ ہائے نجستہ بو مپسند زحمت جستجو
بخیال حلقۂ زلف او گرہے خورد بہ ختن درآ

پانچ بجے سے قلعے میں ٹینکوں کے چلانے کی مشق شروع ہوتی ہے اور گھر گھر کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ مگر اس میں ابھی دیر ہے۔ چار بجے دودھ کی لاری آتی ہے اور چند لمحوں کے لئے صبح کا سکون ہنگامہ سے بدل دیتی ہے۔ وہ ابھی چند منٹ ہوئے آئی تھی اور واپس گئی۔ اگر اس وقت کے سناٹے میں کوئی آواز مخل ہو رہی ہے۔ تو وہ صرف چند نوجوانوں کے ہلکے خراٹوں کی آواز ہے وہ ہمسایہ میں سو رہے ہیں۔ صرف لکڑی کا ایک پردہ حائل ہے۔ خراٹے جب تھمتے ہیں تو حسبِ معمول نیند میں بڑبڑانے لگتے ہیں۔ یہ بڑبڑانا ہمیشہ انگریزی میں ہوتا ہے۔ ؏

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

مؤتمن الدولہ اسحاق خان شوستری محمد شاہی امرا میں سے تھا - اس کا ایک مطلع آپ نے تذکروں میں دیکھا ہوگا - ضلع جگت کی صنعت گری کے سوا کچھ نہیں ہے - مگر جب کبھی جواہر لال کو انگریزی میں بڑبڑاتے سنتا ہوں تو بے اختیار یاد آ جاتا ہے ؎

زبسکہ در دلِ تنگم خیال آں گل بود
نفیرِ خوابِ من امشب صفیرِ بلبل بود

یہ نیند میں بڑبڑانے کی حالت بھی عجیب ہے۔ یہ عموماً انہی طبیعتوں پر طاری ہوتی ہے - جن میں دماغ سے زیادہ جذبات کام کرتے ہیں جواہر لال کی طبیعت بھی سرتاپا جذباتی واقع ہوئی ہے - اس لئے خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں جذبات کام کرتے رہتے ہیں ؂

یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ سے زیادہ ہو گیا ہے - فوجی صیغہ نے ہمارا چارج لے لیا داخلہ کے وقت فہرست سے مقابلہ کر لیا ہماری حفاظت کا اور دنیا سے بے تعلقی کا جس قدر بندوبست کیا جا سکتا تھا وہ بھی کر لیا - لیکن اس سے زیادہ انھیں ہمارے معاملات سے کوئی سروکار معلوم نہیں ہوتا - اندر کا تمام انتظام گورنمنٹ بمبئی کے ہوم ڈیپارٹمنٹ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور اصلی

رشتہ کار مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے۔

ہمیں یہاں رکھنے کے لئے جو ابتدائی انتظام کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ گرفتاری سے ایک دِن پہلے یعنی ۸ر اگست کو یاروڈا سنٹرل جیل پُونا سے ایک سینیر جیلر یہاں بھیجدیا گیا۔ اس جیل کے وارڈرز اور پندرہ قیدی کام کاج کے لئے اس کے ساتھ آ گئے۔ جیلر کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کیا صورتِ حال پیش آنے والی ہے۔ صرف اتنی بات بتلائی گئی تھی کہ ایک ڈی ٹینشن کیمپ (DETENTION CAMP) کھل رہا ہے۔ چند دِنوں کے لئے دیکھ بھال کرنی ہو گی۔ ہم پہنچے تو معاملہ ایک دوسری ہی شکل میں نمایاں ہوا۔ اور بیچارا سراسیمہ ہو کر رہ گیا۔ چونکہ میں نے یہاں آتے ہی اپنا غصّہ اس غریب پر نکالا تھا اس لئے کئی دن مُنہ چھپائے پھرتا رہا۔ جب اور کچھ نہ بنتی تو ضلع کے کلکٹر کے پاس دَوڑا ہوا جاتا۔ اور وہ اس سے زیادہ بےخبر تھا ع

در ہر کس کہ زدم بیخبر و غافل بود

دوسرے دن کلکٹر اور سِول سرجن آئے اور معذرت کر کے چلے گئے۔ سِول سرجن ہر شخص کا سینہ ٹھوک بجا کے دیکھتا رہا کہ کیا آواز نِکلتی ہے؟ معلوم نہیں پھیپھڑوں کی حالت معلوم کرنی چاہتا تھا۔ یا دِلوں کی۔ مجھ سے بھی معاً منہ

کی درخواست کی - میں نے کہا میرا سینہ دیکھنا بے سود ہے - اگر دماغ کے دیکھنے کا کوئی آلہ ساتھ ہے تو اُسے کام میں لائیے ؎

بگزر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر است

بہر حال چوتھے دن انسپکٹر جنرل آف پریزن آیا اور گورنمنٹ کے احکام کا پرچہ جو اسے کہا کسی سے ملاقات نہیں کی جا سکتی - کسی سے خط و کتابت نہیں کی جا سکتی - کوئی اخبار نہیں آ سکتا - ان باتوں کے علاوہ اگر کسی اور بات کی شکایت ہو - تو گورنمنٹ اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہے

اب اِن باتوں کے بعد اور کون سی بات رہ گئی تھی جس کی شکایت کی جاتی اور حکومت از راہ عنایت اسے دُور کر دیتی ؎

زبان جلائی گئے قطع ہاتھ پہنچوں سے
یہ بندوبست ہوئے ہیں مری دُعا کے لئے

انسپکٹر جنرل نے کہا اگر آپ کتابیں یا اور کوئی سامان گھر سے منگوانا چاہیں تو اِن کی فہرست لکھ کر مجھے دے دیں - گورنمنٹ اپنے طور پر منگوا کر آپ کو پہنچا دے گی - چونکہ گرفتاری سفر کی حالت میں ہوئی تھی - اس لئے میرے پاس دو کتابوں کے سوا جو راہ میں دیکھنے کے لئے ساتھ رکھ لی تھیں مطالعہ کا کوئی سامان نہ تھا - خیال ہوا اگر

مکان سے بعض سامان اور کچھ کتابیں آجائیں تو قید و بند کی یہ فرصت کام میں لائی جائے۔ بظاہر اس خواہش میں کوئی بُرائی معلوم نہیں ہوئی دنیا را بہ اُمید خوردہ اند۔ آرزو عیب نہ دارد ؎

نقاب چہرۂ اُمید باشد گردِ نومیدی
غبار دیدۂ یعقوب آخر توتیا گردد

میں نے مطلوبہ اشیاء کا ایک پرچہ لکھ کر اس کے حوالے کیا۔ اور وہ چلا گیا۔ لیکن اِس کے جانے کے بعد جب صورتِ حال پر زیادہ غور کرنے کا موقع مِلا۔ تو طبیعت میں ایک خلش سی محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی دراصل طبیعت کی ایک کمزوری تھی۔ حکومت کی اس رعایت سے فائدہ اٹھانے پر راضی ہو گئی۔ جب عزیز و اقربا سے بھی مِلنے اور خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جس کا حق مجرموں اور قاتلوں تک سے چھینا نہیں جاتا تو پھر یہ توقع کیوں رکھی جائے۔ کہ وہی حکومت گھر سے سامان منگوا کر فراہم کر دے گی۔ ایسی حالت میں عزت نفس کا تقاضا صرف یہی ہو سکتا ہے کہ نہ تو کوئی آرزو کی جائے نہ کوئی توقع رکھی جائے ؎

ز تیغ بے نیازی تا توانی قطع منتی کن
فلک تا افگند از پا ترا خود پیش دستی کن

میں نے دوسرے ہی دن انسپکٹر جنرل کو خط لکھ دیا

کہ فہرست کا پرچہ واپس کر دیا جائے۔ جب تک گورنمنٹ کا موجودہ طرزِ عمل قائم ہے۔ میں کوئی چیز مکان سے منگوانی نہیں چاہتا۔ یہاں اور ساتھیوں نے بھی یہی طرزِ عمل اختیار کیا ؎

دامن اس کا تو بھلا دور ہے اے دستِ جنوں
کیوں ہے بیکار گریباں تو مرا دور نہیں

اب چائے کے تیسرے فنجان کے لئے کہ ہمیشہ اس دورِ صبوحی کا آخری جام ہوتا ہے۔ ہاتھ بڑھاتا ہوں اور یہ افسانہ سرائی ختم کرتا ہوں۔ یادش بخیر۔ خواجۂ شیراز کے پیرِ مے فروش کی موعظت بھی وقت پہ کیا کام دے گئی ہے ؎

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد
گفتا شراب نوش و غم دل ببر ز یاد
گفتم بباد می دہدم بادہ نام و ننگ
گفتا قبول کن سخن و ہر چہ باد باد
بے خار گل نہ باشد و بے نیش نوش ہم
تدبیر چیست؟ وضع جہاں ایں چنیں فتاد
پُر کن زیادہ جام دما دم بگوشِ ہوش
بشنو از و حکایتِ جمشید و کیقباد"

ابوالکلام

حُبِّ وطن

لالہ جے دیال سکینہ

اِن دنوں اپنے ملک کی محبت اور خدمت کے متعلق کچھ ایسے لغو خیالات ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جِس سے ہمیں سراسر نقصان پہنچ رہا ہے اور آئندہ اس سے زاید نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ حب الوطنی اور محبِّ وطن ان دو الفاظ کا اطلاق فی زمانہ ہند میں عجیب طرح سے ہوا ہے عموماً آج کل وہ لوگ محبّان وطن میں شمار کئے جاتے ہیں جو پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تقریریں کرتے ہیں یا پریس میں جاکر ایڈیٹری کے اہم فرائض کو انجام دینے لگتے ہیں - خواہ وہ نوعمر اور ناتجربہ کار ہی کیوں نہ ہوں۔ کِسی آدمی نے ایک مغویانہ مضمون لکھا اور وہ قید کر لیا گیا تو اس کا نام ثنا فی القوم افراد میں لکھ لیا جاتا ہے - اور ایک جماعت کی جماعت اندھی ہو کر اس کی تحریر کو وردِ زبان کرتی ہے - اور اس کے لفظ لفظ پر فدا ہوتی ہے یہاں کے نوجوان اپنے اپنے خیال سے اٹلی کے میزینی بنے ہوئے ہیں اور انھیں بھروسہ ہے کہ ملک کو ایسی ہی باتوں سے آزاد کر لیں گے

اور خود اپنے حاکم ہو جائیں گے۔ مگر ع

این خیال است و محال است وجنوں

جو قوم آشوب زمانہ سے کئی صدیاں ہوئیں پست ہو چکی ہے۔ اس کی ہمت ٹوٹ چکی ہے جس میں ہزارہا کمزوریاں موجود ہیں۔ وہ کیونکر جلد ہوشیار ہو سکتی ہے۔ محب وطن بن جانا آسان کام نہیں۔ ایک فاضل مصنف کا خیال ہے۔ کہ صرف وہ سچا شیدائے وطن یا خادم قوم ہے جو سب سے پہلے اپنے حاکم کی نہایت فرمانبردار اور وفاکیش رعایا ہونے کی ذاتی مثال عوام کے رو برو پیش کر سکے۔ قوانین رائج الوقت کا پابند اور اُن پر پورا پورا کاربند ہو۔ اپنے وطن کے رسم و رواج کی مودبانہ اطاعت کے ساتھ قدر کرے اِن بد نیت اشخاص کی مخالفت کو اپنا عین فرض سمجھے۔ جو غیر تعلیم یافتہ جماعت میں ناراضی ناموافقت ہلچل اور شورش کا بیج بوتے ہیں۔ جو ایسے کاموں کا جن سے سلطنت کو نقصان پہنچے انسداد کرے خلقت میں امن و صلاح قائم رکھنے اور اس کے ساتھ انصاف کئے جانے میں مدد کرے۔ اپنے ملک کی معلومات کے وسائل و ذرائع کو وسیع کرے۔ ان کی اخلاقی اور تمدنی برائیوں کے مٹانے میں ہمہ تن کوشاں ہو۔ صرف ایک ایسی ذات اس متبرک اور معزز نام سے موسوم کئے جانے کا حق

رکھتی ہے - اور یہ تمام باتیں انھیں میں موجود ہونگی
جو وطن کے سچے بھی خواہ ہوں گے - پس اس
روش پہ چلتے ہوئے جو بندگانِ خدا اپنے ملک
کی خدمت میں مصروف ہیں وہ سب محبانِ وطن
ہیں - اس میں نہ فصیح البیان کی تخصیص ہے
نہ ایڈیٹر کا تفوق - ایک مذہبی مصلح بھی محب وطن
کا کام کر رہا ہے - ایک شاعر یا مصنف ملک
کی ادبی خدمات انجام دے رہا ہے - تاجر ملک
کو اپنے شعبہ میں بلند پایہ بنا رہا ہے - اور اس
کے سرمایہ کی فزونی و فراوانی کی دُھن میں لگا
ہوا ہے - کسی ماہر فن کی خدمت جدا گانہ ملک کو
مشہور کر رہی ہے - مصوّر خاموشی کے ساتھ چار
دیواری میں رہ کر بھی حیرت انگیز اور اچھوتی
صنّاعیوں سے اپنے وطن کے نام کو شہرہ آفاق کر
رہا ہے - اسی طرح ہر بشر جو ملک کے لئے خاص
خاص باتوں کے لحاظ سے مایۂ ناز ہے - خادم وطن
کہلائے جانے کے قابل ہے ؛

سمائلز صاحب نے کئی سال پیشتر حب الوطن پہ
ایک مضمون لکھ کر اس کے نیک و بد دونو پہلو
ظاہر کئے تھے - وہ لکھتے ہیں کہ " آج کل جس چیز
کا نام حب الوطن ہے وہ صرف قومی تعصّب
اور بد ظنی ہے - جو آپس کے حسد - نفاق - غرور
اور تنفر سے پیدا ہوتی ہے - اس کا اظہار کسی

کام کے کرنے سے نہیں کیا جاتا - بلکہ صرف مشیخت سے - شور و شغب سے - ہاتھ پاؤں پیٹنے سے - مدد کے لئے چلاّنے - پکارنے سے - جھنڈے ہلانے سے - گیت گانے سے - زمانۂ ماضیہ کی صعوبتوں پر اور اس ظلم و تعدّی پر جس کا ایک عرصہ ہوا مداوا کرایا گیا - زبان شکایت کھولنے سے حب وطن کا راگ الاپا جاتا ہے - ایسی حُب الوطنی کے لئے دق ہونا اور دردِ سر مول لینا ایک بدترین عذاب ہے - جو کسی ملک پر نازل ہو سکتا ہے - مگر ایسی حقیر حب الوطنی کے ساتھ ایک نیک حُب الوطنی بھی ہے - جو اس ملک کو نیک کاموں سے تقویت دیتی اور بلند کرتی ہے - جو قوم اپنے فرائض کو خلوص اور مردانگی سے پورا کرتی ہے جو راست بازی - فراست اور دیانتداری سے بسر اوقات کرتی ہے - اور اپنی ترقی کے لئے ان وسائل اور مواقع سے مستفیض ہونے میں کوشش بلیغ کرتی ہے جو وقتاً فوقتاً ہر چہار جانب سے مہیا ہوتے ہیں - اور وہ حب الوطنی زمانہ سلف کے ان بزرگان قوم کی یاد دلاتی ہے اور ان کی مثال پیش نظر کرتی ہے - جنھوں نے مذہب اور آزادی کے معاملہ میں کڑی سہہ کر اور تکلیف اٹھا کر اپنے لئے شہرت لازوال اور اپنی قوموں کے لئے وہ حقوق اور مراسمِ زندگانی جن پر وہ عقب

سے قابض ہوئیں - حاصل کئے - کسی قوم کی بزرگی اس کے افراد کے قد و قامت اور اس کے مقبوضات کی وسعت پر موقوف نہیں ہے - ایک قوم اپنی آبادی اور ملک کے لحاظ سے ممتاز ہونے پر بھی اصلی عظمت سے عاری رہتی ہے - قومی ترقی شخصی محنت - قوت اور راست بازی کا مجموعہ ہے - جس طرح سے کہ قومی زوال شخصی کاہلی - خود غرضی اور گنہگاری کے یکجا ہونے کا نتیجہ ہے - جن باتوں کو ہم سوسائٹی کی بڑی بڑی برائیاں شمار کرتے ہیں وہ اکثر پتہ لگانے پر کسی نہ کسی واحد شخص کی گمراہ زندگی کا ثمرہ ثابت ہوتی ہے - اور اس وقت اُن کی بیخ کنی گو از رُوئے قانون کر دی جاتی ہے مگر وہ برائیاں کسی نہ کسی وقت دوسری صورتوں میں نمودار ہوئے بغیر نہیں رہتیں - تا وقتیکہ ہر بشر اپنے طرزِ زیست اور چال چلن کی پوری پوری اصلاح نہ کرے - اگر یہ خیال درست ہے تو حب الوطنی اور ہمدردی سے صرف یہی مراد نہیں ہے - کہ قوانین میں تغیر و تبدل اور مراسم میں ترمیم و تنسیخ کی جائے بلکہ ہر انسان کو ذاتی ترقی کے لئے اکسانے اور مدد دینے کا نام حب الوطنی اور ہمدردی ہے -

انسان پر بیرونی حکومت کا اثر بالمقابل اتنا زیادہ نہیں پڑتا - جتنا کہ اس کی حکومت کا خود اس پر پڑتا ہے - وہ آدمی غلام نہیں ہے - جس پر ایک خود

مختیار بادشاہ حکمران ہو ۔ بلکہ غلام وہ ہے جو اخلاقی جہالت ۔ خود غرضی اور دیگر بے شمار عیوب سے خوار و ذلیل ہے ۔ وہ قومیں جو دل کی غلام ہیں اپنے حاکم یا اپنے قوانین کے بدل جانے سے آزاد نہیں ہو سکتیں ۔ اور تا وقتیکہ یہ خیال خام کہ قوم کی حریت قطعاً گورنمنٹ پر منحصر ہے ۔ رفع نہ ہو جائے ۔ کسی ملک کی جماعت پر حکام یا وہاں کے قوانین کی تبدیلی کا اثر اتنا ہی کم دیرپا ہوگا ۔ جتنا میجک لینٹرن کے تماشے میں تصاویر کا ادھر اُدھر ہٹا دینا ۔ آزادی کی محکم بنیاد شخصی چال چلن پر دار و مدار رکھتی ہے ۔ اور شخصی چال چلن ہی معاشرتی حفاظت اور قومی ترقی کا یقینی ضامن ہے ۔ جان سٹوارٹ مِل کا قول ہے اور سچا قول ہے کہ جبر و تشدد کی حکومت کا کوئی اثر اس وقت تک نہیں پڑ سکتا ۔ جب تک شخصیت اس کی محکوم ہے ۔ اور وہ حکومت جو شخصیت کو کچل دے ۔ اسے حکومت خود اختیاری کہہ سکتے ہیں یا کسی اور نام سے موسوم کر لیں ؛

تمام قوموں کی موجودہ صورت انسان کی پشت ہا پشت کے افعال اور غور و خوض کا نتیجہ ہے مستقل مزاج اور جفاکش متقدمین نے اس کارِ عظیم کو انجام دینے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹایا ہے اور ہر ایک نسل میں نسلوں کی مشقت سے تعمیر کی

ہوئی عادت کو درجہ بدرجہ اونچا اٹھاتی چلی گئی ہے
اسی بنک کام کرنے والوں کے لگاتار سلسلے نے
صنعت و حرفت اور علم و ہنر کے نا تمام ڈھیر میں
ایک قسم کی ترتیب اور باقاعدگی پیدا کر دی ہے
رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ حال کی نسلوں کو اپنے
بزرگوں کی محنت شاقہ اور دانشمندی سے کمائی ہوئی
بیش بہا جاگیر بحق ورثہ سپرد ہوئی ہے۔ کہ اسے
اور آراستہ کریں۔ اور آئندہ نسل کو نہ صرف
جیسی کی تیسی سونپیں۔ بلکہ پہلے کی نسبت ایک
بہتر صورت میں اسے حوالہ کریں۔ موجودہ حب الوطنی
کا خاکہ ہندیوں کے دماغ میں بجنسہ ایسی صورت
میں موجود ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ اپنے اعمال
اور افعال کو درست کریں۔ فرداً فرداً اخلاقی
ترقی کریں۔ اکتساب علوم و فنون میں مصروف
ہوں اور جن باتوں میں ہم دیگر اقوام سے پیچھے
ہیں۔ ان میں اپنی سعی وافر اور قوت بازو
سے برابر آجائیں۔ وطن کی سچی خدمت کے لئے
آمادہ ہو جائیں۔ اور استیصال "انارکزم"
میں کوشش کریں۔ ایسا کرنے پر ہمیں
یقین واثق ہے۔ کہ زمانہ ہماری مدد کرے
گا۔ اور ہم آستانہ مرام تک خود بخود پہنچ
جائیں گے۔ قومی تعصب اور آپس کے تنفر
سے ہم خود اپنے عیوب و اہتمام

سکے دیکھنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔

مشاہدہ

لالہ نارائن پرشاد ورما

صبح و شام ایک پھیری والا جوگی صدا لگاتا جاتا ہے "آنکھوں والو انکھیاں بڑی نعمت ہیں" کبھی ہونٹوں سے یہ جادو بھرے الفاظ شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں گونج رہے ہیں۔ مگر شاید ہی کسی نے کان دھر کر انہیں سنا ہوگا۔ ہم اپنی ہی کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس کان سنا اور اس کان نکال دیا۔ غور کرنا تو درکنار جھوٹوں بھی ہمیں اس طرف توجہ نہیں ہوئی۔ بلکہ سنتے سنتے کچھ ایسی منافات ہو گئی ہے کہ ہم نے انہیں بے نواؤں کی صدا یا فقیروں کی بولی ٹھٹھولی سمجھ کر اس کان سنا اور اس کان اڑا دیا۔ مگر نہیں! ان پُرمعنی الفاظ میں ایک عجیب بھید اور اچھا خاصہ فلسفہ نہاں ہے اور ایک نہایت مفید نصیحت پوشیدہ ہے۔ انہیں حکمت کا پارس اور فلسفہ کی جان کہیں تو بجا ہے۔ بیشک آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ آنکھیں نہ ہوں تو دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیری ہو جائے۔ سیاہ و سفید اچھے برے کی ہمیں مطلق تمیز نہ ہو اور زندگی بے مزہ ہو جائے۔ لیکن کیا یہ ہٹ دھرمی نہیں ہے کہ جب منعم

حقیقی کی بغیر منت بخشش سے ہم آنکھوں والے کہلائیں اور اسی کی نامتناہی قدرت کے مشاہدے سے آنکھیں چرائیں۔

ہاں یوں تو آئے دن ہم صبح۔ شام۔ رات۔ دن دھوپ۔ چھاؤں۔ اندھیرا۔ اُجالا۔ آسمان تارے۔ چاند سورج۔ پھل۔ پھول۔ آگ۔ پانی وغیرہ وغیرہ سبھی کچھ دیکھتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ دیکھنا دیکھنا نہیں ہے۔ افسوس ہے ہماری آنکھیں کھلی رہنے پر بھی بند ہیں۔ قدرت کی صنعتیں حکمتیں ہیں اور قدرت کے نمونے قادر بے نیاز کی گلرنگیاں ذرہ ذرہ۔ پتی پتی۔ خال خال سے ظاہر کر رہی ہیں دیکھنے والے کو سلیقہ اور سمجھنے والے کو سمجھ ہو تو ان ہوش رُبا جھلکیوں میں کیا کچھ نہیں دیکھ سکتا اور ذرا سے غور میں کیا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ مگر آہ ان جلووں کے دیکھنے والی آنکھیں بہت ہی کم ہیں۔

قدرت کے حسن کی طرف چاہے ہم ذرا بھی اعتنا نہ کریں۔ مگر اس کی رنگیلی طبیعت ہر ہر قدم ہر وقت ہماری دلچسپی کا سامان مہیا کرنے میں مصروف ہے۔ ہزارہا مخلوق کروڑہا صورتیں ایسی خلق کرتی ہے کہ انسان ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرے نگاہیں کبھی سیر نہ ہوں اور پھر لطف یہ کہ ایک کی شکل دوسرے سے نہیں ملتی۔ اُف کیا کیا نیرنگیاں کرتی ہے۔ کیسے کیسے گل بوٹے کرتی ہے۔

کہ دیکھنے اور عش عش کرنے کے قابل ہیں۔ گرمی جاڑا۔ برسات۔ خزاں۔ بہار کیا کیا البیلی متوالی رتیں پیدا کرتی ہے اور اُنہیں کے مناسب حال کیسے کیسے بانکے سہانے سمے باندھ دیتی ہے۔ جن کے مشاہدے سے کلی کلی کی رسیا نگاہیں لبریز ہو کر مست ہو جاتی ہیں۔ کہیں چمن میں جوہی لدی کھڑی ہے۔ کہیں چمپا گندمی رنگ بسنتی پوش اپنے جوبن کی رسیلی بہار دکھا رہی ہے۔ کہیں موتیا کھلی ہے۔ کہیں گلاب کے غنچے جھوم جھوم کر کبھی اس پھول پر مسکرا دیتے ہیں کبھی اس پنکھڑی پر کھل کھلا کر ہنس پڑتے ہیں۔ لب جو ہریالہ متوالہ سبزہ کبھی کبھی یہ سہانا سماں دیکھنے ذرا کی ذرا سنبھلتا ہے اور پھر اُسی رنگ میں محو ہو کر میٹھی نیند سو جاتا ہے کہیں کہیں نرگس کی کلیاں جی چنچ کر رس بھری گلابی رسیلی انکھڑیوں کی نیم بازانہ ترکیب دکھا جاتی ہے۔ جنگل میں قدرتی منظروں کی بہاریں ہیں کہ جان لئے لیتی ہیں۔ گھنے گھنیرے درختوں میں نتھرے ہوئے پانی کے چھوٹے چھوٹے چشموں کا آہستہ آہستہ بہنا۔ صبح سویرے خوش گوار ہوا سے پھریریاں لے کر خوش الحان پرندوں کا درختوں کی نازک ٹہنیوں سے اونچی اونچی پھنگیوں پر بیٹھ کر درد بھرے زمزموں

سے چمکنا - پہاڑوں سے آبشاروں کا گرنا۔ جھرنوں کا جھرنا - کالی کالی دھواں دھار گھٹاؤں میں جابجا کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کا بگلوں کی سفید سفید قطاریں دکھا جانا - کیا یہ دستِ قدرت کی صناعیاں اور بیاری فطرت کی معجز نمایاں نہیں ہیں؟ جن میں ہماری آنکھوں کے لئے نور اور دل کے لئے سرور کے خزانے بھرے ہیں - ہاں ہم اِن کی طرف سے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیں تو اور بات ہے ۔

اے آنکھوں والو! دیکھو۔ شاعروں اور فسانہ نگاروں نے سنسان بیابانوں کے سین - سرسبز میدانوں کے منظر - نامور بہادروں کے کارنامے - اخلاق کے انمول گنجینے - طمع - حسد اور جابرانہ مظالم کی خون آشام تصویریں - جان نثاروں کے سچے اعزاز انسانی جذبات کے سرچشمے - دلی ولولوں کے چھلکتے ہوئے دریا کس حسن و خوبی سے دکھائے ہیں ۔ یہ سب قدرت کے مشاہدوں کے ادنٰے کرشمے ہیں -

شاعر اور فسانہ نگار پر ہی کیا موقوف ہے نیچر کے خزانے سنگ تراش - مصور - رنگ ساز دستکار - ڈاکٹر - فلاسفر سب کے لئے یکساں کھلے ہیں شرط یہ ہے کہ آنکھیں کھولیں اور دیکھیں ۔

جوگی کی صدا "انکھیاں والو انکھیاں بڑی نعمت ہیں" ایک ملہم غیبی ہے۔ یہ ہر روز تم کو شانے ہلا ہلا کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر خواب گراں سے بیدار کرتی ہے۔ وقت ہوا ہوا جاتا ہے۔ زندگی دن گن رہی ہے۔ خواہشیں وبال جان ہو رہی ہیں۔ مگر ہم ہیں کہ غفلت کی نیند سو کر کروٹ تک نہیں لیتے۔ آنکھوں والو! جوگی کی صدا میں اعلیٰ فلاسفی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ٭

نمک کا داروغہ

منشی پریم چند

(۱)

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا - اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازۂ صدر بند پا کر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے - چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا - پٹوارگری کا معزز اور پر منفعت عہدہ چھوڑ کر لوگ صیغہ نمک کی برقندازی کرتے تھے - اور اس محکمے کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا - یہ وہ زمانہ تھا - جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے - فارسی کی تعلیم سند افتخار تھی - لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے - منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصۂ غم کو دریافت امریکہ یا جنگ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے - ان کے باپ ایک جہاں دیدہ بزرگ تھے - سمجھانے لگے بیٹا! گھر کی حالت زار دیکھ رہے

ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں کیگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہیں گھر کے مالک و مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیئے۔ ایسا کام ڈھونڈنا۔ جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے۔ جو ایک دن دکھائی دیتا ہے۔ اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے۔ جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے۔ اسی لئے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لیے اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور تم خود عالم و فاضل ہو۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو اس کی ضرورت کو دیکھو۔ موقع دیکھو اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے مروتی کر سکتے ہو۔ لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہیں ٭

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔

بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال۔ اپنا رفیق۔ اپنی ہمت اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے خوبی قسمت ساتھ تھی۔ صیغہ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ معقول۔ بالائی رقم کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سند ملی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

(۲)

جاڑے کے دن تھے۔ اور رات کا وقت۔ نمک کے برقنداز اور چوکیدار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے۔ لیکن اس عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گذرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی۔ تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کے شور وغل اور ملاحوں

کی بلند آوازیں کان میں آئیں - اُٹھ بیٹھے - اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں - اگر کچھ دغا نہیں ہے - تو پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں - شبہ کو استدلال نے ترقی دی - وردی پہنی - طپنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آ پہنچے - دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلفِ محبوب سے بھی زیادہ طولانی پُل سے اتر رہی ہے حاکمانہ انداز سے بولے :-

"کس کی گاڑیاں ہیں ؟"

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا - آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں - تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا "پنڈت الوپی دین کی" کون پنڈت الوپی دین ؟ "داتا گنج کے"

منشی بنسی دھر چونکے - الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا - لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں - غلّے کا کاروبار الگ - بڑا صاحب اثر - بڑے حکام رس - بڑے بڑے انگریز افسران کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے - بارہ مہینے سدا برت چلتا تھا - پوچھا "کہاں جائیں گی" جواب ملا کہ کان پور کو - لیکن اس سوال پر کہ "ان میں ہے کیا ؟" ایک خاموشی کا عالم طاری ہو گیا - اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا - جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے "کیا تم سب گونگے ہو گئے - ہم

پُوچھتے ہیں - اِن میں کیا لدا ہے ؟"

(۳)

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ مِلا - تو اُنھوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دِیا - اور ایک بورے کو ٹٹولا - شبہ یقین سے ہم آغوش تھا - یہ نمک کے ڈھیلے تھے ؛

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے - کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آکر جگایا اور بولے " مہاراج ! دروغا نے گاڑیاں روک دیں - اور گھاٹ پہ کھڑے آپ کو بلاتے ہیں " ؛

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا - وہ کہا کرتے تھے کہ دُنیا کا ذِکر ہی کیا - دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے - اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا - قانون اور حق و انصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسبِ ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے - لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے " اچھا چلو - ہم آتے ہیں " - یہ کہہ کر پنڈت جی نے بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آکر بے تکلفانہ انداز سے بولے - " بابو جی اشیرباد - ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں ہم

برہمنوں پر تو آپ کی نظرِ عنایت ہی رہنی چاہیئے۔
بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے ”سرکاری حکم“
الوپی دین نے ہنس کر کہا ”ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے۔ کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔“
بنسی دھر پر دولت کی اِن شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانت داری کا تازہ جوش تھا کڑک کر بولے۔ ہم اِن نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہوگا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ! تم انہیں حراست میں لے لو۔ میں حکم دیتا ہوں
پنڈت الوپی دین اور اِس کے ہوا خواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا۔ کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا

بدلو سنگھ آگے بڑھا۔ لیکن فرطِ رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے کبھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہیں پایا تھا۔ سکتے میں آگئے۔ خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے۔ دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا۔ الھڑ ہے۔ جھجکتا ہے زیادہ نازبرداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز سے بولے۔ بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجیے۔ ہم مٹ جائیں گے۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ بہت ہوا تو تھوڑا سا انعام و اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے"۔

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا۔ وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتمادِ نفس اور مغرور دولت کو صدمہ پہنچا لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے۔ "لالہ جی! ایک ہزار روپیہ کا نوٹ بابو جی کی نذر کرو۔ آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں"۔

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ "ہزار نہیں

 ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں

ہٹا سکتا۔ دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجلائی اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کئے۔ ایک سے پانچ ہزار تک۔ پانچ سے دس۔ دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلہ میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے: "اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔" بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اور نہایت منت آمیز لہجے کے ساتھ بولے۔ "بابو صاحب! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"غیر ممکن۔"

"تیس ہزار پر؟"

"غیر ممکن۔"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں"
"چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن"
بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔
فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔
الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لیے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں۔ اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(۳)

دُنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں۔ گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا۔ فرضی روزنامچے بھرنے والے حکام سرکار کے ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں بنانے والے سیٹھ ساہوکار یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے۔ اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا۔ اور وہ کانسٹبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں - دل میں غصہ و غم تو سارے
شہر میں ہلچل سی مچ گئی - میلوں میں بھی شاید
شوقِ نظارہ ایسی اُمنگ پر نہ آتا ہو - کثرتِ
ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا -
مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی - پنڈت الوپی
دین اس تلاطمِ ناپیدا کنار کے نہنگ تھے -
حکام ان کے قدر شناس - عملے ان کے نیازمند
وکیل اور مختار ان کے ناز بردار اور اردلی
چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام
تھے - انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ
دوڑے - ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا
اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل
کیا بلکہ وہ قانون کے پنجے میں آئے - ایسا شخص
جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت
اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی
ہو - کیوں قانون کا شکار بنے - حیرت کے بعد
ہمدردی کے اظہار ہونے لگے - فوراً اس
حملے کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار
کیا گیا - اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت
کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی - بنسی دھر خاموش کھڑے
تھے - بلکہ تنہا - سچائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں -
صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں - استغاثہ
کی شہادتیں ضرور تھیں - لیکن ترغیبات سے ڈانوا

ذلیل تھی حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے
کھنچا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ انصاف
سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں
وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت
اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد
فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا
لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا
مقدمہ بہت جلد فیصل ہو گیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے
تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت
کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت
رئیس تھے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار
کے فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے
مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر
پہ اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک
غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور
عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہے
لیکن صیغۂ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک
حلالی نے اس کے امتیاز و ادراک کو مغلوب کر
دیا ہے۔ اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیئے!

وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت
الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ حوالی موالیوں
نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی

کا سیلاب آگیا۔ اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے نگاہیں غرور سے لبریز۔ تو طعن اور تمسخر کی آوازیں چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپڑاسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کیے۔ لیکن ایک ایک اشارہ اس وقت اس نشہ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اُسے پہلا سبق دے دیا تھا۔ انصاف۔ علم اور پنج حرفی خطابات اور لمبی ڈاڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں۔

(۵)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آپہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بیچارے دل شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی بدظن ہو رہے تھے۔ کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا۔ مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کوار اور پوچھ کے لائق نہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے۔ لیکن جو کام کیا۔ دل کھول کر کیا اور آپ دیانت دار بنتے چلے ہیں گھر میں

چاہے اندھیرا رہے مسجد میں ضرور چراغ جلائینگے۔ حیف ایسی سمجھ پر۔ پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثناء میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے رُوداد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے "جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں"۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کف افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت سست بھی کہا۔ اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جاتے تو عجب نہیں تھا۔ کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے تو کئی دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی ۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دلدوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آکر رکا۔ سبز اور گلابی پردے۔ پچھائیں نسل کے بیل ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے۔ سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کی اور مدبرانہ در افشانیاں شروع کیں۔ "آپ کو کون سا منہ دکھائیں منہ میں کالک لگی ہوئی ہے۔ مگر کیا کریں۔ لڑکا نالائق ہے۔ ناخلف ہے۔ ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے۔ مگر ایسی اولاد نہ

دے۔" بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا۔ مصافحہ کیا۔ لیکن شان خود داری لئے ہوئے۔ فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے چلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندہ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت اور ناگوار گذرا۔ یکا یک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ نہیں بھائی صاحب ایسا نہ فرمائیے۔

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دیدیا۔ انداز حیرت سے بولے" ایسی اولاد کو اور کیا کہوں۔

الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پاکر آپ کو پرماتما کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لے لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے۔ ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے واسطہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے۔ میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟"

بنسی دھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ

سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے" یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ غرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں تو آپ کی خاکِ پا ہوں۔ جو آپ کا ارشاد ہوگا۔ بحدِ امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا۔

الوپی دین نے اِلتجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا۔ لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔

بنسی دھر نے جواب دیا۔ میں کس قابل ہوں۔ لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی۔ اس میں دریغ نہ ہوگا۔

الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے" اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمائیے اور اس پر دستخط کیجئے۔ میں برہمن ہوں جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا۔ دروازے سے نہ ٹلوں گا۔

منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا۔ تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے۔ روزانہ خرچ الگ۔ سواری کے لئے گھوڑے۔ اختیارات غیر محدود کانپتی ہوئی آواز سے بولے " پنڈت جی میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے ان عنایات

بکیہاں کے قابل سمجھا - لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلےٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔

الوپی دین ہنس کر بولے:" اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے۔

بنسی دھر نے متین انداز سے کہا:" یوں میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے۔ لیکن مجھ میں نہ علم ہے نہ فراست نہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم اور کار کردہ منشی کی ضرورت ہے۔"

الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا۔ اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے"۔ مجھے نہ علم کی ضرورت ہے نہ فراست کی نہ کارکردگی کی۔ اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بار بار پرکھ چکا ہوں۔ اب حسنِ تقدیر اور حسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے۔ جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے۔ زیادہ تامل نہ کیجئے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت سخت زبان تندمزاج۔ لیکن فرض شناس۔ داروغہ بنائے رکھے۔

بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے

دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیے۔ الوپی دین فرطِ مسرت سے اچھل پڑے۔ اور انہیں گلے لگا لیا۔

تذکرۃ المصنفین

نثر نگار

آزاد

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر شرفائے دہلی میں ایک نامور شخص تھے۔ آپ کی ولادت ۱۸۲۹ء میں دہلی میں ہوئی۔ دہلی کالج میں عربی اور فارسی کی تکمیل کی۔ اور استاد ذوق کے سایہ شفقت میں تربیت پائی۔ وطن کو خیرباد کرنے کے بعد لاہور میں آئے۔ اور محکمہ تعلیم کے سرکاری اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ بعد میں گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں آپ ایران گئے۔ اور ۱۸۸۷ء میں آپ کی ادبی خدمات اور تبحر علمی کے صلے میں حکومت نے شمس العلما کا خطاب عطا کیا۔ نیچرل شاعری (جس کو حالی نے اوج اور عروج پر پہنچایا) کی داغ بیل آزاد ہی نے ڈالی تھی۔ شاہراہ قدیم سے ہٹ کر اردو شاعری کے لئے جدید روش پیدا کرنے کا سہرا بھی مولوی محمد حسین آزاد کے سر پر ہے۔ لیکن آزاد نے شعر و شاعری سے وہ نام نہیں پایا جو اپنی انشا پردازی سے پایا ہے کہنے کو تو اُن کی نثر نثر ہے۔ مگر غور سے دیکھا

جائے تو شعر سے بھی بہتر ہے۔ بظاہر غریب اردو کے سادہ جامہ کو فارسی کے ہلکے سے خوشنما رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور پھر الفاظ کی بندش۔ فقرہ کی ساخت۔ زبان کی شیرینی اور طرز ادا کی بوقلمونی سے ایک نگار خانہ ایسا سجایا ہے۔ کہ اہلِ نظر دیکھتے ہیں۔ اور محوِ حیرت ہوتے ہیں۔ تصنیفات میں آبِ حیات نیرنگ خیال۔ دربار اکبری۔ سخندان پارس نہایت مشہور اور مقبول ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں آپ نے رحلت کی۔ اور لاہور میں دفن کیے گئے۔

سر سپرو

سر تیج بہادر سپرو کشمیری پنڈت ہیں اور الہ آباد میں رہتے ہیں۔ اعلیٰ پائے کے قانون دان ہیں۔ سالہا سال ایڈووکیٹ رہے۔ پھر صوبجات متحدہ اور ہندوستان کی مرکزی حکومت میں عہدہ ہائے جلیلہ پر فائز ہوئے۔ وائسرائے کی کونسل کے قانونی مشیر بنے اور لنڈن کی گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے حکومت کی طرف سے اعلیٰ خطابات اور اعزازات

پائے - آزاد خیال اور صاف گو آدمی ہیں - اِس لیے اپنے پرائے سب عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ سخن شناس ہیں۔ فارسی ان کی گھٹی میں پڑی ہے - اور اردو کا صحیح ذوق رکھتے ہیں - جب کبھی لکھتے ہیں۔ خوب لکھتے ہیں۔ اردو زبان کے فروغ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور انجمن ترقی اردو کے صدر ہیں - اردو زبان کے بڑے حامی اور سرپرست ہیں -

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

ہاپوڑ وطن ہے - علی گڑھ کالج کے ابتدائی زمانے کے بی - اے ہیں - طالب علمی کے زمانہ سے اردو لکھنے کا شوق تھا - ۱۸۹۶ء میں سر سید کے معروف . رسالہ تہذیب الاخلاق میں اردو کے مستقبل پر ایک مضمون لکھا - جو بہت پسند کیا گیا - اس وقت کِس کو خبر تھی کہ آپ کا سارا استقبال اُردو کی خدمت میں بسر ہوگا - بی اے ہو کر کچھ دِن پنجاب میں رہے - پھر حیدر آباد پہنچے یہیں سے اردو کی خدمت شروع کی - انجمن ترقی اردو اول اول آپ کی تحریک پر قائم ہوئی - اور آپ ہی اس کے سیکرٹری اور روح رواں ہیں

اردو نام رسالہ جو انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع ہوتا ہے اور اردو ادب کا بلند پایہ رسالہ ہے۔ آپ کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور اب تک نکلتا ہے۔ اردو علم و ادب کی بہت سی کتابیں آپ نے انجمن ترقی اردو سے شائع کی ہیں۔ اکثر پر اپنے مقدمات لکھے ہیں جو علمی و ادبی دنیا میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بعض کتابیں خود بھی لکھی ہیں۔ آپ کا طرزِ تحریر ناقدانہ۔ عبارت شستہ اور سلیس ہے۔ آپ اردو زبان کے بڑے حامی اور محسن ہیں ۞

سید عبدالقادر

خان بہادر سر شیخ عبدالقادر لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی کی تعلیم و تربیت کے بعد آپ نے علوم مغربی کی طرف توجہ کی۔ آپ کا علمی ذوق و شوق فطرتی تھا۔ پہلے آپ انگریزی اخبار ابزرور کے نائب اڈیٹر مقرر ہوئے اور بعد میں چیف اڈیٹر ۱۹۰۱ء میں آپ نے اپنی ادارت سے ایک ادبی رسالہ مخزن جاری کیا۔ ۱۹۰۴ء میں آپ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت گئے۔ آپ کی علمی اور ادبی کارگزاریوں کے

صلے میں آپ کو حکومت کی طرف سے خطابات ملے اور مناصب جلیلہ پر مامور ہوتے رہتے یورپ کی سیر و سیاحت کے حالات کو نہایت دلچسپ انداز میں قلمبند کیا ہے۔ شیخ صاحب اردو زبان کے بڑے محسن ہیں

شرر

مولوی عبد الحلیم شرر عباسی ۱۸۶۰ء بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ تعلیم لکھنؤ اور مٹیا برج (کلکتہ) میں پائی۔ کچھ دن اودھ اخبار کے اسسٹنٹ ایڈیٹر رہے پھر ہفتہ وار "محشر" جاری کیا۔ جس میں شاعرانہ مذاق کے رنگین اور نازک مضامین شائع ہوتے تھے۔ ۱۸۸۷ء میں "دلگداز" جاری کیا۔ جسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے خیالی مضامین کا رنگ اور طرز بہت پسند کیا گیا۔ تاریخ سندھ کے لکھنے پہ ریاست حیدر آباد سے انعام ملا۔ ولایت جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ ۱۹۰۴ء میں آپ دکن میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات کے عہدے پہ مامور ہوئے اردو ادب میں آپ تاریخی ناول نویسی کے موجد ہیں۔ اور آپ کو اردو زبان کا بہترین ناول نویس تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا انتقال ۱۹۲۶ء میں لکھنؤ میں ہوا۔

سرسید احمد خان

سرسید احمد خان بتاریخ ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ علوم مشرقی فارسی اور عربی کی تعلیم کے بعد بائیس سال کی عمر میں سرکار انگریزی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے سب ججی کے اعلیٰ عہدے تک پہونچے ۱۸۶۶ء میں ولایت کا سفر کیا۔ ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم علی گڈھ کی بنیاد ڈالی اور اپنے آپ کو قومی خدمت کے لیئے وقف کر دیا رسالہ تہذیب الاخلاق آپ کی ادارت سے شائع ہوتا تھا۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو زبان میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی ادب کا جو پرتو اس پر پڑا۔ وہ سرسید احمد مرحوم کی جدت طبع اور سعی بلیغ کا نتیجہ تھا۔ علمی خدمات کے صلے میں حکومت سے اعلیٰ خطابات پائے۔ آپ کی تصانیف آثار الصنادید۔ اسباب بغاوت ہند۔ تفسیر القرآن۔ سلسلہ الملوک وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مضامین اور تقاریر ہیں جو اردو ادب کے لیئے سرمایۂ ناز ہیں۔ آپ نے ۱۸۹۸ء میں بمقام علی گڈھ رحلت کی اور علی گڈھ یونیورسٹی کی مسجد کے بیرونی حصے میں مدفون ہوئے

چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لیکن چند ہی سال بعد لکھنؤ چلے آئے۔ اور وہیں آپ نے تعلیم پائی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد قانون کا امتحان پاس کیا۔ اور وکالت شروع کی۔ شعر و سخن سے فطری مناسبت رکھتے تھے۔ اور نظم و نثر دونوں خوب لکھتے تھے۔ نثر میں زیادہ تر تنقیدی مضامین لکھے ہیں اور تنقید کا نہایت صحیح اور اعلیٰ معیار مد نظر رکھا ہے۔ آپ کے مضامین زبان کی متانت اور شگفتگی کے لحاظ سے اردو نثر کے نہایت عمدہ نمونے ہیں۔ آپ نیچرل شاعر تھے۔ نیچرل شاعری میں شاعرانہ لطافت اور قومی جذبات کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ کی نیچرل اور قومی نظمیں بہت مقبول ہیں اور خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔ ۱۹۲۶ء میں ایک مقدمہ کی پیروی کے لئے رائے بریلی گئے تھے۔ کہ یکایک فالج کا حملہ ہوا اور وہیں فوت ہو گئے۔

آپ کے کلام کا ایک مجموعہ "صبح وطن" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ مضامین کے علاوہ ایک ڈرامہ کملا بھی ان کی یادگار ہے۔

مولانا راشد الخیری

علامہ راشد الخیری دلّی میں ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے
نسائیات ان کا موضوع ہے۔ بیگماتی زبان کے
اُستاد ہیں۔ عورتوں کی اِصلاح اور تعلیم کے
زبردست حامی تھے اور اِس کارِ خیر میں عمر صرف
کی۔ نسوانی مضامین ان کی اپنی زبان میں اس خوبی
سے لکھے ہیں کہ قلم توڑ دیا ہے۔ انداز تحریر الم
انگیز ہے اس لیے انہیں مصورِ غم کہتے ہیں۔ اردو
کے ایک بڑے انشا پرداز ہیں۔ بہت سی
کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو قدیم و جدید دِلی
کی معاشرت کا آئینہ ہیں۔ صبح زندگی۔ شام زندگی
اور شب زندگی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۳۶ء
میں راہیِ عدم ہوئے ۔

حالیؔ

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت ضلع کرنال میں پیدا ہوئے عربی۔ فارسی میں علوم مروجہ کی تحصیل کے بعد سترہ برس کی عمر میں دلی چلے گئے اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ کے صاحبزادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ حالی کی ادبی زندگی پر نواب شیفتہ کی ادبی صحبتوں کا بہت اثر پڑا۔ ان ہی کی وساطت سے مرزا غالب کے شاگرد ہوئے۔ پھر لاہور آئے۔ اور حکومت پنجاب کے محکمہ تعلیم میں مامور ہوئے۔ یہاں کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر تعلیمات کے ایما سے ایک بزم مشاعرہ قائم کی جس میں نطری مضامین پر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

گورنمنٹ نے ادبی خدمات کے صلے میں ان کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا اور سر سید کے توسط سے ریاست حیدر آباد سے وظیفہ مقرر ہو گیا اردو شاعری کے مصلح تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اخلاقی اور نیچرل شاعری کی ترقی کا آغاز آپ ہی نے کیا مگر آپ کی شہرت کا سب سے بڑا سبب ان کی قومی شاعری ہے۔ انہیں نظم و نثر دونو پر پورا عبور حاصل تھا۔ نثر کی کتابوں میں یادگارِ غالب حیاتِ جاوید۔ مقدمہ شعر و شاعری اور حیات

سعدی خاص طور پر مشہور ہیں۔ نظم میں مسدس حالی دیوان حالی۔ مناجات بیوہ اور بہت سی نظمیں یادگار ہیں۔ آپ نے ۱۹۱۴ء میں اپنے وطن پانی پت میں انتقال کیا ٭

سرشار

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنؤ میں ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی گھر میں پڑھی اور انگریزی کی تعلیم کیننگ کالج میں پائی۔ شروع میں معلمی کی پھر انشا پردازی کی طرف مائل ہوئے اور اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اس میں مشہور و معروف فسانہ آزاد شائع کیا۔ جو بیحد مقبول ہوا۔

سرشار کے افسانے جو ناول اور داستان کے بین بین ہیں سب زعفران زار کشمیر ہیں۔ اردو میں فسانۂ آزاد سب سے پہلا ناول ہے۔ اس لئے اردو میں ناول نویسی کے موجد سرشار ہی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ سرشار کو وسعت زبان کے لحاظ سے اردو پر وہ قدرت حاصل تھی جو شاید ہی کسی اردو انشا پرداز کو نصیب ہوئی ہو۔ ان کی نثر بے حد رواں اور دلچسپ ہے جس پر ہلکی ہلکی ظرافت کا رنگ غالب ہے۔ وہ متین اور مزاحیہ۔ سنجیدہ اور ظریفانہ ہر انداز کی زبان لکھتے تھے اور ہر رنگ میں تکلف و سادگی کے ساتھ استاد تھے۔ فسانۂ آزاد۔ جام سرشار۔ خدائی فوجدار۔ سیر کہسار۔ وغیرہ آپ کی تصانیف ہیں۔ ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا ٭

کیفی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کشمیری پنڈتوں کے معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ دہلی میں ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے اور فارسی کی تعلیم اپنے نانا سے جو فارسی کے جید عالم تھے پائی۔ مشن کالج دہلی میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ شاعری کا مذاق اپنے بزرگ پنڈت نرائن داس ضمیر سے پایا۔ شروع میں غزلیں کہیں لیکن آزاد۔ حالی اور مغربی خیالات کے زیر اثر گل و بلبل کے افسانے چھوڑ نیچرل شاعری کے رنگ میں رنگے گئے۔ آپ اردو زبان کے بڑے حامی اور محسن ہیں اور مختلف انجمنوں اور کانفرنسوں میں جو اس زبان کی ترقی اور فروغ کے سلسلہ میں منعقد ہوتی رہتی ہے۔ آپ سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں۔ آپ کے مضامین کے مجموعے جو علمی اور ادبی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ منشورات اور خمسہ کیفی کے نام سے زیور طبع حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض ناول۔ ڈرامے اور نظموں کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کو بحیثیت محقق زبان شاعر اور ناظم کے ایک امتیازی درجہ حاصل ہے۔

منشی پریم چند

منشی دھنپت رائے نام تھا۔ پریم چند کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ ایک غریب گھرانے میں جنم لیا۔ اور ساری عمر عسرت اور ناداری کا شکار رہے۔ بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ اردو ادب میں افسانہ نگاری کے موجد اور بلند پایہ ناول نویس تھے۔ افسانہ نویسی کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ چنانچہ اِس صنف میں کوئی اہلِ قلم اِن کے کمال کو نہیں پہونچتا۔ طرزِ ادا بے حد دلچسپ اور اندازِ تحریر نہایت موثر ہے۔ افسانوں میں فطرت نگاری۔ کردار نگاری اور مقامی رنگ پیدا کرنے میں آپ کو ید طولےٰ حاصل تھا اور اس میں اپنی نظیر آپ تھے۔ اُردو اور ہندی دونو زبانوں میں لکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں یکساں عبور رکھتے تھے۔ اُردو میں پریم پچیسی۔ پریم بتیسی۔ پریم چالیسی زادِ راہ۔ خواب و خیال۔ آخری تحفہ وغیرہ افسانوں کے بیحد مقبول مجموعے یادگار چھوڑے ہیں۔ گئودان غبن۔ میدانِ عمل۔ چوگانِ ہستی وغیرہ اِن کے مشہور ناول ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے ہوش سنبھالتے ہی ایسے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں ایک خاص مسلک رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کی تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوا تھا۔

عالمِ شباب میں ہی کانگرس میں شامل ہوئے اور ترک و خدمت کی زندگی اختیار کی۔ آپ کو چھ بار قید و بند کی زندگی کا تجربہ پیش آیا۔ آخری بار یعنی ۱۹۴۲ء میں آپ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے صدر تھے۔ آپ نے سیاسیات کو ادب سے ہمیشہ علیحدہ رکھا۔ چنانچہ اپنی سیاسی زندگی کا پرتو ادبی زندگی پر پڑنے نہیں دیا۔ مولانا کی ادبیات کو اردو ادب میں وہی درجہ حاصل ہے۔ جو ادب اعلیٰ کو فرانسیسی ادبیات میں میسر ہے۔ قدرت نے انہیں جو خصائص بخشے ہیں۔ شاید ان سب میں حافظے کی نعمت لازوال سب سے بڑی نعمت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم اور ہر نوعیت کے سینکڑوں شعر پرا باندھے سامنے کھڑے ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ اِن کی نثر شعر کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ کی ظرافت بے داغ لطافت رکھتی ہے اور آپ کی واقعہ نگاری کی نقش آرائی کا جواب نہیں ملتا۔ ہندوستان کی سیاسی جد و جہد و تحصیل آزادی کی تاریخ میں جہاں سرفروشانِ وطن کا ذکر ہوگا۔ آپ کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ آزاد ہندوستان میں محکمہ تعلیم کی وزارت کا قلمدان آپ کے سپرد ہے۔ قربانی۔ غبار خاطر مضامین ابوالکلام۔ کاروانِ خیال۔ تازہ مضامین ابوالکلام آپ کی تصنیفات ہیں۔

شعرا

میر

میر تقی نام میر تخلص - شرفائے اکبر آباد سے تھے ۱۱۲۵ھ میں عالم وجود میں آئے - دس سال کی عمر میں والد وفات پا گئے اور میر صاحب دہلی چلے گئے۔ عمر کے آخری ایام لکھنؤ میں بسر ہوئے - شروع میں سراج الدین خان آرزو سے فن شاعری میں استفادہ کیا - پھر کسی سے اصلاح نہیں لی - شعر و سخن کا شوق فطرت نے ودیعت کیا تھا - میر صاحب کی زبان نہایت شستہ کلام صاف اور بیان بے حد پاکیزہ ہے - عمر ناکامی میں گذری - اس لئے ان کی ہر بات سوز و گداز سے بھری ہوئی ہے - ویسے تو ہندوستان کے تمام شاعر حسرت اور یاس کا دکھڑا روتے ہیں مگر اوروں نے جگ بیتی کہی ہے اور انہوں نے آپ بیتی - یہی سبب ہے کہ کلام نہایت پُر درد اور پُر تاثیر ہے - آپ کو فنِ غزل گوئی کا پہلا استاد تسلیم کیا جاتا ہے -

۱۲۲۵ھ میں میر صاحب کا انتقال ہوا - چھ دیوان یادگار چھوڑے ہیں ؀

سوداؔ

مرزا محمد رفیع نام - سوداؔ تخلص تھا - ان کے بزرگ کابل سے بسلسلہ تجارت ہندوستان آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے - ۱۱۲۵ھ دہلی میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم و تربیت پائی - شاہ حاتم کے شاگرد تھے - مگر استاد سے بہت آگے نکل گئے - شاہ عالم اپنا کلام اصلاح کے لئے دکھاتے تھے - زمانے کی گردش سے دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور لکھنؤ گئے جہاں نواب شجاع الدولہ نے ان کی بڑی قدر کی - اِس کے بعد آصف الدولہ نے بھی نہایت عزت سے رکھا - طبیعت معنی آفرین پائی تھی - سب اصناف سخن پر قادر تھے - مگر قصیدہ اور ہجو کے بادشاہ تھے - شوکتِ الفاظ اور زورِ سخن اِن کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں نقادانِ سخن کی رائے ہے کہ جو مرتبہ میر کا غزل میں ہے مرزا کا قصیدہ میں ہے میر و مرزا کا موازنہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ میر کا کلام آہ ہے اور سوداؔ کا واہ - ۱۱۹۵ھ میں لکھنؤ میں وفات پائی +

اِنشاؔ

سید انشاء اللہ خان نام اور انشاءؔ تخلص تھا۔ مُرشد آباد میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے شباب کے زمانہ میں والد کے ساتھ دہلی آئے۔ اور شاہ عالم کے دربار میں عزت پائی۔ دِلی سے دل اچاٹ ہوا تو لکھنؤ آئے۔ اور نواب آصف الدولہ کے دربار میں عروج پایا۔ طبیعت نہایت تیز پائی تھی۔ علمی قابلیت نے اس کو چار چاند لگائے۔ انشاءؔ شاعر ہونے کے علاوہ بڑے ظریف اور بذلہ سنج تھے۔ اس لیے کلام کا اکثر حصّہ ظریفانہ انداز کا حامل ہے۔ غزلوں میں بھی یہی رنگ ہے۔ قواعد اُردو کے متعلق ایک فارسی میں کتاب لکھی ہے جس کا نام دریائے لطافت ہے۔ داستان رانی کیتکی ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔ باوجود اس کے اردو کے رتبے سے کلام نہیں گرا۔ ۱۲۳۳ھ میں بمقام لکھنؤ فوت ہوئے۔

درد

درد تخلص۔ خواجہ محمد میر نام ۱۱۳۱ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے آپ کا خاندان دہلی میں نہایت باوقعت خیال کیا جاتا تھا۔ امیر غریب سب عزت کرتے تھے۔ دیوان غزلیات۔ رباعیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ اگرچہ دیوان مختصر ہے۔ مگر پھر بھی ان کا شمار صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے اکثر غزلیں چھوٹی چھوٹی بحروں میں لکھی ہیں۔ ان کا کلام متین اور سنجیدہ خیالات کا مجموعہ ہے۔ چونکہ بڑے پائے کے صوفی تھے۔ اس لیے کلام میں تصوف زیادہ ہے۔ ۱۱۹۹ھ میں دہلی میں وفات پائی۔

ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ طبیعت میں بےحد استغنا تھا۔ اس لیے نہ راجہ چندو لال کی دعوت قبول کی نہ کسی دربار سے منسوب ہوئے۔ اہل لکھنؤ استاد مانتے تھے۔ آپ اپنی طرز کے موجد تھے۔ قدیم شاعری میں انہوں نے بہت سی اصلاحیں کیں۔ غزل کو گل و بلبل کی حد سے نکال کر ہمہ گیر بنایا۔ خیال بندی

اور بلند فکری آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ زبان میں سلاست کم صفائی زیادہ ہے۔ تین دیوان چھوڑے ہیں۔ مگر مشہور دو ہیں۔ سنہ ۱۲۵ھ میں انتقال کیا۔

آتش

خواجہ حیدر علی نام۔ آتش تخلص۔ ان کے والد دلی سے ترک وطن کر کے لکھنؤ چلے گئے تھے۔ مصحفی کے شاگرد تھے اور اپنی آتش بیانی سے استاد کے نام کو روشن کیا۔ بہت سے شاگرد چھوڑے ہیں جو استاد وقت کہلائے۔ صبا۔ رند۔ خلیل۔ جلیل ان میں سے مشہور ہیں۔ آپ کا دیوان آپ کی زندگی میں مرتب ہو کر شائع ہو گیا تھا۔ بعد کا کلام تتمہ کی صورت میں داخل کر دیا گیا ہے۔ غزل کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ آپ کی زبان و محاورہ ہندی اردو کا دستور العمل ہے۔ سنہ ۱۲۶۳ھ میں انتقال کیا اور غزلوں کا ایک دیوان چھوڑا ہے۔

نسیم

دیا شنکر نام۔ نسیم تخلص۔ کشمیری پنڈت تھے۔ لکھنؤ میں سنہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ آتش کے شاگرد تھے۔ عین عالم شباب میں مر گئے۔ مگر گلزار نسیم مثنوی وہ یادگار چھوڑی ہے کہ جب تک اردو زندہ ہے۔ ان کا

نام نہیں مر سکتا - یہ مثنوی ایک خیالی قصہ ہے حسن ادا تناسب لفظی اور اختصار اس مثنوی کے خاص جوہر ہیں - زبان خاص لکھنؤ کی ہے اور نہایت پاکیزہ ہے اس میں لفظی تکلفات اور رعایات کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچایا ہے - تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے - لیکن ان کی شہرت و بقائے دوام کا سرمایہ ان کی مایہ ناز مثنوی گلزار نسیم ہے - آپ کی وفات لکھنؤ میں سنہ ۱۸۴۳ء میں ہوئی -

مومنؔ

حکیم مومن خان - نام مومن تخلص سنہ ۱۲۱۵ھ میں دلی میں پیدا ہوئے - حکمت اور طبابت آبائی پیشہ تھا نجوم کا بھی شوق تھا - نہایت ذکی اور ذہین آدمی تھے - شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی - طبیعت میں بے حد استغنا تھا - دربار داری سے پرہیز کرتے تھے - اور قصیدہ گوئی سے گریز - تمام اصناف سخن پر قادر تھے - مگر غزل کے استاد تھے - طبیعت وقت پسند پائی تھی - طرز ادا نہایت بانکا تھا - معاملہ بندی اور جدت ادا ان کے کلام کے نمایاں جوہر ہیں - ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے - سنہ ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی -

انیس

میر ببر علی انیس ۱۲۱۶ھ میں بمقام فیض آباد وجود میں آئے۔ لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی۔ ابتدا غزل سے کی۔ مگر بعد میں اپنے والد کی ترغیب پر مرثیہ کہنا شروع کیا۔ اور وہ کمال دکھایا کہ سارے اصناف سخن کو پیچھے چھوڑا اور آنے والوں کے لیے آگے بڑھنے کی جگہ نہ رکھی۔ اردو شاعری میں انیس مرثیہ گوئی کا بادشاہ ہے۔ اُردو ادب میں رزمیہ شاعری کی کمی انیس نے مرثیہ میں پوری کی۔ ان کا کلام کیا ہے۔ گویا موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ ایک ایک مضمون کو سینکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف پیدا کیا ہے۔ مظاہر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں۔ جن کا جواب اردو زبان میں ملنا دشوار ہے۔ لکھنؤ میں ۱۲۹۱ھ میں اس جہان فانی سے رحلت کی۔

دبیر

مرزا سلامت علی نام اور دبیر تخلص تھا ۱۲۱۸ھ میں بمقام لکھنو عالم وجود میں آئے۔ مرثیہ خوانی کے شوق نے مرثیہ گوئی کے سرش الکمال تک پہنچا دیا۔ طبیعت گداز پائی تھی۔ جو اس موضوع کے لئے

نہایت مناسب اور موزوں تھی۔ آپ کا دستور اور دلگداز انداز آپ کے مراثی کا نمایاں وصف ہے۔ اپنی زندگی میں کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے۔ ان کے مرنے کے ساتھ مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۷۹۷ء میں انتقال کیا۔

نظیر

شیخ ولی محمد نام۔ نظیر تخلص ہے۔ محمد شاہ کے عہد میں دلی میں پیدا ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت دلی کو خیر باد کہا۔ اور اکبرآباد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے اکبرآبادی کہلاتے ہیں۔ ابتدائی عمر میں معلمی کرتے تھے۔ شعر وسخن کی طبعی مناسبت سے شاعری شروع کی۔ عوام کی زبان میں لکھا ہے اور ایسے ایسے موضوع پیدا کئے ہیں جو کسی کے خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ ان کا کلیات معانی کا عجائب خانہ ہے۔ جس میں ہر قسم کی نظمیں موجود ہیں۔ آخری عمر میں فالج میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تقریباً سو سال کی عمر میں ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

ذوق

نام شیخ محمد ابراہیم۔ ذوق تخلص۔ سنہ ۱۲۰۴ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ شروع میں شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ لیکن بعد میں یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ابو ظفر بہادر شاہ کے استاد تھے۔ بہادر شاہ نے ملک الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اُنیس سال کی عمر میں ذوق کو اکبر شاہ نے خاقانی ہند کا خطاب دیا۔ آپ نے بڑے بڑے شاندار قصیدے کہے ہیں اور اُردو ادب میں قصیدہ گوئی کو معراج کمال تک پہونچایا ہے۔ زبان کی صفائی۔ بندش کی چستی اور محاورہ بندی ان کی غزل کے امتیازی وصف ہیں۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں وفات پائی۔

غالب

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خان غالب سنہ ۱۲۱۲ھ میں شہر آگرہ میں پیدا ہوئے اور یہیں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ شادی ہونے کے بعد آگرہ چھوڑ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ساری عمر تنگدستی اور مفلوک الحالی میں گذاری۔ ابتدا میں اسد تخلص کرتے تھے۔ پھر غالب اختیار کیا۔ اگرچہ کسی استاد سے باقاعدہ نہیں پڑھا لیکن طبیعت کے زور اور فطری قابلیت سے

اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے نظم و نثر میں مسلم الثبوت استاد کہلائے۔ اگرچہ مرزا کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا۔ لیکن کمال شہرت کو اردو شاعری کی بدولت پہونچے۔ غزل طبیعت کے مناسب حال اور فلسفی مسائل سے مالا مال ہے۔ اردو غزل میں نئی طرز کے موجد ہیں۔ مرزا کے کمال کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح نظم میں ان کا پایہ اعلیٰ ہے اسی طرح نثر میں ان کا مرتبہ بالا ہے۔ اردوئے معلیٰ خطوں اور رقعوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں مرزا نے القاب آداب کا پرانا اور فرسودہ طریقہ قطعی اڑا دیا ہے۔ ادائے مطلب کا انداز ایسا ہے جیسے دو آدمی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں دیوان۔ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ آپ کی یادگار ہیں۔ ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔

امیر مینائی

منشی امیر احمد امیر مینائی ۱۸۲۹ء میں بمقام لکھنؤ پیدا ہوئے۔ تدبیر الدولہ اور دبیر الملک کے دو خطاب سلطنت اودھ سے عطا ہوئے۔ غدر کے بعد آپ رام پور آ گئے۔ نواب یوسف علی خان نے مفتی عدالت کا معزز عہدہ عطا کیا۔ ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔ آپ نے اردو زبان میں ایک مبسوط لغت (امیر اللغات) تالیف کرنا شروع کیا

تھا۔ مگر اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ مرات الغیب۔ صنم خانۂ عشق ان کے دیوانوں کے نام ہیں۔ اور ان کی مضمون آفرین طبیعت کا نمونہ ہیں۔ ابر کرم۔ نورِ تجلی۔ اُن کی دو مثنویاں، خلاق اور معرفت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

داغ

نواب مرزا خان نام۔ داغ تخلص تھا۔ ۱۲۴۶ھ میں دِلی میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر حضرت ذوق کے شاگرد بنے۔ اوائل عمر میں دِلی میں ولی عہد کی خدمت میں رہے اس کے بعد چالیس برس دربار رام پور میں پھر حیدر آباد میں دربار دکن کے حکم سے مقیم رہے یہاں شاہانہ عطیات کے علاوہ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملتا تھا۔ ان کی زندگی میں ہی اِن کے تین دیوان گلزارِ داغ۔ آفتاب داغ۔ مہتاب داغ۔ اور ایک مثنوی فریاد داغ شائع ہو چکے تھے۔ آپ نے جو سادگی اور صفائی اردو میں پیدا کی۔ وہ آپ کا ہی حصہ ہے اپنے رنگ کے آپ موجد تھے۔ کلام کی شوخی۔ طرزِ بیان کی جدت۔ خیالات کی برجستگی اِن کے جوہر ہیں۔ ان کا کلام روزمرہ اردو کی جان ہے۔ اور شوخی۔ شگفتگی اور دِل نشینی میں بے نظیر ہے۔ ۱۳۲۲ھ میں بمقام حیدر آباد انتقال کیا۔

شبلی

شبلی نعمانی محمد شبلی نام - شبلی تخلص تھا - آپ ۱۸۵۷ء میں بمقام اعظم گڑھ پیدا ہوئے - اٹھارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر چند دنوں کے لیے عدالت دیوانی میں امین رہے - یہاں سے دل برداشتہ ہو کر علی گڑھ چلے گئے - وہاں سر سید احمد مرحوم نے کالج کی پروفیسری پر فائز کیا - چونکہ علمی ذوق رکھتے تھے - اس لیے اس ماحول کو بہت پسند کیا - اور قابلِ تعریف علمی خدمات سر انجام دیں - ان کی تصنیفات بہت ہیں - اور نہایت ہی مقبول اور مشہور ہیں - ادب - تاریخ - فلسفہ اور دینیات سے ان کو بے حد دلچسپی تھی - چنانچہ اس سلسلہ میں نہایت مفید اور پر از معلومات کتابیں لکھی ہیں - جہاں تاریخ اسلام پر بڑی تحقیق اور دیدہ ریزی سے کام کیا ہے - وہاں اپنی مایہ ناز شعر العجم میں بھی تدقیق اور تنقید کا حق ادا کیا ہے - ادبی خدمات کے صلے میں گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا - فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے - اخلاق اور مذہبی نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے - ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں وفات پائی ؎

اکبر

سید اکبر حسین رضوی نام - اکبر تخلص - الہ آباد میں پیدا ہوئے - علوم مشرقی کے علاوہ انگریزی علم ادب میں بھی خاصی دستگاہ تھی - چھوٹی چھوٹی خدمات سے ترقی کرتے ہوئے ججی تک پہنچے - سرکاری خدمات کے صلے میں سرکار سے خان بہادر کا خطاب ملا مغربی خیالات کو ابتیائی لباس میں جلوہ گر کیا ہے - اور اس طرز جدید کو اس بلندی تک پہنچایا ہے کہ امید نہیں کہ اس طرز میں کوئی ان سے آگے بڑھ سکے - اکبر کے کلام کا سب سے زیادہ مقبول عنصر ان کی ظرافت ہے - جو اصلاح کا پہلو لئے ہوئے ہے - اخلاق و معاشرت کی اصلاح ان کا خاص موضوع ہے - تمدن جدید کا خوب خاکہ اڑایا ہے - ان کا کلام جدت بیان اور حسن ادا کا بہترین نمونہ ہے جن پر ان کی طبیعت کی شوخی اور بذلہ سنجی نے قبول عام کی مہر لگا دی ہے اپنی طرز خاص کے موجد تھے - کلام شائع ہو چکا ہے - سنہ ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں راہیٔ ملک عدم ہوئے -

سرور

منشی درگا سہائے نام، سرور تخلص۔ جہان آباد کے رہنے والے اور حکیم پیارے لال کے فرزند ارجمند تھے۔ ابتدائی تعلیم جہان آباد کے سکول میں پائی۔ آپ بچپن سے شعر و سخن کی طرف مائل تھے۔ اور جلد ہی شہرت اور ناموری کے آسمان پر بلند ہو کر چمکے۔ اکلوتے بیٹے کی موت پر جسے اس کی ماں ایک سال کا چھوڑ مری تھی۔ طبیعت بدل گئی اور غم غلط کرنے کے لئے مے نوشی اختیار کی رفتہ رفتہ اس آتش سیال نے ان کے دل و دماغ کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور یہی تباہ کن عادت ۱۹۱۰ء میں قبل از وقت موت کا باعث بنی۔ مجموعہ کلام وفات کے بعد شائع ہوا۔ شوکت الفاظ رنگینی جذبات۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی سرور کے کلام کے نمایاں وصف ہیں۔ ان کی بعض نظمیں چوٹی کی نظمیں مانی جاتی ہیں۔

برق

منشی مہاراج بہادر نام، برق تخلص تھا۔ دہلی میں ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ قوم کے کائستھ تھے۔ بی اے اور منشی فاضل کے امتحان پاس کئے۔ فطرت سے

طبع وقاد لے کر آئے تھے - اردو اور فارسی سے خاص ذوق تھا - شعر گوئی میں طرزِ جدید کے پیرو تھے زبان کی شستگی اور برجستگی قابلِ داد ہے - نیچرل اور اخلاقی نظمیں خوب کہی ہیں - افسوس کہ شوق صاحب ڈھلتے شباب کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو گئے آپ کی منظومات مطلع انوار اور حرف ناتمام کے نام سے شائع ہوئی ہیں -

اقبالؔ

شیخ محمد اقبال نام - اقبال تخلص - ۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے - مولوی میر حسن سے علوم مشرقی کی تعلیم پائی اور شعر و سخن میں حضرت داغ دہلوی سے تلمذ کیا - ایم - اے کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی - کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں بعدازاں انگلستان گئے - اور وہاں سے بیرسٹر اور فلسفہ کے ڈاکٹر ہو کر آئے - شعر و سخن کا مذاق بچپن سے تھا اقبال ایک زبردست شاعر اور مفکر تھے اشعار میں شاعرانہ لطافت نازک خیالی اور سلاست بیانی کے ساتھ فلسفیانہ اور حکیمانہ رنگ نمایاں ہے جو ان کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے - حکومت کی

طرف سے ادبی و علمی خدمات کے صلے میں سر کا
خطاب ملا - اردو کے کلام کے مجموعے بانگ درا
بال جبریل اور ضرب کلیم کے نام سے شائع ہو چکے
ہیں - اور فارسی زبان میں پیام مشرق - زبور عجم جاوید
نامہ لکھے ہیں - ان کی مثنویاں اسرار بیخودی و رموز
بیخودی بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکی ہیں ۱۹۳۸ء
کو لاہور میں انتقال کیا اور شاہی مسجد لاہور کے
احاطہ میں مدفون ہوئے -

مہر

منشی سورج نرائن نام مہر تخلص - دہلی میں پیدا
ہوئے - ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ
انگریزی زبان کی تحصیل کی طرف مائل ہوئے
اور اس کی تکمیل گورنمنٹ کالج لاہور میں کی
اس دوران میں آپ نے سات زبانوں کے فلسفہ
کا مطالعہ کیا سنسکرت سے آپ کو خاص طور پہ
رغبت تھی - ویدانت کا عمیق مطالعہ کیا اور اس
سے خاطر خواہ استفادہ کیا - پنجاب میں محکمہ تعلیم
میں اچھے عہدوں پر مامور رہے - اوائل عمر سے ہی
آپ کو شعر و شاعری کا شوق تھا - آپ کے کلام
کا مجموعہ "مجموعہ مہر" کے نام سے شائع ہوا ہے
زیادہ تر اخلاقی اور نیچرل نظمیں لکھی ہیں - انگریزی
اور سنسکرت کا اثر ان کے منظومات میں نمایاں

ہے - اکثر انگریزی نظموں کے ترجمے کئے ہیں۔ آپ کی شاعری حسن و عشق کی بندشوں سے قطعاً آزاد ہے - ۱۹۳۳ء میں ستر سال کی عمر میں بمقام لاہور راہیٔ عدم ہوئے -

رواں

چودہری جگت موہن لال نام - رواں تخلص ضلع اناؤ کے رہنے والے تھے - ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے - اِن کے کلام کا مجموعہ "روحِ رواں" کے نام سے چھپ کر ملک میں مقبول ہو چکا ہے - افسوس کہ رواں عین صحت اور تندرستی کی حالت میں چند روز علیل رہ کر ۱۹۳۴ء میں انتقال کر گئے - مرحوم اگر زندہ رہتے تو آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمکتے - کلام میں روانی - ترنم اور سوز کے نمایاں اثرات موجود ہیں -

طالب

منشی ونائک پرشاد نام - طالب تخلص بنارس کے رہنے والے اور مشہور ڈراما نویس تھے داغ دہلوی اور مرزا داغ سے استفادہ کیا - انہوں نے فن ڈرامہ کو ترقی دی اور اس کی زبان اور نفسِ مضمون کو درست کیا - اخلاقی اور قومی نظمیں بہت اچھی کہتے تھے - اِن کی زبان

بہت سادہ اور آسان تھی۔ ان کا ایک ڈرامہ لیل و نہار ہے۔ جو لارڈ لٹن کی اس نام کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی ڈرامے تصنیف کئے۔ بمقام بمبئی ۱۹۱۲ء میں انتقال کیا۔

جوش

شبیر حسین خان جوش ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ سیتا پور۔ لکھنؤ۔ علی گڈھ اور آگرہ میں تعلیم پائی۔ مگر خاندانی حالات نے تکمیل تعلیم کی اجازت نہ دی۔ آپ کا خاندان ملیح آباد کے مشہور رئیس خاندانوں میں سے ہے جو کئی پشتوں سے شاعر چلا آتا ہے۔ شروع میں آبائی جائداد کے انتظام میں مصروف رہے۔ اس کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں ادبی خدمت سر انجام دیتے رہے وہاں سے پنشن پاکر دلی آئے اور مشہور ادبی رسالہ "کلیم" نکالا۔ آپ ایک پر جوش شاعر ہیں آپ کا کلام بیشتر قومی رنگ سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

محروم

تلوک چند نام - محروم - تخلص - عیسٰی خیل ضلع میانوالی کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوئے - آپ کی طبیعت میں شاعری کا ملکہ فطری ہے - بارہ تیرہ برس کے ہوں گے کہ خود بخود موزوں مصرعے زبان پر آنے لگے - نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا نہ کبھی کسی سے اصلاح لی اپنے مذاق سلیم کے بل پر اپنے کلام کی اصلاح خود کرنے لگے - محروم نے غزلیں بہت کم کہی ہیں - زیادہ تر نظمیں لکھتے ہیں - ان کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ "گنج معانی" کے نام سے شائع ہو چکا ہے محروم نے اپنے کلام کا ایک حصہ اپنی جواں سال بیوی کے انتقال پر مخصوص طور سے لکھا ہے - جو بہت درد ناک ہے - محروم کا کلام بہت بلند پایہ ہے الفاظ کی برجستگی - عبارت کی روانی اور خیالات کی پاکیزگی ان کے اشعار کی نمایاں خصوصیات ہیں - سوز و گداز آپ کے کلام کے خاص جوہر ہیں - شعر کیا ہیں نشتر ہیں جو پڑھتے ہی سینے میں پیوست ہو جاتے ہیں -

جگر

شام موہن لال نام ۔ جگر تخلص ۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں بمقام بریلی پیدا ہوئے ۔ بی ۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد نائب تحصیلدار مقرر ہوئے ۔ شعر و سخن کا ملکہ فطری تھا ۔ ان کے کلام میں بے حد سوز اور درد پایا جاتا ہے ۔ طبیعت میں استغنا اور بے نیازی بدرجہ کمال ہے ۔ ایک مثنوی پیام ساوتری اور ایک چھوٹی مثنوی کرشن سداماں اُن کی مشہور تصنیفات ہیں ۔

۱؎ ۔ مندرجہ ذیل شعرا کے سوانح حیات نثر نگاروں میں دیکھیئے ۔ آزاد ۔ حالی ۔ چکبست ۔ کیفی ۔

۲؎ مصنف رقعات مرزا اسد اللہ خان غالب کا تذکرہ شعرا میں دیکھیئے ۔

۳؎ مولف کو افسوس ہے کہ چند نثر نگاروں اور شاعروں کے حالات زندگی دستیاب نہ ہو سکے ۔

نظم

میر محمد تقی میر

دنیائے فانی

سنو اے عزیزان ذی ہوش و عقل | کہ اس کارواں گہ سے کرنا ہے نقل
ہمیں پیش ہے شہ کہ درپیش ہے | جنھوں کو یہی راہ درپیش ہے
یہ بیٹھے جو ہیں سامنے ہیں کہاں | جہاں جملہ ہے ایک بزم رواں
جسے دیکھو چلنے کا گرم تلاش | یہ منزل نہیں جائے بود و باش
گدا ہو کہ ہو شاہ عالی تبار | تہ خاک سب کا ہے دار القرار
نہ یک بو نے خوش سے ہوا ہو گئی | وہ رنگینی باغ کیا ہو گئی
ملے خاک میں جھڑ کے گلہائے تر | پریشان ہوئے مرغ گلشن کے پر
پتنگوں نے تو خاک مسکن کیا | چراغوں نے بھی خانہ روشن کیا
گئی خاک دامن فشانی کے ساتھ | رہا آب سے بھی روانی کے ساتھ
نہ جدول رہے گی نہ سرو رواں | گلستان کہاں دیکھیے ہم کا مکان
زمین کا رہے گا یہی کیا بچاؤ | لپیٹے جائیں گے آسماں جیسے تاؤ
سکوں یاں کا دیکھا سراسر شتاب | چلے جاتے ہیں کوہ جیسے سحاب
جہاں ایک ماتم سرا ہے عجب | نہیں جائے باش اور جائے طرب
بھلا جی کے جانے کا کیا ہے بیاں | عیاں ہے کہ کہتے ہیں جان کو رواں
جوانی گئی موسم شیب ہے | شہود ایک دو روز کو غیب ہے
گیا شور سر سے جھکا ہے بہت | گئی وہ شتاب اب دل رکا ہے بہت
نہ وہ ذائقہ ہے نہ وہ ہے مشام | مزا کچھ نہیں ہو چکی صبح و شام

بلا ارتعاش تن زار ہے — ہر ایک عضو چلنے کو تیار ہے
ہوا حافظہ بسکہ نسیاں کا صرف — نہیں یاد آتا ہے دوشینہ حرف
ہوئے شعر کیا کیا فراموش ہائے — کہوں کیا گذرتی ہے خاموش ہائے
نہ پوچھو لب و لہجہ ہی طور ہے — سخن کرنے کا ڈھنگ ہی اور ہے
نہیں گوش کے کام سے کچھ فراغ — کہے ذوق صحبت کہاں ہے دماغ
نہ دیکھئے جو عینک نہ آوے نظر — کہے تو کہ اعمیٰ ہیں ہم بے بصر
صدا افسوس لطف سماعت نہیں — صدا دور سے جیسے آتی ہے کہیں
جوانی کی شب کیا بسر ہو گئی — سفیدی کی نوبت سحر ہو گئی
اب یہ پیری کی حالت ہے ہیں ہم اسپ — دموں پر غرض آرہے ہیں ہم اب
اگر بیٹھے ہو تو تھراتے ران اور ساق — نہیں بیٹھے کیونکر کہ جینا ہے شاق
جو بازو ہیں اپنے وہ بازو نہیں — اگر منہ کو دیکھو تو وہ رو نہیں
بدن کی ہوئی میری صورت ہی اور — دے آنکھیں نہیں ہے منہ تھوتن کے طور
چھند ناتواں جائے جہاں سنگ — سخن منہ پہ آتا ہے دو دن کے بجسم
شکن جلد میں دل کو پژمردگی — غریزی حرارت میں افسردگی
پھڑکتا رہا منہ پہ میں آب کا س — کہ ہوتا ہے بعد کا انعکاس
اگر نہ دیا سا بجھا جائے ہے — پھر اٹھ بیٹھوں تو جی جلا جائے ہے
بسیرہ دو شباب اک ستم کر گیا — لکھوں کیا کہ میں جیتے جی مر گیا

قلم رکھدے کہ میر ختم کلام
تمام اپنی صحبت ہوئی والسلام

قطعہ

بہ زندگی کا نہ کر گیا غافل — دکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اتنے منعم جہاں میں گذرے وقت رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال یک ازاں جملہ اک سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگین ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر چاہیے جس قدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے گیا ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
عیب طول کلام مت کریو کیا کروں میں سخن سے خوگر تھا

خوش رہا جب تلک رہا جیتا
میر معلوم ہے قلندر تھا

قطعہ

آئی نظر جو گور سلیماں کی ایک روز
لوح پہ اس مزار کے تھا یہ رقم ہوا
کاے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا میں بھی سر
پایان کار مور کی خاک قدم ہوا
کیا کیا عزیز دوست ملے میرؔ خاک میں
نادان یاں کسو کو کسو کا بھی غم ہوا

غزل

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

غزل

اے حبِ جاہ والو جو آج تاجور ہے — کل اس کو دیکھنا تم نہ تاج ہے نہ سر ہے
اے ہم سفیر بے گل کس کو دماغِ نالہ — مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے
شمعِ اخیرِ شب ہوں سن سرگزشت میری — پھر صبح ہوتے تک تو قصہ ہی مختصر ہے
اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو — نے اشک ہیں سرشت نے آہ میں اثر ہے

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہِ ساری دکانِ شیشہ گر ہے

مرزا محمد رفیع سودا

غزل

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا — ہم نے اسے ہر خار بیابان میں دیکھا
روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا — جس نور کو تو نے مہِ کنعان میں دیکھا
برہم کرے جمعیت کونین جو پل میں — لٹکا وہ تری زلف پریشان میں دیکھا
اے زخمِ جگر سودۂ الماس سے خو کر — کتنا وہ مزہ تھا جو نمکدان میں دیکھا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

غزل

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانئے ورنہ
کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
اے ابر قسم ہے تجھے رونے کی ہمارے
تجھ چشم سے ٹپکا ہے کبھو لختِ جگر بھی
کس ہستیٔ موہوم پہ نازاں ہے تو اے یار
کچھ اپنے شب و روز کی ہے تجھ کو خبر بھی
تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی
سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی

جاڑے کا موسم

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
جتنا عالم تھا کاشمیر ہوا — بلکہ کہیے کہ زمہریر ہوا
[illegible] دو دل پھر رخ پر نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
کپکپانے کو بیٹھتے ہیں سب یار — ٹھنڈ سے ہے جہاں کے دل میں غبار
[illegible] جو غور کر کے میں آپ — نکلے ہے منہ سے آسمان کے بھاپ
[illegible] پوشش زمیں کو پالے کا جھاڑ — پابدامن ہیں جس قدر ہیں پہاڑ
پانی پینے میں جگہ کہ کائی ہے — سبزہ وہ شال کی رضائی ہے
بس کہ یخ بستہ بحر میں ہے آب — برف کی ہے رکابی ہر گرداب
عکس پانی میں یوں ہے نقش پذیر — رہتی ہے زیر شیشہ جوں تصویر
نہیں ہے نہر باغ میں اس دم — بچۂ بط بھی یخ بچہ سے کم
تیغ سے کاٹتا ہے آب وہ چند — آب میں اس قدر ہوئی ہے گزند
اکڑی جاتی ہیں دیکھ سنبل کو — گٹھڑی ہو جائے گل کے غنچے پہ جو
دیکھ کر گل پہ سب نسیب برد — بھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد
کر پشمینہ پہنا کے سبزے تمام — بلبلیں مر رہیں اکڑ کے تمام
صرصر صبح جان کھوتی ہے — بتر سی دل کے پار ہوتی ہے
باد سے برگ تھرتھرے ہیں ہر بھانت — کہیے تو باجتے ہیں دانت سے دانت
جس طرف اب نگاہ جاتی ہے — جو ہی جوں بید تھرتھراتی ہے
کانپتے ہیں درخت و ارض و جبال — موسم دے ہے یا رہا یا بھونچال
آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے
بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یاقوت کے اب انگارے

ہے یہ آفت چراغ تک ڈرتے
جاڑا لگنے کا ہے تلک ہے حرف
دیں ہیں بہادر ٹھنڈ سے یکدست
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات
معدہ سردی کے ہاتھ گرم فروش
برف پڑتی نہیں ملک نداف
شب جو ٹھنڈی پہ ہرتی آئے
گر کسی شخص کو مرض تپ اب
زرد سرا سے دیکھیے جسکو
منعموں کے گھروں میں آج اور کل
پہنتے ہیں سمور اور قاقم
اس پہ جاڑے سے ہے یہ انکا حال
جھینکنا جاڑے کا جو جھینکیں ہیں
کوئی اب جا سے ہل نہیں سکتا
پھر جو کوئی نادان نکلے ہے
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور
اہل حرفہ کو کیجیے جو نگاہ
پیٹ کو صبر ہے بھٹیارا
سقا بھرے ہے بھر کے آنکھوں میں اشک
آ قناد بھر کے یوں بولے
دیکھو حلوائی کو جو بیٹھے ہیں
لگے ہے اب جو مرنے بیچارا
غرض ایسی ہی کچھ پڑی ہے ٹھنڈ

تو گویا گھر بلائے شمع ہے
بیٹی رہتی ہے نمدوں ہی میں برف
جو کوئی ہے سو آفتاب پرست
کاٹے کمبل میں رات کاٹے ہے رات
ابر دوش ہوا پہ بالا پوش
پھینکے ہے واسطے زمین کی لحاف
ابر میں یوں ٹھٹھر گئے رو جائے
تو وہ جاڑے ہی سے کیسے کرتب
دست زیر بغل ہے مثل سبو
میں پڑے ہے وہ دیکھے ہر منقل
ٹھنڈے کھینچے بہم سو دم
ناک سے چھوٹتا نہیں رومال
اک سخن ہے تو لاکھ چھینکیں ہیں
گھر سے باہر نکل نہیں سکتا
ٹھنڈ کے مارے جان نکلے ہے
جس طرح ناشپاتی و انگور
کاروبار ان کا ہو گیا ہے تباہ
ہائے اب کیا کروں میں بیچارہ
بار پانی نکالو چیر کے مشک
بنی تھی قند ہو گئے اولے
برفی چھٹ کچھ دوکان میں سکے نہیں
یہی کہتا ہے ٹھنڈ نے مارا
مٹ گیا زمہریر کا بھی گھمنڈ

عقدۂ اخفا ہے سردی کا مذکور — شعر بھی گر خنک ہوں رکھو معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا
ہو گئی ہے زباں بھی اولا

قصیدۂ بہاریہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل — تیغِ اُردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخِ ثمردار ہر ایک — دیکھ کر باغِ جہاں میں کرمِ عز و جل
قوتِ نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض — ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل
واسطے خلعتِ نوروز کے ہر باغ کے بیچ — آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گلِ نورستہ کی رنگ آمیزی — پوشش چھینٹ قلمکار بہ دشت و جبل
عکسِ گلبن پہ زمیں پر ہے کہ جسکے آگے — کارِ نقاشیٔ مانی ہے دوم دہ اوّل
نامہ باغ میں پڑتے ہیں گُہر ہائے تگرگ — ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بالا سے آب رواں عکس ہجوم گل کے — لپکے ہے سبزہ پہ از بس کہ ہوئے ہے بیکل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے — شمع ساں گرمیٔ نظارہ سے جاتی ہے پگھل
جڑ میں رو بیدگی خاک سے کچھ دور نہیں — شاخ میں گاؤ زمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک — دیں میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل
فکر یہ ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی — کہیں دعویٰ خدائی نہ کریں لات ہبل
حدِ ایام کے بیشش اب مدِ نامیہ سے — بچۂ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل
سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب ہر بار — جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل
دستِ گل خندہ دشاخ گل و گلزار بہم — بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پہ کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ — گل بہم پہنچے کہ عقدہ ہو کسی طرح کا حل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے شفا کے ناتا — چاہتی ہے کہ مساجت کرے سبزے کی بدل
چشمِ نرگس کی بصارت کو نہیں کچھ حد پہلے — غنچہ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے کجل

اس قدر جوشِ تماشا ہے کہ نرگس کی طرح — چشم سیارۂ گلستاں ہیں جھپکتی نہیں پل
آب جو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے — خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہو اس لطف سے ہر اک گل پہ — سایۂ ابر لعل میں جوں کیجیے زمرد کو حل
سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا — تیغ کہسار ہوئی بس کہ ہوئے ہے صیقل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے — گل کو دیکھے تو نگہ جاتی ہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم — پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرت لغزش یہ زمیں ہر باغ — جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا منہ کے بل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے — شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل
دانہ جس شور زمیں میں کہ پڑا دہقاں سے — سبزۂ دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا — گھر نے گرنے سے ہوئیں برگ وہاں آگے سے نکل
جوہری کو چمنستان جہاں ہیں اس فصل — آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل!

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
خشک گر از فیض ہوا سبز شود دہ منقل

خواجہ میر درد

غزل

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا
پر اسے آہ کچھ اثر نہ کیا

سب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما
اس طرف کو کبھو گذر نہ کیا

دیکھنے کو رہے ترستے ہم
نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا

تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا
جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا

کتنے بندوں کو جان سے کھویا
کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا

آپ سے ہم گذر گئے کب کے
کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا

کون سا دل ہے جس میں خانہ خراب
خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد
بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

غزل

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے ہم کیا کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے

دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس
تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے

آہ بس مت جی جلا تب جانیے
جب ترا افسوں کوئی اس پر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں
چشم نم آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لیکر چلے

جوں شرر اے ہستی بے بود یاں
بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

غزل

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بتخانہ تھا
ہم سبھی مہمان تھے واں اک توہی صاحب خانہ تھا

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

حیف کہتے ہیں ہوا گلزار تاراج خزاں
آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا

ہو گیا مہماں سرائے کثرت موہوم آہ
وہ دلِ خالی جو تیرا خاص خلوت خانہ تھا

بھول جا خوش رہ عبث وہ سابقے مت یاد کر
درد یہ مذکور کیا ہے آشنا تھا یا نہ تھا

غزل

چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہار باغ تو یوں ہی رہی لیکن کِدھر شبنم

ہمیں تو باغ تجھ بن خانۂ ماتم نظر آیا
ادھر گل پھاڑتے تھے جیب روتی تھی ادھر شبنم

کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف طبعوں کی
ہوئی آتش سے گل کے بیٹھنے رشک شرر شبنم

نہیں اسباب کچھ لازم سبکساروں کے اٹھنے کو
گئی اڑ دیکھتے اپنے بغیر از بال و پر شبنم

نہ پایا جو گیا اس باغ سے اصلا سراغ اس کا
نہ پلٹی پھر صبا ادھر نہ پھر آئی نظر شبنم

نہ سمجھا درد ہم نے بھید یاں کی شادی و غم کا
سحر خنداں ہے کیوں۔ روتی ہے کس کو یاد کر شبنم

غزل

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

وحدت میں تری حرف دوئی کا نہ آ سکے
آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

میں وہ فتادہ ہوں کہ بغیر از فنا مجھے
نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے

قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار
اپنے تئیں بھلا دے اگر تو بھلا سکے

یارب یہ کیا طلسم ہے ادراک و فہم یاں
دوڑے ہزار آپ سے باہر نہ جا سکے

اطفائے نار عشق نہ ہو آب اشک سے
یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے

منت شراب عشق وہ بےخود ہے جس کو حشر
اے دردؔ چاہیے لائے بخود پھر نہ لاسکے

سید انشاء اللہ خان انشا

غزل

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی مے خوار بیٹھے ہیں
بسانِ نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

شیخ امام بخش ناسخ

غزل

چوٹ دل کو جو لگے آہ رسا پیدا ہو
صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

کشتۂ تیغ جدائی ہوں یقیں ہے مجھکو
عضو سے عضو قیامت کو جدا پیدا ہو

ہم ہیں بیمار محبت یہ دعا مانگتے ہیں
مثل اکسیر نہ دنیا میں دوا پیدا ہو

کہہ رہا ہے جرس قلب بآواز بلند
گم ہو رہبر تو ابھی راہ خدا پیدا ہو

کس کو پہنچا نہیں اے جان ترا فیض قدم
سنگ پر کیوں نہ نشان کف پا پیدا ہو

اشک سب تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں
خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

یاں کچھ اسباب کے ہم بندے ہیں محتاج نہیں
نہ زباں ہو تو کہاں نام خدا پیدا ہو

گل تجھے دیکھ کے گلشن میں جو نہیں بھرتے دم
شاخ کے بدلے وہیں دست دعا پیدا ہو

نہ سر زلف بلا بل ہے درازی تیری
رشتۂ طول امل کا بھی سرا پیدا ہو

کس طرح صبح ہے نہ خورشید کو حیرت ہو جا
تجھ سا آفاق میں جب ماہ لقا پیدا ہو

کیا مبارک ہے مرا دشت جنوں اے ناسخ
بیضۂ بوم بھی ٹوٹے تو ہما پیدا ہو

غزل

کون وہ دل ہے جو محو رخ جاناں نہ ہوا
کون آئینہ ہے جو دیدۂ حیراں نہ ہوا

پر لگائے ہیں مجھے وحشت نے اڑا پھرتا ہوں
مجھ سا پامال کوئی خار بیاباں نہ ہوا

پھٹ گئے لاکھ گریبان بری حالت پہ
صبح کا ہجر کی شب چاک گریباں نہ ہوا

ہوں وہ دیوانۂ بیزار کہ صحرا میں کبھی
چین جز سایۂ اشجار مغیلاں نہ ہوا

لاکھ کافر کو کیا تو نے مسلماں ناسخ
ہے یہ افسوس کہ تو آپ مسلماں نہ ہوا

خواجہ حیدر علی آتش

غزل

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

اڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد اسیرِ دامِ رگِ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

بے یار ساز گار نہ ہوگا وہ گوش کو
مطرب ہمیں سناتا ہے اپنا ترانہ کیا

صیاد گل عذار دکھاتا ہے سیرِ باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

غزل

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

مقسوم کا جو ہے سو وہ پہنچے گا آپ سے
پھیلائیے نہ ہاتھ نہ دامن پساریے

طالب کو اپنے دیکھتی ہے دُنیا ذلیل و خوار
زر کی طمع سے چھانتے ہیں خاک نیاریئے

تنہائی ہے غریبی ہے، صحرا ہے، خار ہے
کون آشنا ہے حال ہے کس کو پکاریئے

تم فاتحہ بھی پڑھ چکے ہم دفن بھی ہوئے
بس خاک میں ملا چکے، چلیے سدھاریئے

نازک دلوں کو شرط ہے آتش خیالِ یار
شیشہ خدا جو دے تو پری کو اتاریئے

پنڈت دیا شنکر نسیم

آوارہ ہونا بکاولی کا تاج الملوک گلچیں کی تلاش میں

گُل کا جو الم چمن چمن ہے — یوں بلبلِ خامہ نعرہ زن ہے
گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ بازِ خواب آرام — یعنی وہ بکاولی گُل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — بے آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا تو وہ گُل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گُل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گُل — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل

سُنبل مرا تازیانہ لانا!
شمشاد اُنھیں سولی پہ چڑھانا

تھرائیں خواصیں صورتِ بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید

نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں

پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگیں کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چُرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

بولی وہ بکاولی کہ افسوس!
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا

نام اُس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اِس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں

گلچیں کا جو ہاے ہاتھ ٹوٹا
غنچہ کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل!
مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او بادِ صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سُنگھا، پتا نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی چہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزے سے راست مو براندام

انگلی لبِ جو پہ رکھے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سُن کے فریاد

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی
دستاویز اس کے ہاتھ آئی

خاتم تھی نام کی نشانی
انسان کی دست بُرد جانی

ہاتھوں کو مَلا کیا کہ ہیہات / خاتم بھی بدل گیا ہے بدذات
جس نے مجھے ہاتھ سے لگایا / وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے / کھال اُس کی جو کھینچئے سزا ہے
یہ کہہ کے جنون میں غضبناک / خوں روئی لباس کو کیا چاک
گل کا سا لہو بھرا گریباں / سبزے کا سا تار تار داماں
دکھڑا سے کہا سمن پری کو / اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ / آندھی سی اُٹھی ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی / گلچیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں ڈھونڈتی پھری وہ / ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثل باد جاتی / اُس رنگ سے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پت کہیں قلم بِن لگا ہے

تاجُ الملوک کی تلاش

گلچیں کا جو اب پتا لگا ہے / یوں شاخ قلم سے گل کھلا ہے
وہ باد چمن چمن خراماں / یعنی وہ بکاؤلی پریشاں
گلشن سے جو خاک اُڑاتی آئی / اُس شہر میں آتے آتے آئی
دیکھا تو خوشی کے پیچے تھے / گلچیں کے شگوفے کھل رہے تھے
گلبانگ ترانہ تھا جو جہاں تھا / ایک ایک ہزار داستاں تھا
پاتے ہی پتا خوشی سے پھولی / شاد ایسی ہوئی کہ رنج بھولی
جادو سے بنی وہ آدمی زاد . / انسانوں میں آملی وہ پری زاد .

سلطاں کی سواری آرہی تھی　　صورت جو نگاہ کی۔ پری تھی
پوچھا اے آدم پری زاد　　انساں ہے، پری ہے، کون ہے تو
کیا نام ہے اور وطن کدھر ہے　　ہے کون سا گل چمن کدھر ہے
دی اس نے دعا کہا بصد سوز　　فرخ ہوں تمہیں ابن فیروز
گل ہوں تو کوئی چمن بتاؤں　　غربت زدہ کیا وطن بتاؤں
گھر بار سے کیا فقیر کو کام　　کیا لیجئے چھوڑے گاؤں کا نام
پوچھا کہ سبب کہا کہ قسمت　　پوچھا کہ طلب کہا قناعت
باتوں پہ فدا ہوا شہنشاہ　　لایا بصد امتیاز ہمراہ
چہرے سے امیرزادہ پایا　　گھر لا کے وزیر اسے بنایا
نذریں لئے بندگانِ درگاہ　　دستور سے آملے بصد جاہ
دربار میں چاروں شاہزادے　　دیکھے تو کھلے وہ دل کے سادے
چاہا گلچیں کا امتحاں لے　　پوچھا کہ نگیں جو لے کہاں لے
بتلانے لگے وہ چاروں ناداں　　کوئی یمن اور کوئی بدخشاں
جانا کہ جو گل یہ لائے ہوتے　　خاتم کے نگیں بتائے ہوتے
تجویز میں تھا یہ صاحبِ فکر　　آیا تاج الملوک کا ذکر
ظاہر نہ کیا بطون اپنا　　طالع سے لیا شگون اپنا
منزل گہِ رہرواں بتا کے　　شام و سحر آئیں آپ آکے
رہرو کو دیا بلطف و اکرام　　آتے آرام جاتے پیغام

حکایتِ مُرغ و صیّاد

اِک مُرغ ہوا اسیرِ صیاد
دانا تھا وہ طائرِ چمن زاد

بولا جب اُس نے باندھے بازو
کھلتا نہیں کس طرح پہ ہے تو

بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مُشت پر ہوں

پالا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے مرے دام

بازو میں نہ تو مرے گرہ باندھ
سمجھاؤں جو پند اُسے گرہ باندھ

سُن کوئی ہزار کچھ سُنائے
کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے

قابو ہو تو کیجئے نہ غفلت
عاجز ہو تو ہاریئے نہ ہمت

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے
جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے

طائر سے یہ سُن کلام صیاد
بن داموں ہوا غلام صیاد

بازو کے جو بند کھول ڈالے
طائر نے تڑپ کے پر نکالے

اِک شاخ پہ جا چہک کے بولا
کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا

ہمت نے مری مجھے اُڑایا
غفلت نے تری تجھے چھڑایا

دولت نہ نصیب میں تھی تیرے
تھا لعل نہاں شکم میں میرے

دے کر صیاد نے دلاسا
چاہا پھر کچھ لگائے لاسا

بولا وہ کہ دیکھ کر گیا جل
طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل

اربابِ غرض کی بات سُن کر
کر لیجئے یک بیک نہ باور

حکیم مومن خاں مومن

غزل

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے — نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے
تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائینگے تصویر جو حیراں ہونگے
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے
کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں — گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے
ہم نکالینگے سن اے موجِ ہوا بل تیرا — اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی — زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے
داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ — یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہونگے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی — پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے
صبر یارب مری وحشت کا پڑیگا کہ نہیں — چارہ فرما بھی کبھی قیدیِ زنداں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

غزل

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھے پیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دم بدم
گلۂ ملامتِ اقربا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کوئی بات ایسی اگر ہوئی جو تمہارے جی کو بری لگی
تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

قصیدہ

یادِ ایامِ عشرتِ فانی! — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
دائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملے — ہائے کیسے بلند ایوانی
حسرت دلق گدا ہوتے ہیں دے کے — زینت افزائے تاجِ سلطانی
آپ کا شانہ فرشِ خاک ہوا — کیسے قالیچہ ہائے کاشانی
یا فرصت و نشاط سے مجھے تھا — دعویٔ قیصری و خاقانی
یاں نہیں ہے مرقع و کشکول — تا کروں تازہ رسمِ ساسانی
مسند گوہریں کا خیال آیا — پوچھتے کیا ہو درجہ گریانی
بالشِ سنگ و خواب واویلا — بارِ خاطر ہوئی گراں جانی
ہم ہیں اور حسرتِ مئے گلگوں — خوں پلاتا ہے قہرِ یزدانی

زہر ملتا نہیں کہ پی جاؤں
اب کہاں وہ شراب ریحانی

وہ گزک کیسی وہ کباب کہاں
نقلِ مجلس ہے دل کی بریانی

یا نہالوں پہ تھانِ اطلس سے
جب طرہ گر تھی سپہر سامانی

یا یہ احوال ہے کہ چاک ہوا
تنگیوں سے لباسِ عریانی

کیا کہوں اپنی گردشِ ایام
صبحِ نوروز ہے شبستانی

اس چمن زار کو خزاں تھی ضرور
میں نے کیا بات تہ کی پہچانی

تیر بارانِ فاقہ نے مارا
یک بیک چکی تھی کلاہِ بارانی

پنبۂ داغِ دل کو حیراں ہوں
نہ رہا خرقۂ زمستانی

ناسزا وہ سازِ برگِ عیش و نشاط
قوّتِ افزائے روحِ انسانی

ایک دن یوں ہجومِ یاراں تھا
جیسے اب جمعِ پریشانی

مجھے دونوں جہاں سے کھو دیا
کیا کہوں ظلمِ چرخِ دورانی

کر دیا گردشِ سپہر نے حیف
برجِ خاکی تغیرِ کیوانی

ایسی وحشت سرا میں آئے کون
بے خودی کر رہی ہے دربانی

نکتہ سنجوں سے جی یہ ہے پوچھوں
کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

کیا ہوئی وہ بلندیِ دیوار
کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی

جائے گل ہیں چمن میں ریزہ سنگ
گاؤ کرتی ہے نازِ ریحانی

اٹ گئے حوض و نہر حیراں چشم
ایک قطرہ کہیں نہیں پانی

نہ رہا کچھ نشانِ آبِ رواں
خاک سارے جہان میں چھانی

سقفِ رنگیں و درِ نگار کہاں
جز سپہر و نجومِ نورانی

شورِ زاغ و زغن ہے سمع خراش
اب کہاں بلبل و غزل خوانی

نظر آتی نہیں وہ تصویریں
نقشِ دیوار کیوں نہ ہو فانی

اے فلک دل کو داغ کرتی ہے
روز خورشید کی درخشانی

بے زری سے مری تجھے حاصل
کچھ نہ ہو گا بجز پشیمانی

جانِ مومن پہ گو نہ گو نہ ستم ۔۔۔ کافر اتنی بھی نا مسلمانی
اس سے کاوش نہ کر نہ ہو ظالم ۔۔۔ آپ اپنا تو دشمن جانی
تجھے معلوم ہے کہ ہے وہ کون ۔۔۔ کھول دوں میں یہ رازِ پنہانی
مدح خوانِ شہِ وزیر لقب ۔۔۔ ختم جس پہ ہوئی سخندانی
پایہ سنجِ کمالِ اہلِ کمال ۔۔۔ فارقِ فتلزمی و عمانی
کیا کہوں اس کے دستِ ہمت کی ۔۔۔ میں گہر باری و زر افشانی
اس کے احساں سے غرۂ شوال ۔۔۔ اہل تقویٰ کو سلخِ شعبانی
مور کو وہ جو لا دے ڈالے ۔۔۔ شوکت و حشمتِ سلیمانی
کر دے سارے جہان کو سیراب ۔۔۔ بحرِ ہمت کی اس کے طغیانی
اس کے عہدِ کرم کی نسبت سے ۔۔۔ بڑھ گئی عمرِ عالمِ فانی
بے سخاوت اُسے قرار کہاں ۔۔۔ کہ ہے عادت طبیعتِ ثانی
اس کے ہے روزگار میں یکساں ۔۔۔ ابر کو بہمنی و نیسانی
دوری اپنی نہیں ہے مانعِ فیض ۔۔۔ مہر کو کیا حجابِ ظلمانی
گرگ نے دورِ عدل میں اس کے ۔۔۔ سیکھ لی راہ و رسمِ چوپانی
آشیانِ عقاب و شاہیں میں ۔۔۔ روز نہ کنجشک کی ہے مہمانی
حملۂ شیر گیر سے اس کے ۔۔۔ نعرہ زن ضیغمِ نیستانی
تیرِ خارا شگاف سے اس کے ۔۔۔ لعل جو ہے سو لعلِ پیکانی
زیرِ راں اس کے توسنِ چالاک ۔۔۔ رشکِ اسپِ سپہر گردانی
اس سے دیتے سپہر کو تشبیہ ۔۔۔ گر نہ ہوتا ستارہ پیشانی
مانعِ سعیِ دل پسند اس کو ۔۔۔ ملکِ عالم کی تنگ میدانی
تیرے اوصاف کے صحیفے میں ۔۔۔ صنعتِ کارِ نامۂ مانی
شعلۂ شمعِ بزم کو تیرے ۔۔۔ دعوئ حسنِ ماہِ کنعانی
دشت گردی کے شوق نے مارا ۔۔۔ ہوں تو دیوانہ لیک زندانی

بعد یک چند گر خدا چاہے — میں ہوں اور تیرے در کی دربانی
آکے اس بزم میں دکھاؤں گا — شعلہ ہائے خرد کی نیرانی
میرے سینے کے صفحے میں ہے رقم — علم دانا دلانِ یونانی
مہر افلاکِ علم و دانش ہوں — فطرتی ہے مری درخشانی
میں روشن دانِ حکم بوجیسی — میں ادا فہم سیر کیوانی
ہوں وہ نباض جس کے ناخن میں — حرکاتِ عروقِ شریانی
آئینہ ہے صفا سے دل میرا — کیا ہوا گر نہیں ہے حیرانی
میرے خامہ کے جوشِ گریہ سے — روئے دیتا ہے ابرِ نیسانی
میرے ربطِ کلام کو پہنچے — نثرِ سعدی نہ نظمِ سلمانی
جانفزائی مرے سخن کی دیکھ — سم گئے خضر آبِ حیوانی
میرے گوہر تمام ناسفتہ — میرے یاقوت سب بدخشانی
میری نیرنگیِ تخیل سے — سیمیاگر ہے روحِ نفسانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں — جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں — میری تقریر کی سی تابانی
ملک مانی کا شہر یا ہے — دیکھ خسرو مری قلمرانی
میری نسبت سے خاکِ ہند کو ہے — رونقِ سرمۂ صفاہانی
آج ہوتا کمال تو کہتا — اب تخلص سزا ہے نقصانی
مومن اب ختم کر دعا پہ سخن — تا کجا انتہائے طولانی
جب تلک باعثِ نشاط و ملال — ہے وصال و فراقِ جانانی
تیرے حساد و رنج گوناگون — تیرے احباب او رتن اسانی

تیرا اقبال روز ہو افزوں
جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

میر ببر علی انیس

نمودِ صبح

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروانِ صبح
ہونے لگا اُفق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح
ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا
عالم تمام مطلعِ انوار ہو گیا

یوں گلشنِ فلک سے ستارے ہوئے رواں
چن لے چمن سے پھولوں کو جس طرح باغباں
آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں
مرجھا کے گر گئے ثمرِ شاخِ کہکشاں
دکھلائے طور بادِ سحر نے سموم کے
پژمردہ ہو کے رہ گئے غنچے نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ نور کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر

وہ سُرخیِ شفق کی اُدھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم سے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

ظہورِ صبح

چھوا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح — گلزارِ شب خزاں ہوئی آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک دُرِ انجم نثارِ صبح — سرگرمِ ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھِلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم — مرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تابِ نہر وہ موجوں کا پیچ و خم — سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار — تھے طائروں کے غول درختوں پہ بیشمار
چلنا نسیمِ صبح کا رہ رہ کے بار بار — کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغِ بہشتِ نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

دُنیا

دُنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں — وہ گل ہے یہ گل بوئے طراوت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوستِ محبت نہیں جس میں — وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں
ہے درد و الم شامِ غریباں نہیں گذری
دُنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

گودی جو کبھی ماں کی کبھی قبر کا آغوش گُل پیرہن اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
سرگرمِ سخن ہے کبھی انسان کبھی خاموش گہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بسرِ دوش
اِک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مُسن کو
شب کو جو چھپر کھٹ پہ تو تابوت میں دن کو
کرتا نہیں غربت میں کوئی آکے مدد تک گر ساتھ گیا ہے تو کوئی قبر کی حد تک
پھر آتے ہیں روتے ہوئے پہنچا کے لحد تک وہ خانۂ تاریک میں تنہائی ابد تک
نہ دوست نہ احباب نہ ہم بزم گئے ہیں
تنہا یوں ہی شاہانِ اولو العزم گئے ہیں
شادی ہو کہ اندوہ ہو آرام ہو یا جور دُنیا میں گذر جاتی ہے انساں کی بہر طور
ماتم کی کبھی فصل ہے عشرت کا کبھی دور ہے شادی و ماتم کا مرقع جو کرو غور
کس باغ میں آسیبِ خزاں آ نہیں جاتا
گُل کون سا کِھلتا ہے جو مُرجھا نہیں جاتا

آرامِ جگر

نعمت کوئی دُنیا میں پسر سے نہیں بہتر راحت کوئی آرامِ جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر نکہت کوئی بوئے گُلِ تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاجِ دلِ مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی راح یہی رُوح یہی ہے
ماں باپ کا دل غنچۂ خنداں ہے اِسی سے وہ گُل ہے کہ گھر رشکِ گلستاں ہے اِسی سے
سب راحت و آرام کا ساماں ہے اِسی سے آبادیِ کاشانۂ انساں ہے اِسی سے

کس طرح کھلے دل کہ جگر بند نہیں ہے
گھر قبر سے بدتر ہے جو فرزند نہیں ہے

یہ وہ ہے عصا پیر جواں رہتا ہے جس سے — یہ وہ ہے نگیں نام و نشاں رہتا ہے جس سے
وہ شمع ہے پُرنور جہاں رہتا ہے جس سے — وہ دُر ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

بکتے نہیں یہ مال زر و مال کے بدلے
موتی بھی لٹا دیتے ہیں اس لال کے بدلے

دنیا میں بس اک مرجعِ آمال یہی ہے — ثروت یہی حشمت یہی اقبال یہی ہے
سرمایہ یہی نقد یہی مال یہی ہے — گوہر یہی یاقوت یہی لال یہی ہے

دل بند ہو پہلو میں تو غم پاس نہیں ہے
کچھ پاس نہیں گر یہ رقم پاس نہیں ہے

ماں باپ کی آسایش و راحت ہے پسر سے — تلخی میں بھی جینے کی حلاوت ہے پسر سے
خوں جسم میں آنکھوں میں بصارت ہے پسر سے — ایامِ ضعیفی میں بھی طاقت ہے پسر سے

آرامِ جگر قوتِ دل راحتِ جاں ہے
پیری میں یہ طاقت ہے کہ فرزند جواں ہے

وہ شے ہے خوشی در پہ کھڑی رہتی ہے جس سے — وہ چین ہے راحت کی گھڑی رہتی ہے جس سے
وہ لعل ہے امید بڑی رہتی ہے جس سے — وہ دُر ہے یہ دُر جان لڑی رہتی ہے جس سے

آرامِ جگر تاب و تواں ساتھ ہے اس کے
پھرتا ہے جدھر راحتِ جاں ساتھ ہے اس کے

مرزا سلامت علی دبیرؔ

صبح کی آمد

جب سرنگوں ہوا علمِ کہکشانِ شب
خورشید کے نشاں نے مٹایا نشانِ شب
تیرِ شہاب سے ہوئی خالی کمانِ شب
تانی نہ پھر شعاعِ قمر نے سنانِ شب
آئی سحر جو زیورِ رنگیں سنوار کے
شب نے سپر ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیرِ مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب
پھر تیغِ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب
تھا بسکہ گرمِ غضبِ بیضا سے آفتاب
باقی رہا نہ چشمۂ نیلوفری میں آب
محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا
باغِ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوششِ خوں سے رگِ بستہ میں مبتلا شفق
فصادِ صبح آیا لیے نشتر و طبق
کھولی شفق کی فصد تو رنگِ اُفق تھا فق
گل رنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق
خونِ شفق میں سرخ قضا نے قلم کیا
اور خط و خالِ روزِ شہادت رقم کیا

تلوار کی تعریف

جس مورچے میں بیلی تیغ دو سر گئی — چنگے پھلوں کو سایے سے دیوانہ کر گئی
ہر صف میں خاک اڑا کے اِدھر سے اُدھر گئی — پر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی

عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا

آگے کبھی بڑھی، کبھی پیچھے کو پھر پڑی — سر پہ جو لڑکھڑائی تو شانوں پہ گر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مُصر پڑی — اُستاد اُن سے پوچھتے یہ تن کے سر پڑی

اٹھی، گری، بلند ہوئی، پست ہو گئی
پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی

تلوار کی کاٹ

جس صف پہ گری صاف صفائی نظر آئی — جب غول پہ چمکی تو ہوا غل اِدھر آئی
جھپٹی جو پرے پہ تو لہو میں یہ بھر آئی — اک اک کو خبر بھی نہ رہی اپنی پرائی

لہرا کے جو بیٹھی تو جگر کاٹ کے اٹھی
ناگن کی طرح شبنم خوں چاٹ کے اٹھی

چھل بل تھی، چھلاوہ تھی، طلسمات تھی، اسرار — چالاک، سبکسار، طرحدار، نمودار
نیزہ کہیں خنجر کہیں اور تھی کہیں تلوار — بجلی تھی کسی جا تو کہیں نور کہیں نار

سیماب تھی، سیلاب تھی، طوفان تھی، ہوا تھی

شعلہ تھی۔ شرارہ تھی۔ قیامت تھی۔ بلا تھی

گھوڑے کی تعریف

اللہ رے نزاکت فرسِ غنچہ دہن کی — آتی ہیں نظر صاف رگیں گل سے بدن کی
حیرت ہے اگر شیر کی صورت ہو ہرن کی — رانوں میں ٹھہرتا نہیں جو سو گز کے رن کی

دُھن ہے کہ گزر جائے تہِ چرخِ بریں سے
ہر جست میں یہ قصد کہ اُڑ جاؤں زمیں سے

[illegible] یہ شمشیر ہے پھل میں یہ ہے تیر — لڑنے میں یہ تقدیر بگڑنے میں یہ تدبیر
جانے میں سولوں کی دُعا آنے میں تاثیر — چھپنے میں یہ ہے خواب عیاں ہونے میں تعبیر

مضموں ہیں بہت پر کوئی دلچسپ نہیں ہے
اسرار ہے اعجاز ہے یہ اسپ نہیں ہے

ولی محمد نظیر

خُدا کی باتیں خُدا ہی جانے

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی ہندسی کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل کوئی ہے فاضل کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہے کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں حیلے یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا - کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

ہوا کے اوپر جو آسماں کا بے چوبا خیمہ یہ تن رہا ہے
نہ اس کی میخیں نہ ہیں طنابیں نہ اس کی چوبیں اَدھر کھڑا ہے
اِدھر ہے چاند اور ادھر ہے سورج ادھر ستارے ادھر ہوا ہے
کسی کو مطلق خبر نہیں ہے کہ کب بنا ہے یہ کاہے کا ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

فلک تو کہنے کو دور ہے گا زمیں پہ اب جو یہ بسترا ہے
کھڑے ہیں لاکھوں پہاڑ جس پہ فلک سے سر جن کا جا لگا ہے
ہزاروں حکمت کا اک بچھونا یہ پانی اوپر جو بچھ رہا ہے
بہت حکیموں نے خاک چھانی کوئی نہ سمجھا یہ بھید کیا ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

زمیں سے لے کر جو آسماں تک بھری ہے لاکھوں طرح کی خلقت
کہیں ہے ہاتھی کہیں ہے چیونٹی کہیں ہے رائی کہیں ہے پربت
یہ جتنے جلوے دکھا رہی ہے خدا کی قدرت خدا کی صنعت
جو چاہے کھولے یہ بھید اس کے کسی کو اس کی نہیں ہے قدرت
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

کوئی ہے ہنستا کوئی ہے روتا کہیں ہے شادی کہیں غمی ہے
کہیں ترقی کہیں تنزل کہیں گماں اور کہیں یقیں ہے
کوئی گھٹا زمیں کے اوپر کوئی خوشی سے فلک نشیں ہے
یہ بھید اپنا وہ آپ جانے کسی کو مطلق خبر نہیں ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

عجب طرح کی وہ رنگیں چوپڑ غرض بچھائی ہے اس خدا نے
کوئی ہے چٹکی کسی کا جگ ہے بھرے ہیں یاں زردیں ہی خانے
جو پانسہ پھینکے بنا بنا اور داؤں کتنے ہی دل میں ٹھانے
جو چاہتا ہو اٹھارہ آویں تو اس کے پڑتے ہیں تین کانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہے دن اور رات اس جا
جو مات چاہے کرے کسی کو نہ آوے ہرگز اس کو مات اس جا
ہزاروں منصوبے باندھے دل میں بنا کے چالوں کی گھات اس جا
میاں یہ اک چار چوک قائم سبھوں کی بازی ہے مات اس جا

پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

عجب طرح کے ورق بنے ہیں کوئی سکندر کوئی گدا ہے
کسی کے سر پہ ہے تاج شاہی کسی کی شمشیر پہ جفا ہے
کوئی امیر اور کوئی وزیر اور کوئی فقیری میں دل خفا ہے
سبھوں کو اس جا خیال آیا یہ حق کی قدرت کا کیفیہ ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

یہ کون جانے کہ کل کیا کیا اور آج مالک وہ کیا کرے گا
کسے بگاڑے کسے سنوارے کسے ڈھاوے کسے بھرے گا
کسی کے گھر کون ہووے پیدا کسی کے گھر کون سا مرے گا
کسی کو ہرگز خبر نہیں ہے کہ کیا کیا ہے وہ کیا کرے گا
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

عجب طرح کا یہ جال ہیگا کمند کہئے دیا کمندا
نہ چھوٹے چیونٹی نہ چھوٹے ہاتھی نہ کوئی وحشی کوئی پرندا
سبھوں کی گردن پھنسی ہے اس میں کسی کا ٹوٹا نہ ایک پھندا
نظیر اتنی مجال کس کی کہاں خدا اور کہاں یہ بندا
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں دانا کروڑوں پنڈت ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہوئے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے
حتیٰ کہ اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے اور آدمی ہی نور
یاں آدمی ہی پاس ہے اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حسن و قبح میں ہے یاں ظہور
شیطاں بھی آدمی ہے جو کرتا ہے مکر و زور
ہادی و رہنما ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی قراں اور نماز یاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی کو تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی
چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرتے ہیں آدمی ہی کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں مردے کے کار و بار
اور وہ جو مر گیا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہے اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

شیخ محمد ابراہیم ذوق

غزل

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی
کیا اُٹھے سر بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

آئی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ سنگ ہمارا
ہے سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سیہ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہ روِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

غزل

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہے وہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یوں ہی جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

غزل

ہنگامہ گرم ہستی ناپائدار کا — چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا — پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

آیا ہے گر تو آؤ کہ سینہ سے چل کے اب — آنکھوں میں آ کے ٹھیرا ہے دم انتظار کا

ہو پاک بد اصولوں کی خلش گر ہے کیا خطر — کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

پہنچے گا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر — مکتوب شوق آہ اسکے پڑھے بیقرار کا

تو بہ میں ہے گرہ ہے مری آنکھ سوئے در — ٹپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا

قاصد لکھوں لفافہ کو خط غبار سے — تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی — ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

غزل

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آب بقا تو کیا
مانگو تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے
پیٹے ہے سنگ شیوۂ حرفا کی کوئی
جب قبضہ خوش کو آئے تو پہلے پکار دے
اتنا جو ہے تو ذوق تبسم کا یہ خیال ہے
کیا جانئے کیا کرے جو خدا اختیار دے

قصیدۂ تہنیتِ صحت

واہ وا کیا معتدل ہے باغِ عالم کی ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا
ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا
ہوگیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
بیدِ مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
رنگ میں ہر گل کے سرخی ہے جو لا برگِ حنا
نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت
بن گئی تریاق افیوں زہر میٹھا ہو گیا
نیش کی جا نوش ہے دُنبالۂ زنبور میں
کام شہد افعی کے ہے مہرہ بجائے آبلا
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور
چاہیے واقف نہ ہو دورانِ ستم سے آسیا
آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

فرق چاہا یاں تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جُدا
صبح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی
لیکن اِس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا
بھوک کی شدت سے اس کو یک نفس فرصت نہ ہو
قرص سے خورشید کے جب تک نہ کر لے ناشتا
رات بھر ٹھونکا کیا انجم کے دانے چرخِ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا
پہنچی تا تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانے میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا
کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کے نہیں مطلق شکم میں اِمتلا
ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا
رکھے گا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا
دے گا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینک دے گی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا
اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جب کہ ہو اس کی نویدِ غسلِ صحت جاں فزا
وہ ولی عہدِ جہاں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا
تقویت کا یہ اثر ہے عام جو ہیں برگِ زرد
ہیں مقویِ دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا
شادیِ صحت سے اس کے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

غزل

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غزل

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی مُنہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مُدعا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دُعا کیا ہے
میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مُفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

غزل

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گذر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں
قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں
غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غزل

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا
حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیا
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

ہے اب اِس معمورہ میں قحطِ غمِ اُلفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا

غزل

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی - دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دلستانی ہے
لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

غالب اور ذوق کے سہرے

نواب زینت محل کے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر بیگم کے ایماء سے غالب نے یہ سہرا کہا اور زر نگار کاغذ پہ لکھ کر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گذرانا۔

غالب کا سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہربار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رک گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اِترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اِک چیز
چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رُخِ روشن کی چمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائے گا تابِ گرانباریِ گوہر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں اِس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد ذوقؔ جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے تو دیکھو۔ انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیرو مرشد! درست! بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو۔ اور کہا مقطع کو بھی دیکھا؟ عرض کی حضور دیکھا۔ غرض بیٹھ گئے اور عرض کیا:-

ذوق کا سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغانِ نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اتراتی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طُرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے اُٹھا کر سہرا
کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِّ خوش آبِ مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعوےٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

یہ سہرا عام دربار میں پڑھا گیا۔ اور اس کے بعد شہر کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور۔ ہو گیا کچھ اور۔ یہ قطعہ لکھکر حضور میں گذرانا۔ سب طرف سے تعریفیں ہوئیں ؛

غالب کی معذرت

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزاد رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

.. ..

منشی امیر احمد امیرؔ مینائی

غزل

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر — سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کوہ کن کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں — ہے جو عاشق دلِ معشوق میں گھر پیدا کر
رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا — نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر
قطرۂ اشک بنے گوہرِ گوشِ جاناں — آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
آخرت میں عملِ نیک ہی کام آئیں گے — پیش ہے تجھ کو سفر زادِ سفر پیدا کر

عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیرؔ
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

غزل

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی — کیا کوئی لالہ زار ہے دنیا
ہر جگہ جنگ ہر جگہ ہے نزاع — عرصۂ کارزار ہے دنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار — سخت ناپائیدار ہے دنیا
ایک جھونکے میں ہے اِدھر سے اُدھر — چار دن کی بہار ہے دنیا
کوئی کافر کوئی مسلماں ہے — مجمعِ نور و نار ہے دنیا

بد تر اس کو سمجھ خزاں سے امیرؔ
دیکھنے کو بہار ہے دنیا

غزل

کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں
دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں

سوتے ہیں لحد میں سونے والے
جو جاگتے ہیں وہ رو رہے ہیں

اَربابِ کمال چل بسے سب
سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں

پیری میں بھی ہم ہزار افسوس
بچپن کی نیند سو رہے ہیں

روئیں گے ہمیں رُلانے والے
ڈوبیں گے وہ جو ڈبو رہے ہیں

پوچھے کوئی دیدہ ہائے تر سے
کیوں نامِ وفا ڈبو رہے ہیں

آئے گی نہ پھر کے عمرِ رفتہ
ہم مفت میں جان کھو رہے ہیں

کیا گریہ بے اثر سے حاصل
اِس رونے پہ ہم تو رو رہے ہیں

فریاد! کہ ناخدائے کشتی
کشتی کو مری ڈبو رہے ہیں

کیوں کرتے ہیں غمگسار تکلیف
آنسو مرے منہ کو دھو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو
کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں
زانو پہ امیر سر کو رکھے
پہر دن گذرے کہ رو رہے ہیں

نواب مرزا خاں داغ

غزل

کسی کا مجھکو نہ محتاج کر زمانے میں — کمی ہے کون سی یارب ترے خزانے میں
اس انفعال سے گھر چھوڑنا پڑا مجھکو — وہ آج آئیں گے میرے غریب خانے میں
جو ہو اجازتِ صیاد، طاقتِ پرواز — قفس کو لے کے چلا جاؤں آشیانے میں
ملا نہ خرمنِ ہستی سے کچھ سوائے اجل — بھرا ہے زہر مگر اس کے دانے دانے میں
نہ رکھ مجھے قفسِ آہنی میں اے صیاد — بجائے خار تھے گل میرے آشیانے میں

مآلِ کار خدا جانے داغ کیا ہوگا
خدا سے کام پڑا آخری زمانے میں

غزل

ان آنکھوں سے کیا کیا تماشہ نہ دیکھا — حقیقت میں جو دیکھنا تھا نہ دیکھا
نہ ہمت نہ قسمت نہ دل ہے نہ آنکھیں — نہ ڈھونڈا نہ پایا نہ سمجھا نہ دیکھا
وہ کب دیکھ سکتا ہے اس کی تجلی — جس انسان نے اپنا جلوا نہ دیکھا
اسے دیکھ کر اور کو بھی جو دیکھے — کوئی دیکھنے والا ایسا نہ دیکھا
گیا کارواں چھوڑ کر مجھکو تنہا — ذرا میرے آنے کا رستا نہ دیکھا

تری یاد ہے یا ہے تیرا تصور
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

غزل

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
کچھ تعلق رہا نہ دُنیا سے — شغل ایسا بتا دیا تو نے
کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے — کیا کہوں میں کہ کیا دیا تو نے
عمر جاوید خضر کو بخشی — آبِ حیوان پلا دیا تو نے
کہیں مُشتاق سے حجاب ہوا — کہیں پردہ اُٹھا دیا تو نے
جس قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اُس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
مجھ گنہگار کو جو بخش دیا — تو جہنم کو کیا دیا تو نے

داغ کو کون دینے والا تھا
جو دیا اے خدا دیا تو نے

مولوی محمد حسین آزاد

اُولوالعزمی

اقبال اِک برس جو مرا تاجِ سر ہوا
شملے میں مجھکو موسمِ سرما بسر ہوا
جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہوکے جم گئے
دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحافِ برف میں منہ کو لپیٹ کر
دیکھو جدھر کو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سفید
پتے سبھی آ کے جاڑے نے سب دور کر دیئے
اور تھے درخت برف نے بلور کر دیئے
اِک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آگیا
گھر سے نکل کے سوئے بیاباں چلا گیا
دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اِک تازہ نوجوان
ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے ہوئے نشاں
ہے اُس پہ روشنی سے لکھا "ہاں بڑھے چلو"
ہمت کا اس کی حال میں لکھکر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے

پیدا شکوہ و شان تھی اس کے نشان سے
چلتا قدم اٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
کیا جانے فکر مند تھا یا کیا ملال تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا
لیکن خوشی اس کی آواز کرتا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا۔ ہاں بڑھے چلو
وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا
دامن تھا اس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آگے کچھ سیاہئ شب راہ پہ پڑی
آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوش حال گھر اور ان میں خوشی بولتی ہوئی
باتیں کہ دل سے غم کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اجالے تھے سرِ دیوار سامنے
دروازوں سے چراغ تھے ماشاءاللہ سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کا ساماں پکارتے
تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا
اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ بچ بچ بچا بچا
سمجھانے والے سب یوں ہی سمجھا کے رہ گئے
اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر کہا تو کہا۔ ہاں بڑھے چلو

پھیرا تھا منہ ابھی تو شب تیرہ فام نے
اک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اسے تن بدن دیا
موئے سفید نے تھی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے
اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑوں میں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
مانا کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں
جانا کہاں ہے جان کا بھی تجھکو ڈر نہیں
یہ سن کے نکلا شعلہ دل نوجوان سے
گویا ستارا ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اس نے دی کڑک کے صدا۔ ہاں بڑھے چلو
تھی رات رنگ ابھی رخ عالم پہ پھیرتی
گہ مشک اڑاتی تھی کبھی عنبر بکھیرتی
کیا جانے ہم جنگل کے کدھر سے کدھر گئے
دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آوازے دے رہے
ل جل کے ساتھ جیسے ہوں دمسازدے رہے

پانی کی ریں پہاڑ سے آوازیں آ رہیں
جو زیر و بم کے دور سے ہیں سر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے
کی رمز گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے
آرام کیجیے رات ہے آرام کے لیے
دیکھا پری کو اس نے نگہِ چشم ناز سے
اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے
پھر اتنا مسکرا کے کہا۔ ہاں بڑھے چلو!
ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کر وہ رخِ گل کو چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم تھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے چلتے تھے

سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر
بولا جوان شیر کی مانند دھاڑ کر
آرام کی نہیں ہے یہ جا۔ ہاں بڑھے چلو

تبدیل جبکہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا
اِک مدرسے کے آگے سے اُس کا گذر ہوا
تھا پاس اِک خرابۂ مسجد پڑا ہوا
مُلّا تھا اُس میں بر سرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقدیر کھینچتا
دوزخ کی اور بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پہ تھا دلوں کو لُبھا رہا
دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اُس کی باتوں میں مدہوش ہو رہے
اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اُس مردِ پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پُرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اُڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ فسانے گذر گئے
وہ رات ہو چکی وہ زمانے گذر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا۔ ہاں بڑھے چلو

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے
بے پاؤ بے مدار ہر اک اس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ

ہمت کے معرکوں کے لیئے خوب چاہیے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طُرفہ حال ہے
مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض
ساقی سے مُدّعا ہے دیا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانا ہے
افلاس اُن کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت ہے کام ہیں
محنت سے پیٹ پال رہے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے
تنخواہوں پر ہیں محنتیں اُستاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام
کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام
آزاد کی یہی ہے صدا۔ ہاں بڑھے چلو!

خواجہ الطاف حسین حالی

اُمید

اے مری اُمید مری جاں نواز
اے مری دلسوز مری کارساز

میری سپر اور مرے دل کی پناہ
درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

عیش میں اور رنج میں میری شفیق
کوہ میں اور دشت میں میری رفیق

کاٹنے والی غمِ ایام کی!
تھامنے والی دلِ ناکام کی!

دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ
تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ

تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ
تو نے اُٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ

جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج
کھول دیئے تو نے قناعت کے گنج

تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس
تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس

خاطرِ رنجور کی درماں ہے تو
طالبِ مہجور کی ایماں ہے تو

ہوتی ہے تو پُشت پہ ہمت کی جب
مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب

ہاتھ میں جب آکے لیا تو نے ہات
سات سمندر سے گذرنا ہے بات

ساتھ مِلا جس کو ترا دو قدم
کہتا ہے وہ یہ ہے عرب اور عجم

گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ
سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ

عزم کو جب دیتی ہے تو سیلِ جہت
گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست

تو نے ہمیں آ کے ابھارا جہاں
سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو
پانڈوؤں کے ساتھ پھری بن میں تو

ذرے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تو مِلا

جبکہ ہمایوں سے چھٹا ملک و تخت — اور پھنسا بند حوادث میں سخت
یار رہا اور نہ کوئی غمگسار — دوست و دشمن کے لگے ہونے وار
پھر گئے دلدادۂ احساں تھے جو — چھٹ گئے وابستۂ داماں تھے جو
گھر میں نہ رہنے کی ملی کوئی راہ — ملک میں لی غیر کے جا کر پناہ
ہو گئے اغیار یگانے سبھی — تو نے مگر ساتھ نہ چھوڑا کبھی
چھوٹ گئے سارے قریب و بعید — ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی امید
تیری ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت — تیرے ہی صدقہ سے ملا تاج و تخت
خاکیوں کی تجھ سے ہی ہمت بلند — تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکان — تو نہ ہو تو … بھی برہم جہاں
کوئی پڑا پھرتا ہے بہر معاش — ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش
ایک تمنا میں ہے اولاد کی — ایک کو دلدار کی ہے تو لگی
ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے — دھوم سے اولاد کی شادی رچائے
ایک کو کچھ آج اگر مل گیا — کل کی ہو یہ فکر کہ کھائیں گے کیا
قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک — جس میں ہے ان کے لیے انجام نیک
ایک کو ہے تشنگی قرب حق — جس نے کیا دل سے جگر تک ہی شق
جو ہے غرض اس کی نئی جستجو — لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو
تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ — گل کوئی ہوتے نہیں پاتا چراغ
سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد — کہتی ہے جب تو کہ اب آئی اور
وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ — تو نے دیے ہیں اسے کیا کیا فروغ
وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو — رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو
بھاتی ہے سب کو تری بیت و لعل — تو نے کما کر رکھی ہے یہ آج کل
تلخ کو جو چاہے تو شیریں کرے — سم دوا کر طرب تو گہیں کرے
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — ہے تمہی اس کو رہے جن کے پاس

اس کا پانی ہے جو تو کچھ لگاؤ — سینکڑوں کی جگہ ہے اتار و چڑھاؤ
جس کو ہیضہ نہیں کسی سے کم — خوش ہیں تو قع ہے وہ زیست کی
پینی ہے دوا کا جس کی بناؤ — بیٹھے بیکلتے ہیں تھے سبیلانی بلاؤ
پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ فرق — گھوڑا جو سبزہ ہو تو خسیلا ہو طوق
ٹھیک تھے جو لیے بھی جہاں تو نہ بابا — دیکھتے ہیں تہ پیرشت کھوں کو خواب

خیر ہے کر تھے ملک خوشبوئے پیرید — دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب
تجھ سے ہوش لے جو شوق لے لیا — جھٹک دیا کان میں کیا جانے کیا
دل سے بھلایا ان دستور نہ کچھ — لگ گیا گھر تخل ... و مسند کو
کیا سنے بیٹھے سے ہوا ہے ... — ابھی کچھ اکبر نی ہے نہ گی
دیکھی کی ہے فکر ہو دنیا سے کام — جس سے بہی رات دن اور صبح و شام
صورتیں سے بیٹھے ہیں جب دھو لگنا — شاہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا
بیٹھے کو جب تاؤ چڑھتا ہے ... — پوچھتا یاروں سے پوچھنے کا بھاؤ
کہتا ہے تھیلا ... ہیں سب دیکھ کر — وہ گئی اک آنچ کی باقی کسر
بیچ کی مسند تھی وہ آسودہ حال — تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال
دل سے کرو بیٹھے اس کی خوشی — کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی
پھر سے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت — جنگے بھلوں میں تھا کبھی تاج و تخت
آج جو پھرتا ہی ... کھیر ... — ملتی ہے مشکل سے انہیں نان جو
تیر سے ہوا خاک نہیں ... پاس — سیاہی خدائی میں کیے دیکھے آس

ہوتا ہے ... جب کچھ ... — آتی ہے ... کھٹا جھوم جھوم
... سے چھتہ ... سے — جو ... کا لگتا ہے ... سے
بوتی ہے ... دو واقف میں عجب — ... تنگ

جی میں یہ آتا ہے کہ غم کھائیے — پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آنسے کی طرح — یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی — ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل — کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو نہیں — رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

برکھا رت

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد — اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا — اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے — اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے — گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے

ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی   ایک آتی ہے فوج ایک جاتی
جانے ہیں ہجم پہ کوئی جانے   ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی   چھاتی ہے زمین کی دھکتی
مینھ کا ہے زمین پر دریڑا   گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی   آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں   جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی   قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب کی ہے منہ پر   اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت   کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
سبزہ سے ہے دشت معمور   ہے چار طرف برس رہا نور
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار   اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی   عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار   دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل   ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو   اور مور جھنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی   گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے   سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر   کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ   یا رب لنا ولا علینا
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا   کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرو بھگتی!   گاتے ہیں بھجن کبیر بھگتی
جاتا ہے کوئی ملہار گاتا   ہے دل میں کوئی گنگناتا
جنگلی ہیں نشے میں گاتے پھرتے   اور بانسریاں بجاتے پھرتے

سر بن کوئی گا رہا ہے بیٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
رشک جو بڑے ہیں جبن سنت کے — ڈھلکتے ہیں دلوں پہ ٹکتے پھرتے
کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھشا
تا جل نہ بجھے
کوئی پتنگا

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں — جھولے ہیں کہ سو بسو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری — اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی — جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا — کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی — اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی — مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے — دل بحر ہیں یاں بیڑے جا کے لگتے
نہروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کی تھپیڑیں کھا رہی ہیں
ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان — بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رو یہ زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے

مناجات بیوہ

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر و ناظر!
اے سب داناؤں سے دانا — سارے تواناؤں سے توانا
اے بالا ہر بالا تر سے — چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بوجھے بن سوجھے — جانے پہچانے بن بوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے — اے لنگڑے لولوں کے سہارے
ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی — ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھ سا نہیں کوئی — تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی
جوت ہے تیری جل اور تھل میں — باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا — تو پاس اور گھر دور ہے تیرا
راہ تیری دشوار اور سکڑی — نام ترا رہ گیر کی لکڑی
تو ہے ٹھکانا مسکینوں کا — تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا دکھوالا — تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا
لاگو اچھے اور برے کا — خواہاں کھوٹے اور کھرے کا
بید نمانے بیماروں کا — گاہک نکمے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا — بپتا میں یاد آنے والا

اے میرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیرے بھکاری

موت کی خواہاں جان کی دشمن   جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری   میکے اور سسرال پہ بھاری
مر کے بہت آزاد ہوئی ہوں   دنیا سے بیزار پھری ہوں
دل پہ میرے داغ ہیں جتنے   منہ میں زبانیں نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا اب سہہ نہیں سکتی   اک سے بھی کچھ کہہ نہیں سکتی
بیاہ کے دم باقی تھی نہ سینے   جینے سے یہاں پڑ گئے لینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا   غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھا کے   ایک ہنسی نے گل یہ کھلا کے
کھاتا تھا یہ بیاہ رچانے والا   ڈالی پڑا اس کا پھندا ڈال
چین سے رہنے دیا نہ جی کو   کر دیا سیاہ ہمیشہ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں بیاہ تک   اور سنوں تو دو طرف کہاں تک
ہنس ہنس کے دل بہلاؤں کیونکر   اور سوؤں پیاس بجھاؤں کیونکر
ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا   ایک یہ جیتا تھا ۔۔۔ دوجا
بیٹھے گر سونے کے بہانے   باتیں کریں سب اور ۔۔۔ کے
جاگ گئے تو بھی بن نہیں پڑتی   جاگنے کی آخر کوئی حد بھی
اب کل ہم کو پڑے گی مرکر   گور ہے سونی ۔۔۔
بات سے نفرت کام سے وحشت   ٹوٹی آس اور ۔۔۔ طبیعت
آبادی جنگل کا نمونہ   دنیا سونی اور گھر سونا
دن بھیانک اور رات ڈراؤنی   یوں گزری ساری یہ جوانی
بہنیں اور ہمجولیاں میری   ساتھ کی کھیلیں جو سہیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے   خوش نہ ہوئیں ۔۔۔ کے مجھ سے
جب آئیں رو رو کے گئیں وہ   جب گئیں بیکل ہو کے گئیں وہ
کوئی نہیں دل کا بہلاوا   آ نہیں چکتا میرا بلاوا

آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا — کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
تھک گئیں میں دکھ سہتے سہتے — تھم گئے آنسو بہتے بہتے
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر — گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے — جان کو پھونکا دل کی لگی نے
دبی تھی بھوبل میں چنگاری — لی نہ کسی نے خبر ہماری
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی — شہر میں وہ دھومیں ساہوں کی
تہواروں کا آئے دن آنا — اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں — وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارمان بھری برساتیں!
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں — خیر گئیں جس طور سے کاٹیں
چاؤ کے اور خوشیوں کی سمیں سب — آتے ہیں خوش کل جہان کو ہو جب
رنج ہیں ہیں ساماں خوشی کے — دُور ہلانے والے جی کے
یہ برکھا اور پپیہا بدیسی — آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
دن یہ جوانی کے کٹے ایسے — باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
رُت گئی ساری سر ٹکراتے — اڑ نہ سکے پر ہوتے ساتے
کسی نے ہوگی کچھ کل پائی — مجھے تو شادی راس نہ آئی
آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ — پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ
رہ گیا دے کر چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی
رُت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور نہ برسا
پھل کی خاطر بپتی اٹھائی — پھل نہ ملا اور جان گنوائی
ریت میں دور سے دیکھ چمکتے — دوڑ پڑی ہیں جھیل سمجھ کے
چاروں کھونٹ لٹاسے دوڑائی — پر پانی کی بوند نہ پائی

اے دین اور دنیا کے مالک — راجا اور پرجا کے مالک!
بے پر اور پروا کے والی — اے سارے سنسار کے والی
پورب. پچھم دکھن اُتر — بخشش تیری عام ہے گھر گھر
پیاؤ لگی ہے سب کیلئے یہاں — خواہ ہوں ہندو خواہ مسلماں
ہو نہ اگر قسمت نے کمی کی — کی نہیں بندی تو نے کسی کی
چیونٹا. کیکڑا. مچھر بھنگا — کچھوا مینڈک سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیسر — مور. پپہیا سارس بٹیر
بھیڑ اور بکری شیر اور چیتے — تیرے جلائے ہیں سب جیتے
کھلا ہے سب پہ در رحمت کا — برس رہا ہے مینہ نعمت کا
خاک سے تو نے بیج اگائے — پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تو نے دولت — اور بخشا مکھی کو امرت
لکڑی میں پھل تو نے لگائے — اور کوڑی پر پھول کھلائے
ہیرا بخشا کان کو تو نے — مشک دیا حیوان کو تو نے
جگنو کو بجلی کی چمک دی — ذرے کو کندن کی دمک دی
دینا ہے تیرے لیے مرے مولیٰ — سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ
عام ہے سب پہ تیری رحمت — ہیں محروم مگر بد قسمت
پیڑ ہوں چھوٹے یا کہ بڑے یاں — فیض ہوا کا ہے سب پہ یکساں
جلتے ہیں جو ہیں جلنے والے — پھلتے ہیں جو ہیں پھلنے والے
جب اپنی ہی زمین ہو کلر — پھر الزام نہیں کچھ تجھ پر
سب کو تیرے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
گر کچھ آنا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی — سدا برت سے چلی ہوں بھوکی

پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا کس لئے مجھ کو پیدا کیا تھا
اِن کے آخر میں نے لیا کیا مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا
نین دئے اور کچھ نہ دکھایا دانت دئے اور کچھ نہ چکھایا
جنلڈی دی اوڑھنی نہ بخشی دل بخشا دل لگی نہ بخشی
رہی اکیلی بھری سبھا میں پیاسی رہی بھری گنگا میں
چین سے جاگی اور نہ سوئی ہنس نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
آئے خوشی سی چیز نہ پائی جیسی آئی ویسی نہ آئی
کھایا تو کچھ مزہ نہ پایا سوئی تو کچھ چین نہ پایا
پھول ہمیشہ آنکھ میں کھٹکے اور نہ پھل سدا گلے میں اٹکے
ہو نہ سکی کچھ دل سے عبادت اور نہ جمی کاموں پہ طبیعت
کام سنوارا کوئی نہ یہاں کا اور نہ کیا دھندا کوئی وہاں کا
کام آیا یہاں کوئی نہ میرے اور نہ میں کام آئی کسی کے
قسمت نے جب سے منہ موڑا آدمیوں کا ہو گیا توڑا
باپ اور بھائی چچا بھتیجے سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا جس کو ہو میری جان کی پروا
ناتیوں میں شفقت نہیں پاتی اپنوں میں اپناپت نہیں پاتی
گھر ہے اک حیرت کا نمونہ سو گھر والے اور گھر سونا
جس نے خدا کا خوف کیا کچھ آ کے کبھی یاں پوچھ لیا کچھ
سو یہ خوشی کا دل کی ہے سودا زور کسی پر اب نہیں اپنا
اس میں شکایت کیا ہے پرائی اپنی ہی قسمت کی ہے برائی
چین مگر اپنی بانٹ میں آتا کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے کیوں ہوتے اوروں کے حوالے

آٹھ پہر یہ کیوں دکھ اٹھاتے　　جیتے ہی جی کیوں مر جاتے
دکھ میں نہیں ہلی کوئی کسی کا　　باپ نہ ماں بھائی نہ بھتیجا
وج یہ کیسی سائیں کی صد تھی　　سکھ سمپت کا ہے کوئی ساتھی

تیرے سوا اے رحم کے بانی　　کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں　　ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
حال نہ ہو دشمن کا ایسا　　میرا نازک حال ہے جیسا
کوئی نہیں لاگو اب میرا　　باپ نہ بھائی نہیں نہ سسرا
آنکھ میں ایک اک کے ہوں کھٹکتی　　پر اپنے بس مر نہیں سکتی
ماں اور باپ عزیز اور پیارے　　بیکل ہیں جینے سے جالے
رو کے پلک نم کر نہیں سکتی　　ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی
روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے　　رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو　　کیونکر الٰہی کاٹئے غم کو
گر سسرال میں جاتی ہوں میں　　نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جب وقت ہوں آتی　　رہ رہ کے ہوں سب کو رلاتی
جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے　　تکتے ہیں مجھ میں اپنے پرائے
میرا سدا ہنسنا اور رونا　　بیٹھنا۔ اٹھنا۔ جاگنا سونا
سوچ میں میرے سارا گھر ہے　　میرے چلن پہ سب کی نظر ہے
اپنے کو بھولوں ہر وقت مناتی　　پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
جانتی ہوں نازک ہے زمانہ　　بات ہے اک یہاں عیب لگانا
ہولی کی سی راکھ ہے عزت　　دیا کے نہیں آتی پھر جیت
مہندی ابھی نے لگائی چھوڑی　　پٹی میں نے جمائی چھوڑی

کپڑے نہیں میں ہوں بدلتی — عطر نہیں ہیں پھول نے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گوندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی — اٹھوارے کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن — پہن چکی سب جب تھی سہاگن
بچھوؤں کا ارمان نہیں اب — چوڑیوں کا کچھ دھیان نہیں اب
اڑ گئیں سب دل کی ترنگیں — چاؤ رہے باقی نہ امنگیں
آپ کو یہاں تک بھی مٹایا — پھر دنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے ایک ایک کو گھیرا — جب دیکھو تب ذکر ہے میرا
کھینچ چکا ہے میرا مقدر — داغ بدی کا میری جبیں پر
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں — بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
سچ اگلے لوگوں نے کہا ہے — "بد اچھا بدنام برا ہے"
جینے سے گھبرا گئی ہوں میں — اس دم سے تنگ آگئی ہوں میں
یوں نہ مری اس جان پہ بنتی — ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی
رہتے ہم انجان بلا سے — دنیا مجھ سے میں دنیا سے
اے بے آسروں کے کھویا — ڈوبتے بیڑوں کے کھویا
کھیوو میری کشتی بانی — آ پہنچا ہے ڈباؤ پانی
اب تیرے گی ترائی تیری — ڈوبی ناؤ ڈبائی تیری
اے اچھے اور برے کے بھیدی — کھوٹے اور کھرے کے بھیدی
چھپی ڈھکی کے کھولنے والے — بری بھلی کے تولنے والے
بھید دلوں کے جاننے والے — پاپ اور پن کے چھاننے والے
عیب اور گن سب تجھ پہ ہیں روشن — پاپ اور پن سب تجھ پہ ہیں روشن
عیب نہ اپنا تجھ کو جتاتا — ہے دائی سے پیٹ چھپاتا!

میں نہیں آخر پاک بدی سے — بنی ہوں پانی اور مٹی سے
تو نے بنایا تھا مجھے جیسا — چاہیئے تھا ہونا مجھے ویسا
بس نہیں تو نے جتنا دیا ہے — اس سے سوا قدرت نہیں کیا ہے

کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو — تن من پہ تھا یہاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا — سب کو بدی سے میں نے ہٹایا
اٹھتے بیٹھتے روکا سب کو — سوتے جاگتے ٹوکا سب کو
ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا — پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا
آنکھ کو اٹھنے دیا نہ اتنا — جس سے کہ پیدا ہو کوئی فتنا
کان کو رکھا دور بلا سے — اور بری آوازوں کی ہوا سے
روک کے یوں اور تھام کے آپا — میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا — تھا بیتاب جو اندر والا
حال کروں میں اس کا بیاں کیا — حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی — مچھلی تھی ایک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی — اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی

گو دم بھر اس دل کی لگی نے — ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے
تو ہے مگر اس بات کا دانا — میں نے کہا دل کا نہیں مانا
زور تھا میرا دل پہ جہاں تک — میں نے سنبھالا دل کو وہاں تک
تھامنا دل کا کام تھا میرا — اور تھمانا کام تھا تیرا

پکڑے اگر تو دل کی خطا پر — میں راضی ہوں تیری رضا پر
رکھ تکلیف میں یا راحت میں — ڈال جہنم یا جنت میں
اب نہ مجھے جنت کی تمنا — اور نہ خطرہ کچھ دوزخ کا
آئے گی جنت راس کب اسکو — جلنے میں جس کی عمر کٹی ہو
ڈر دوزخ کا پھر اسے کیا ہے — جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہے

پر تجھ سے اک عرض ہے میری — وہ نہ ہو گر درگاہ میں تیری
جو قسمت نے مجھ کو دکھایا — خوش ناخوش سب میں نے اٹھایا
مجھ ناچیز کی ہے کیا طاقت — جو منہ پہ کچھ لاؤں شکایت

عمر بہت سی کاٹ چکی ہوں — یہ دن بھی کٹ جائینگے جتنے ہوں
اپنے لئے کچھ کہہ نہیں سکتی — پر یہ کہے بن رہ نہیں سکتی
میں ہی اکیلی نہیں ہوں دکھیا — پڑی ہے لاکھوں پہ یہی بپتا
بس کے بہت یہاں اجڑ گئے گھر — جم کے ہزاروں بگڑ گئے گھر
جلتیں کڑھتیں اپنی لپٹ میں — پلتیں پھکتیں اپنی مرگھٹ میں
بالیاں اک اک ذات کی لاکھوں — بیاہیاں ایک اک رات کی لاکھوں
ہو گئیں آخر اسی الم میں — کاٹ گئیں عمریں اسی غم میں
سینکڑوں بیچاری مظلومیں — بچیاں ناداں جو معصوم ہیں
بیاہ سے انجان اور منگنی سے — بچنے سے واقف اور نہ بنی سے
ماؤں سے جو منہ دھلواتی تھیں — رو رو پلنگ کے جھلاتی تھیں
ٹھپک ٹھپک کے جنکو سلاتے — گھر کے گھر تھے جنکو سلاتے
جن کو نہ شادی کی تھی تمنا — اور نہ منگنی کا تھا تقاضا
بھلے سے واقف تھیں نہ بُرے سے — بد سے مطلب تھا نہ بدی سے
رخصت چالے اور چھٹی کو — کھیل تماشا جانتی تھیں

جو تھیں جنہیں تھا رتبہ نہ دن کا — گڑیوں کا سا بیاہ تھا جنکا
دو دو دن رہ رہ کے سہاگن — جنم جنم کو ہو بیٹھیں بیراگن
دولہا نے نہ جانا دلہن کو — دلہن نے پہچانا نہ جنکو
دل نہ طبیعت تھی نہ چاہت — مفت لگائی بیاہ کی تہمت
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہیں کنواری

سیتا نے جب باغ میں آئے — پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا سوئے سیتا کی چتا میں
پیت نہ تھی جب بابا پیتم — جب ہوئی بہت گنوایا پیتم
ہوش سے پہلے ہوئیں بیاہی — کب پہنچے گا پار یہ کھیوا
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا — دور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی — کاٹنی ہے بھرپور جوانی
شام کے مردے کا ہے رونا — ساری رات نہیں اب سونا
آئی نہیں دنیا میں ابھی — ایسی کیسی بیٹھے پہ تباہی
آئیں بلکتی گئیں سسکتی — رہیں ترستی اور پھڑکتی
کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض پہ ان کی ہاتھ دھرے اب
دکھ ان کا آئے اور پوچھے — روگ ان کا آئے الله بوجھے

چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو — وہ کیا جانیں دل کی لگی کو
پہ درد ہی سے پڑا ہے پالا — تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا
اپنی بیتی ہے یہ کہانی — اب یہ دھیان ہے جن بیاہی
اے مختار ہر اک بے کس کے — حامی ہر عاجز بے کس کے
ہے کہ اچھے عاجز بندوں پر — پیار نہ ماں باپ سے بڑھ کر

جس نے تنگی میں تجھ کو پکارا — سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی وہ چوکھٹ سے — گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
کس کو زمانے نے ہے ستایا — تو نہیں جس کے آڑے آیا
اجڑے گھر تو نے بسائے — ڈوبے بیڑے تو نے ترائے
مظلوموں کی داد کو پہنچا — قیدیوں کی فریاد کو پہنچا
بنجر ملک آباد کرائے — اور بندے آزاد کرائے

عام تیری رحمت جب ٹھیری — قدر ہے پھر رحمت سے تیری
داد ہر اک مظلوم کی دے تو — اور رانڈوں کی خبر نہ لے تو
عورت ذات کا تنہا جینا — ہر دم خونِ جگر کا پینا
گھر بسنے کی آس نہ رہتی — ساری عمر جدائی سہتی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے — ہپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے — یا جس پہ گذری ہو وہ جانے

اے خاوند خداوندوں کے — مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خداوندی کا — صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجیو — کسی کو بے وارث مت کیجیو
کیجیو جو کچھ تیری خوشی ہو — رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو
مسند۔ تکیہ عزت حرمت — نوکر۔ چاکر۔ دولت حشمت
چاندی۔ سونا۔ نقدی۔ غلا — گہنا پاتا۔ ٹوم اور چھلا
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں — خاک ہے سب عورت کی نظر میں
دل کی خوشی اک آس پہ تھی سب — سو وہ ہزاروں کوس گئی اب
پھول اب کچھ کانٹوں سے نہیں کم — جنت بھی ہو تو ہے جہنم
باغ نظر میں اس کی خزاں ہے — آنکھ میں تاریک اس کی جہاں ہے
عیش ہے اسکے واسطے ماتم — عید ہے اسکے حق میں محرم
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا — کر قطع سے پیوند زمین کا
یا عورت کو پہلے بلا لے — یا دونوں کو ساتھ اٹھا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی — جس سے گئی زینت جہاں کی
جس سے ہوئے دل سینکڑوں بسمل — جس نے ہزاروں کئے ہیں گھائل
جس نے بچے آگ میں بھونے — جس نے بھرے گھر کر دئے سونے

خوف دلوں سے کھو دئیے جس نے　　شرم سے دیدے دھو دئیے جس نے
قوم کی جب بن آن ہے جاتی　　دھن کی جس پہ جان ہے جاتی
جس نے کئے دل رحم سے خالی　　ریت ہے جو دنیا سے نرالی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے　　بندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے
سہل اور مشکل تجھ کو ہے یکساں　　ہم کو ہے مشکل تجھ کو ہے آساں
رنج اور دکھ قبضے میں ہیں تیرے　　چین اور سکھ قبضے میں ہیں تیرے
ہلتے ہیں پتے تیرے ہلائے　　کھلتے ہیں غنچے تیرے کھلائے
مٹھی میں ہیں تیری ہوائیں　　قابو میں ہیں تیری گھٹائیں
تجھ سے دریاؤں کی ہے روانی　　تیرے بہائے بہتے ہیں پانی
جھیل سمندر پربت رائی　　کہنے میں ہے سب تیری خدائی
ناتا رشتہ نسبت شادی　　سوگ رنڈاپا قید آزادی
قوم کی ہیں یہ دین کی رسمیں　　کیا ہے وہ جو تیرے نہیں بس میں
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو　　ایک یہ کیا گر تیری خوشی ہو

سوت لگے پتھر سے نکلنے
ناؤ لگے ریتی میں چلنے

علامہ شبلی نعمانی

عدلِ جہانگیری

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرتِ حسن سے بیگم نے طمنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اِک کشتۂ بے گور و کفن
ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آ گئی ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن
نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن
مفتیٔ دیں سے جہانگیر نے فتوائے پوچھا

کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیٔ دین نے یہ بےخوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دو گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے
پہ جہانگیر کی ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہِ زمن
اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور
نہ وہ غمزے ہیں، نہ وہ عربدۂ صبر شکن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بےکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن
خدمت شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے، رضا مند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دئے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقین
کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلہ و فن
اٹھ گئے دربار سے آہستہ چلے سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
"تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من"

سید اکبر حسین اکبر

غزل

یہ طفلِ نادان غریق غفلت ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں
بہار ہی سے نہیں ہیں واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہے انہیں کے دل پہ جو محوِ رنگِ چمن رہے ہیں
نیا فلک ہے نئے ستارے یہ شوق سے کہہ رہے ہیں نظارے
انہیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیرِ چرخِ کہن رہے ہیں
نبے ہیں جو برگ و خس کے خوگر انہیں ہو کیوں خار ان کا منظر
نگاہ تو ہے انہیں کی مضطر جو مستِ سرو سمن رہے ہیں
اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

غزل

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں
معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے
شہرِ تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں
غافلوں کے لطف کو کافی ہے دنیاوی خوشی
عاقلوں کو بے غمِ عقبیٰ مزا ملتا نہیں

کشتی دل کی الٰہی بحرِ ہستی میں ہو خیر
ناخدا ملتے ہیں لیکن باخدا ملتا نہیں

غافلوں کو کیا سناؤں داستانِ عشقِ یار
سننے والے ملتے ہیں ہمدرد آشنا ملتا نہیں

صرف ظاہر ہو گیا سرمایہ زیب و صفا
کیا تعجب ہے جو باطن باصفا ملتا نہیں

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی
بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

جدید اور قدیم وضع میں جھگڑا

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ اِدھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد کہ لیمنیڈ بھی چھو نہیں سکتے — اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت نایاب — اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

"غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را
بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ"

مشرق اور مغرب کا فرق

بنائے ملّت بگڑ رہی ہے ہبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں
ادھر ہے قوم ضعیف و مسکین ادھر ہیں کچھ مرشدان خود بین
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں
کٹی رگ اتحادِ ملت رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آب صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں
صدائے الحاد اٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گذر رہے ہیں
قفس ہے کم ہمتی کا سمیں پڑے ہیں کچھ دانہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبع شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں
اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی وبا ہے
خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشن رکا ہے ملحد کا اپریشن
نہیں ہے گم نغمۂ سالوئیشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے مزار گپ ہے وہاں وہی عزت لیشپ ہے
یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
جناب اکبر سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا فہر کر رہے ہیں

لطیفہ

سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ کیا ہے جس نے جسکو زیب قرطاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت — کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

رباعیات

کھلتی ہے زبان خوش بیانی کیلئے — اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر — نظارۂ شاہدِ معانی کے لئے
جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب — لگے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثلِ نسیم غم گلے سے لگ جائے — مانندِ کلی کے پھول جانا اچھا

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا — غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن — کم تھیں بخدا کہ جن کو بینا پایا

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش — ذلت ہے برائے جاہ و حشمت کی تلاش
اکبر تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈھ — محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

بے غیرت و خود فروش جاہل سے نہ مل — حق ہے جو ہو غافل ایسے غافل سے نہ مل
یکسا جا کر دیں حوادثِ دہر اگر — جائز ہے کہ ان سے مل مگر دل سے نہ مل

انوار اس دور کے دِل افروز ہیں کم — گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زبان نہیں ہے شمع اخلاص — جلنے والے بہت ہیں دلسوز ہیں کم

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں — بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زر ہے بیکار — مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے — مشکل ہے مگر اثر پڑے دل میں
ایسا سنئے کہ کہنے والا ابھرے — ایسا کہئے کہ بیٹھ جائے دِل میں

خاطر مضبوط دِل توانا رکھو — اُمید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمہاری آسان — اکبر تم اللہ پہ بھروسہ رکھو

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو — اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبرؔ — بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

دنیائے دنی کی یہ ہوس جانے دو — گلچیں ہو اگر تو خار و خس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ — اللہ کو اپنے دِل میں بس جانے دو

کہتا ہوں میں ہندو و مسلمان سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

مسکین گدا ہو یا ہو شاہ ذی جاہ — بیماری و موت سے کہاں کسکو پناہ
آہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت — کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

تسبیح دعا میں جس نے لذت پائی — اور ذکر خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اس سے بڑھکر — بس دونوں جہاں کی اس نے نعمت پائی

اس عہد میں یہی ہے بس داخل نکوئی — مذہب پہ نکتہ چینی ملت پہ عیب جوئی
شوق عمل نہیں ہے فکر اجل نہیں ہے — ناصح بنے ہیں اکثر عابد نہیں ہے کوئی

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے — لذت وہ ہے کہ جوشِ صحت سے ملے
ایمان کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے — عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا — افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی — جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

رشوت ہی گلوئے نیک نامی کا چھرا — عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دھرا
ہرچند کہ بے محل خوشامد ہے بری — گستاخ مگر خوشامدی سے بھی برا

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا — شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا
ہرچند کہ زور بھی ہے اک خصلتِ بد — واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

ہو علم اگر نصیب تعلیم بھی کر — دولت جو ملے تو اس کو تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو — جو اہل ہیں اسکے ان کی تعظیم بھی کر

منشی برج نرائن چکبست

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے　　دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے　　اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پہ ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو　　سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو　　سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے　　اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے　　فردوسِ گوش اب تک کیفیتِ اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاکِ وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا — اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صورِ حبِ قومی اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حبِ وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک — رنگیں طبیعتوں کو رنگِ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک — ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نورِ سحر وطن کا — آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشکِ مہر ذرہ اس منزلِ کہن کا — تلتا ہے برگِ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

جلوۂ صبح

جب زنگِ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور — ہنگامِ سحر کون و مکاں ہو گئے معمور
تبدیل ہوئی صورتِ کوہِ شبِ دیجور — چمکا وہ تجلے سحر سے صفتِ طور

بجلی کی طرح چرخ پہ نورِ سحر آیا
آنکھوں کو نہ پھر خرمنِ انجم نظر آیا

تھی نور میں تفریح تو نورِ ارض و سما میں   سرگرمی بشر میں تھی پیشِ بادِ خدا میں
تھی تازگی خنکی میں تو خنکی تھی ہوا میں   شادابی تھی نکہت میں تو نکہت تھی صبا میں

خورشید منور کا دم جلوہ گری تھا
نورِ رُخ مہتاب چراغ سحری تھا

دریائے فلک میں تھا عجب نور کا عالم   چکر میں تھا گرداب صفت نیرِ اعظم
اٹھتی تھیں شعاعوں کی جو موجیں وہ شرر دم   سیارے حبابوں کی طرح مٹتے تھے پیہم

تھی شورش طوفان سحر غرب سے تا شرق
آخر کو سفینہ مہ گردوں کا ہوا غرق

والشمس تھا کندہ شہِ خاور کے نگیں پر   واللیل کا باقی تھا نشاں بھی نہ کہیں پر
تھی مہر کی پھیلی جو ضیا چرخ بریں پر   آنے لگا وہ دہ کے وہی نور زمیں پر

ذروں کا ستارہ بھی چمکتا نظر آیا
پیمانۂ خورشید چھلکتا نظر آیا

وہ صبح کا عالم وہ چمن زار کا عالم   مرغان ہوا نغمہ زنی کرتے تھے باہم
ہنگام سحر بادِ سحر چلتی تھی پیہم   آرام میں سبزہ تھا تہِ چادرِ شبنم

ہر سمت بندھی نغمۂ بلبل کی ہوا تھی
غنچوں کی نسیم سحری عقدہ کشا تھی

جو نخل تھا گلشن میں بہ رو مند کھڑا تھا   دامانِ سحر میں گلِ خورشید پڑا تھا
کیا خوب مقدر چمنستان کا لڑا تھا   ہر گل پہ گہر قطرۂ شبنم کا جڑا تھا

بلبل کہیں طاؤس کہیں گھوم رہے تھے
مستوں کی طرح نخلِ چمن جھوم رہے تھے

مرغانِ چمن عالمِ مستی میں سحر دم   وصفِ چمن آرائے جہاں کرتے تھے باہم

شاخیں تھیں کہیں گردنِ تسلیم صفت خم　　تسبیح خدا میں ہمہ تن محو تھی شبنم
غنچوں نے بھی تھی مدحِ زبان حمد خدا کی
آتی تھی چٹکنے میں صدا صلِ علےٰ کی
تھا پیشِ نظر وادیٔ ایمن کا تماشا　　ہر شاخ و شجر میں شجر طور کا نقشا
تھا آتشِ گل میں اثر برق تجلےٰ　　مدہوش تھے مرغان ہوا صورت موسےٰ
شکل ید بیضا تھی ہر اک شاخ نظر میں
اعجاز کا گل تھا کفِ گلچین سحر میں
رونق پہ دم صبح تھا خم خانۂ عالم　　تھم تھم کے ہوا چلتی تھی سرزی بھی تھی کم کم
پیمانۂ مہتاب تھا لبریز سحر دم　　تھا جام صبوحی کے لئے نیر اعظم
گردوں پہ شفق کی بھی عجب جلوہ گری تھی
مینائے فلک میں مے گلرنگ بھری تھی

کرشن کنہیا

جنم اشٹمی

آج کی رات کا دنیا کیلئے کیا ہے پیام　　حسن قدرت کا سرِ شام ہے جلوۂ عام
نور برساتے ہیں تارے کے چھلکتے ہوئے جام　　بن گیا ساز طرب ہستی عالم کا نظام
فرش راحت پہ اگر آنکھ جھپک جاتی ہے
بانسری کی مرے کانوں میں صدا آتی ہے
بے حجابی کی عروسانِ چمن میں ہے صدا　　گل کا مخمت ہے اشارہ ہے کہ بہتہ کیسا
دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موہن کی نوا　　ہنس کے ہر سنے کو ہی کہتی ہے یہ پورب کی ہوا

پیشوائی کے لئے خلق خدا اُٹھی ہے
آج جمنا کے کنارے سے گھٹا اُٹھی ہے

شبِ تاریک کے قبضہ میں ہے ایوانِ فلک
چھپی جاتی ہے اندھیرے میں ستاروں کی چمک
وہ ہوا ہے کہ اُڑے جاتے ہیں فانوس تلک
نظر آتی نہیں بستی میں چراغوں کی جھلک

صرف جگنو ہے جو دیوانہ صفت پھرتا ہے
شمع ہے کہ کبھی اُٹھتا ہے کبھی گرتا ہے

سنسناتی ہوئی آتی ہے اندھیرے میں ہوا
شجر و شاخ کے نغمے سے ہے معمور فضا
بجلیاں کوندتی ہیں لاکھ گرجتی ہے گھٹا
لے سے باہر نہیں ہوتی ہے پپیہے کی صدا

درد کے نام سے نعمت لئے ہاتھ آئی ہے
ایک ہی راگ کا دنیا میں یہ شیدائی ہے

چھا گیا ابر برسنے کو ہیں بننے کے جھالے
آپ ہی آپ ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
آنکھ کہتی ہے یہ بادل نہیں کالے کالے
بال کھولے ہوئے ہیں سانولی صورت والے

کشتیٔ فکر بہی جاتی ہے جمنا کی طرف
دل مرا کھینچ رہا ہے مجھے متھرا کی طرف

راہ تاریک ہے اور سر پہ گرج بادل کی
وہ نگر اینہ کا ہے بوندیں نہیں ہلکی ہلکی
شوخ و طرار و حسین چھوکریاں گوکل کی
چلی آتی ہیں صراحی لئے جمنا جل کی

دل لڑکپن کی اُمنگوں پہ مچل جاتا ہے
کھلکھلا پڑتی ہیں جب پاؤں پھسل جاتا ہے

یہ خوشی ہے کہ منانا ہے کنھیا کا جنم
دل میں ارمان ہزاروں ہیں مگر وقت ہے کم
نہیں سینے میں سماتا ہے دل کا عالم
آنکھ پڑتی ہے کہیں اور کہیں پڑتا ہے قدم

ایک کو ایک کی صورت جو نظر آتی ہے
مسکرا دیتی ہیں جب برق چمک جاتی ہے

آج سوتی ہوئی دنیا کی ہے قسمت بیدار
سال بھر بعد وہ رات آئی ہے دل جس پہ نثار

یہی تجلی تھی یہی ابر یہی جوش بہار　　جب کنھیا کے جنم سے ہوئی روشن شب تار

قید خانہ کی سیاہی میں وہ تارا چمکا

جس سے انسان کی ہستی کا ستارا چمکا

تھا جو دنیا کو رہِ راست پہ لانا منظور　　جلوۂ حق نے کیا قالب خاکی میں ظہور

جوش رحمت سے غنی فیض و کرم سے معمور　　ظلمت جہل مٹانے کو بڑھا چشمۂ نور

پردۂ غیب سے متھرا کے چمن تک پہونچا

بڑھ کے متھرا سے کرو کشتر کے رن تک پہونچا

دیکھ کر جنگ کے طوفان میں ارجن کو اداس　　یوں دیا وعظ کہ ہوشیار ہوئے کشتۂ یاس

روح و قالب کی جدائی پہ عبث ہے وسواس　　جو مسافر ہے وہ منزل پہ بدلتا ہے لباس

روح دنیا کی مسافر ہے اجل منزل ہے

اس سفر میں جو کھٹکتا ہے وہ کانٹا دل ہے

صاف نیت ہے تو بیکار ہے انجام کا ڈر　　پاک بندے جو ہیں رکھتے ہیں فقط حق پہ نظر

خود ریاضت کو سمجھتے ہیں ریاضت کا ثمر　　پھل کے لالچ میں لگاتے نہیں نیکی کا شجر

ان کی آنکھوں میں وہی داغ وفا پیارے ہیں

خود غرض کے لئے جو آگ کے انگارے ہیں

پھول مایا کے جو کھلتے ہیں لبھانے کیلئے　　سانپ بچھو ہیں مسافر کے ستانے کیلئے

سلسلہ ہستی فانی کے مٹانے کیلئے　　بزم عالم سے نہ جا روٹھ کے آنے کیلئے

تیری ہستی کا جو ہے راگ بھلا دے اس کو

پردۂ سازِ حقیقت میں چھپا دے اس کو

کس لئے خاک کے پتلوں کیلئے روتا ہے　　دیکھنے کو ہے کھلی آنکھ مگر سوتا ہے

کچھ خبر ہے تجھے کیوں جان عبث کھوتا ہے　　کون کہتا ہے فنا کون فنا ہوتا ہے

دوست دشمن کا ملہ گار وہی جنگ میں ہے

ایک صورت گر ہستی ہے جو ہر رنگ میں ہے

وہی بسمل ہے وہی جوہر شمشیر بھی ہے — شعلۂ شمع وہی ہے وہی گلگیر بھی ہے
خود مصور وہی اور وہی تصویر بھی ہے — وہی حاکم وہی قیدی وہی زنجیر بھی ہے
جوہری بھی ہے وہی جوہر عالی بھی وہی
پھول بھی ہے وہی اس باغ کا مالی بھی وہی

تیری آنکھوں سے اگر دور ہوا پاکی نقاب — دیکھ پھر کیا نظر آتے ہیں عزیز اور احباب
بے وفاؤں کی مروت میں نہ کر عمر خراب — حق پرستوں کی امانت ہے ترا زور شباب
دھرم پر جو نہ فدا ہو وہ جوانی کیا ہے
دودھ کی دھار ہے تلوار کا پانی کیا ہے

اب نہ ارجن ہے نہ وہ گیان کا دریا باقی — نہ وہ آنکھیں ہیں نہ وہ نور کا جلوا باقی
دل بہلانے کو ہے دنیا کا تماشا باقی — درد باقی ہے نہ ہے درد کا شیدا باقی
بانسری لے کے نیا راگ سنا دے کوئی
سو رہا ہے دل مایوس جگا دے کوئی

پھر ہو دنیا میں کسی ہستی کامل کا ظہور — دل میں جس کے ہو بھرا ہوا خدمت کا سرور
جذبۂ خیر کی ہو جس کو پرستش منظور — بادۂ شوق سے ہوں جس کی نگاہیں مخمور
دل کو تسخیر کرے انجمن آرا ہو کر
ہو نہ دنیا سے خفا دین کا پیارا ہو کر

کشمیر

پانی میں ہے چشموں کے اثر آبِ بقا کا   ہر نخل پہ عالم خضر سبز قبا کا
جو پھول ہے گلشن میں وہ ہے نورِ خدا کا   سائے میں شجر کے ہے اثر ظلِ ہما کا
مبدا اکرم عام کی ہر جوئے رواں ہے
سرچشمۂ فیض چمن آرائے جہاں ہے

وہ موج ہوا کا حرکت ابر کو دینا   چشموں سے پہاڑوں کے وہ اٹھتا ہوا پھینا
گاتے ہوئے ملاحوں کا وہ کشتیاں کھینا   ڈل کا وہ سرِ شام ادھر کو ہمیں بیتا
وہ عکس چراغوں کا جھلکتا نظر آنا
پانی کا ستارہ بھی چمکتا نظر آنا

ہر لالہ کہسار ہے شکلِ گلِ راحت   داغ اِسکے ہیں خالِ رخِ حورانِ مستر
کیا سبزہ خوش رنگ ہے سرمایۂ عشرت   دِل کے لئے ٹھنڈک ہے جگر کیلئے فرحت
ایسا نہیں قدرت نے کیا فرش کہیں پہ
اس رنگ کا سبزہ ہی نہیں روئے زمین پہ

وہ صبح کو کہسار کے پھولوں کا مہکنا   وہ جھاڑیوں کی آڑ میں چڑیوں کا چہکنا
گردوں پہ شفق کو وہ لالے کا لہکنا   مستوں کی طرح ابر کے ٹکڑوں کا بہکنا
ہر پھول کی جنبش سے عیاں ناز پری کا
چلنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا

وہ طائر کہسار لبِ چشمۂ کہسار   وہ سرد ہوا وہ کرم ابرِ گہر بار
وہ میوہ خوش رنگ وہ سرسبز چمن زار   اک آن میں صحت ہو جو برسوں کا ہو بیمار
یہ باغِ وطن رشکِ گلزارِ جناں ہے
سرمایۂ ناز چمن آرائے جہاں ہے

ہے خطۂ سرسبز میں اک نور کا عالم ہر شاخ و شجر پر شجرِ طور کا عالم
پہ جوبن ہے یہ خوشۂ انگور کا عالم ہر خار پہ بھی ہے مژۂ حور کا عالم
نکلے نہ صدا ایسی مغنی کے گلو سے
آتی ہے جو آوازِ ترنم لبِ جو سے

میووں سے گرانبار وہ اشجار کے ڈالے بکھرے ہوئے وہ دامنِ کہسار پہ نالے
اُڑتے ہوئے بادل ہوا میں نئے جھالے دیکھے جو کوئی دور سے ہیں روئی کے گالے
وہ ابر کے ٹکڑوں کا تماشہ شجروں میں
جھرنوں کی صدائیں وہ پہاڑوں کے دروں میں

غزل

فنا نہیں ہے محبت کے رنگ و بو کیلئے بہارِ عالمِ فانی رہے رہے نہ رہے
جنونِ حبِ وطن کا مزا شباب میں ہے لہو میں پھر یہ روانی رہے رہے نہ رہے
رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے
جو دل میں زخم لگے ہیں وہ خود پکاریں گے زبان کی سیف بیانی رہے رہے نہ رہے
مٹا رہا ہے زمانہ وطن کے مندر کو یہ مرمٹوں کی نشانی رہے رہے نہ رہے
دلوں میں آگ لگے یہ وفا کا جوہر ہے یہ جمع خرچ زبانی رہے رہے نہ رہے
جو مانگنا ہے ابھی مانگ لو وطن کے لئے
یہ آرزو کی جوانی رہے رہے نہ رہے

رامائن کا ایک سین

راجہ رامچندر جی کا ماں سے رخصت ہونا

رخصت ہوا وہ باپ سے لیکر خدا کا نام   راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام   دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بیکسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال   خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے وہ بیٹھی خستہ حال   سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ   نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ   لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرے کا رنگ حالت دل کھونے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا   افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا   وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا
درد دل غریب جو صرف بیان ہوا
خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں   میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں   لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں

کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا ہوس پید — اندھا کئے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید — سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیاتِ ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کیواسطے

بیٹی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم — ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم — تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگاؤں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گذارے ہیں ماہ و سال — دیکھی تمہاری شکل جب آئے بچے تو نہال
بھرا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال — آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کیواسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کیواسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ — منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و امان کی راہ — اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زبان سے ماں کی یہ فریاد درد خیز — اس خستہ جان کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز

عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشکبار — لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادرِ ناشاد کے حضور — مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالمِ پیری میں ہے ضرور — لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر — ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر — کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار — واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار — ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں آج کل بڑھ کے زمانے نے انقلاب — جن سے کہ بیکسوں کی عمریں ہوئیں خراب
صدموں سے قلب و جگر ہو گئے کباب — پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی تکتے تھے جنکا ہر گھڑی — قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی — ماری نہ جنکو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگِ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہاتھ سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے یہ حال پر ملال　　ان بیکسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہیں ماہ و سال　　خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ گئے اور کیا کیا

پڑتا ہے جس غریب پر رنج و محن کا بار　　کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گنہگار　　یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن دبی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اصحاب کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام　　بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام　　قائم امید ہی سے ہے دنیا جبر کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغبان　　ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں　　وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جان کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بیشمار　　موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار　　وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر　　صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہربان اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر　　رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو روانہ ہوئی ماں پہ کارگر — ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرہ پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر — جس طرح چاندنی کا ہو شمشان سے گزر
پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ تم نے کہی سب یہ داستان — لاکھوں برس کی عمر ہو دیتی ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان — بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر ہے یہ مرا وقت واپسیں — کیا اعتبار آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس کا مجھے یقین — سوچو گے جبکہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں
اولاد جیسے کبھی تمہیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

ان آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں — باتوں سے جو تجھے یہ وہ دل کی لگی نہیں
لیکن تمہیں ہے رنج جو میری خوشی نہیں — جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں
دنیا میں بیٹے جدائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

نشتر تھے رام کے لیے یہ حرف آرزو دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان آبرو سننی پڑی اسے یہ خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں میں ماں کے گر پڑا آنسو کے زور سے

طوفان آنسوؤں کا زبان سے ہوا نہ بند رک رک کے کس طرح ہوا گویا وہ درد مند
پہونچی ہے مجھ سے آپکے دل کو اگر گزند مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند
جو بے وفا ہے مادر ناشاد کے لیے
دوزخ یہ زندگی ہے اس اولاد کے لیے

ہے دور اس غلام سے خود رائی کا خیال ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال جو دین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال
جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدہ نے باپ کے

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ لیکن بہار عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جسکو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل ہی لگیگا داغ
جب آبرو پہ بنس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

بنباس پر خوشی سے جو راضی نہ ہونگا میں کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہونگا میں
کیوں کر زبان غیر کے طعنے سنونگا میں دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہونگا میں
لڑکے نے بیحیائی کو نقش جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سنکے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکی عتاب چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب

سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینہ سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا
دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشک فشانیاں ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے ان کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرتھ کے راج میں

منشی درگا سہائے سرور

بیر بہوٹی

آہ! او ننھے سے کیڑے نازشِ صحرا ہے تو
دشت میں اک سرخ چھوٹا سا گلِ رعنا ہے تو
صفحۂ ہستی پہ اک نقشِ تحیر زا ہے تو
شعلہ زارِ حسن کی چھوٹی سی اک دنیا ہے تو
برقِ عالم سوز کی ننھی سی ہیکل ہے کوئی
آتشِ یاقوت کی چھوٹی سی مشعل ہے کوئی

کچھ عجب عالم ہے تیرے حسن کے انداز کا
سرخ ڈورا ہے کسی چشمِ فسوں پرداز کا
قطرہ مضطر ہے خونِ کشتگانِ ناز کا
قلبِ خوں گشتہ ہے مژگانِ کسی جانباز کا
یا شفق کا کوئی ٹکڑا ہے زمیں پہ جلوہ گر
جامِ زریں میں ہے یا صہبائے احمر جلوہ گر

گُل بداماں ہے شفق میں شعلۂ تنویرِ حسن
خونِ عاشق یا زمیں پر ہے گریباں گیرِ حسن
یا عقیقِ سرخ کی چھوٹی سی ہے تصویرِ حسن
نقشِ نیرنگِ فسوں ہے یا کوئی تصویرِ حسن
جلوۂ گل ہے فضائے وادیٔ پُر خار میں
سرخ تکمہ ہے قبائے سبزۂ کہسار میں

محضرِ خونِ شہیداں ہے ترا دامان سرخ
یا ہے خونِ کشتگانِ عشق کا عنوان سرخ
یا کسی کے ناوکِ پرخوں کا ہے پیکان سرخ
اشکِ گلگوں یا ہے زیبِ پنجۂ مژگان سرخ
رنگ آمیزی ہے قدرت کی تری تصویر میں
اک دلاویزی ہے قدرت کی تری تصویر میں

حسن میں تیرے ہے اے نا طورہ نازہ آفریں
فندقِ پائے حسیناں کی ادائے دل نشیں
جلوۂ رخ سے ترے گلگوں ہے دامانِ زمیں
بزمِ صحرا میں ہے تو جامِ شرابِ آتشیں
بادۂ گلگوں ترے چھوٹے سے پیمانے میں ہے
عالمِ نیرنگِ افسوں تیرے افسانے میں ہے

وادیٔ پرخار میں اک جگر سوزاں ہے تو
دامنِ کہسار میں اک شعلۂ عریاں ہے تو
کشت زارِ حسن میں اک دانۂ مرجاں ہے تو
یا کسی گلگوں قبا کا گوشۂ داماں ہے تو
نازہے صحرا کو تیری شوخیٔ رفتار پر
دوڑتا ہے خوں کا قطرہ سبزۂ کہسار پر

گل بداماں ہے کوئی دوشیزۂ کم سن مگر
ہلکی ہلکی سرخ پھولوں کی ہے چادر دوش پر
وقفِ رعنائی ہے یا کوئی عروسِ سیم بر
روئے زیبا پر ہے غازہ سرخ جوڑا فریب بر
لوٹتا ہے کوئی بسمل سبزۂ بیگانہ پر

یا مئے گلگوں کا قطرہ ہے لبِ پیمانہ پر
جلوۂ گل سے ہے رنگیں روئے زیبائے بہار
ناز میں ہے یا کوئی محو تماشائے بہار
یا مئے گلرنگ سے گلگوں ہے مینائے بہار
یا ہے آغشتہ بخوں داغ سویدائے بہار
سبزۂ کہسار نے یا لعل اگلا ہے کوئی
جل رہی ہے پھول یا دوشیزۂ رعنا کوئی

مُرغابی

ڈھل گیا دن۔ اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز
گوشۂ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
پڑ رہی ہیں دور تک سورج کی کرنیں زرد زرد
جا رہی ہے تو اکیلی شام کو اڑتی کہاں

دیکھتا ہے کیوں عبث صیاد سوئے آسماں
پاس کی نظروں سے تیری شوکتِ پرواز کو
الغرض نظارۂ فلک کے منظرِ خوش رنگ نے
کر دیا ہے اور دلکش تیرے نقشِ ناز کو

ڈھونڈتی پھرتی ہے کیا کوئی سہانا آبشار
یا کہ سرگرمِ تلاشِ دامنِ دریا ہے تو
یا کسی بحرِ تموج خیز کی ہے جستجو

یوں سکوتِ شام میں کیوں آسماں پیما ہے تو

تو جو بے سنگِ نشاں جادۂ بے مرحلہ
کر رہی ہے آسماں پر قطعِ طبقاتِ ہوا
اڑ سکے بے بدرقہ تو یہ کہاں تیری مجال
کوئی طاقت ہے مگر تیری مقرر رہنما!

اے سبک پرواز! تیری سرعتِ پرواز نے
طے کیے کتنے ہی دن بھر سرد طبقاتِ نسیم
ہو سکے واماندہ زمیں پر گر نہ شہپر جوڑ کر
شب کی ظلمت کا ہے گرچہ سر پہ طوفان عظیم

ہو چکی تیری مشقت ختم بخشے کو عنقریب
گرمیوں کا اک سہانا گھر ملے گا خوشگوار
گاتی ہوگی چھوٹی چڑیوں میں ہم آہنگی سے تو
اور نشیمن پر ترے ہوگی نیستاں کی بہار

ہو گئی غائب فضائے آسماں میں گرچہ تو
اور اب آنکھوں میں ہے تیرا تصور یادگار
میں نے سیکھا ہے سبق لیکن تیری پرواز سے
ہے طریقِ زندگی میں تو میری آموزگار
منطقے سے منطقے تک لے سبک پرواز شوق
وسعتِ اوجِ فلک پر ہے جو تیرا راہبر

تجھ کو بھی لے جائے گا وہ منزلِ مقصود تک
جب کروں گا جادۂ ہستی سے مَیں تنہا سفر

کوئل

او چمن کی اجنبی چڑیا! کہاں تھی آہ تو
کیا کسی صحرا کے دامن میں نہاں تھی آہ تو
تیرے دلکش زمزمے تھے سبزہ زاروں میں خموش
آشیانہ تھا ترا گلشن میں بزمِ بے خروش

کھینچتی وقتِ سحر دل کو تری کو کو نہ تھی
چھاؤں میں تاروں کی مجھ نغمۂ دلجو نہ تھی
موسمِ سرما میں اے سرمایۂ صبر و شکیب
بے صدا تیرا پسِ پردہ تھا سازِ دلفریب

مرحبا اے پیکرِ پیکِ سبک گامِ بہار
لے کے پھر تو گرمیوں میں آئی پیغامِ بہار
تو ادھر آئی فضائے گل کا دَور آیا ادھر
تو نے گائے گیت اور آموں پہ بور آیا ادھر

طائرانِ باغ نے چھیڑا ہے سازِ انبساط
تیرے مقدم میں ہیں شاخوں پر ہم آہنگِ نشاط
پہنی ننھی ننھی کلیوں نے قبائے شبنمیں

آ رہی ہے کان میں تیری صدائے دلنشیں

کوئی انجم آسماں کا اور سبک پرواز شوق
رہنما ہے کیا ترا - دلدادۂ انداز شوق
تو جو آنیوالے موسم کا نشان پاتی ہوئی
اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے یوں گاتی ہوئی

تیرے مقدم میں - شکیبِ خاطر ناشاد ہیں
موسم گل کو تری دیتا ہوں مبارکباد میں
تو چمن میں اڑ کے کیا آئی کہ آپہنچی بہار
گا رہی ہیں چھوٹی چڑیاں سبز کنجوں میں ملار

سوسن رنگین میں ایک دوشیزۂ ناکتخدا
چن رہی ہے ننھی ننھی سرخ کلیاں خوش نما
اور تجھ سے ہم سرود نغمۂ اعجاز ہے
بزم قدرت میں تری گویا شریک ساز ہے

میٹھے نغمے گانے والی او چمن کی نازنیں
ہے ترو تازہ ہمیشہ تیرا کنج دل نشیں
اور مصفا ہے فضائے آسماں تیرے لئے
ہے شفق جام شراب ارغواں تیرے لئے
تیرے نغموں میں اثر اندوہ و حرماں کا نہیں
سال میں تیرے گذر فصلِ زمستاں کا نہیں

مجھ کو قسام ازل دیتا اگر دو بال و پر
اڑ کے ہوتا میں بھی تیرے ساتھ سرگرم سفر

بن کے ہم دونوں رفیق موسم جوش بہار
کرتے خوش خوش ہر برس گلگشت دشت و کہسار

پدمنی

عندلیبوں کو ملی آہ و بکا کی تعلیم | اور پروانوں کو دی سوز وفا کی تعلیم
جب ہر ایک چیز کو قدرت نے عطا کی تعلیم | آئی حصے میں تیرے ذوق فنا کی تعلیم
نرم نازک تجھے اعضا دیے جلنے کے لئے
دل دیا آگ کے شعلوں میں پگھلنے کیلئے

رنگ تصویر کے پردے میں جو چمکا تیرا | خود بخود لوٹ گیا جلوۂ رعنا تیرا
ڈھال کر کالبد نور میں پتلا تیرا | ید قدرت نے بنایا جو سراپا تیرا
بھر دیا کوٹ کے سوز غم شوہر دل میں
رکھ دیا چیر کے اک شعلۂ مضطر دل میں

تو وہ تھی شمع کہ پروانہ بنایا تجھ کو | تو وہ لیلیٰ تھی کہ دیوانہ بنایا تجھ کو
رونق خلوت شاہانہ بنایا تجھ کو | نازش ہمت مردانہ بنایا تجھ کو
ناز آیا ترے حصے میں ادا بھی آئی
جاں فروشی بھی محبت بھی وفا بھی آئی

آئی دنیا میں جو تو حسن میں یکتا بن کر | چمن دہر میں پھولی گل رعنا بن کر
رہی ماں باپ کی آنکھوں کا جو تارا بن کر | دل شوہر میں رہی خال سویدا بن کر

حسن خدمت سے شگفتہ دل شوہر رکھا
کہ قدم جادۂ طاعت سے نہ باہر رکھا

تیری فطرت میں مروت بھی تھی غمخواری بھی   تیری صورت میں ادا بھی تھی طرحداری بھی
جلوۂ حسن میں شامل تھی نکوکاری بھی   درد آیا ترے حصے میں تو خودداری بھی

آگ پر بھی نہ تجھے آہ! مچلتے دیکھا
تپش حسن کو پہلو نہ بدلتے دیکھا

تو وہ عصمت کی تھی اور آئینہ سیما تصویر   حسن سیرت سے تھی تیری مجسلا تصویر
لاکھ تصویروں سے تھی اک تیری ایسا تصویر   تجھ کو قدرت نے بنایا تھا سراپا تصویر

نور ہی نور ترے جلوہ مستور میں تھا
انجم ناز کا جھرمٹ رخ پر نور میں تھا

لب میں اعجاز حیا چشم فسوں ساز میں تھی   کہ قیامت کی ادا تیرے ہر انداز میں تھی
شکل پھرتی جو تیری دیدۂ غماز میں تھی   برق بیتاب تری جلوہ گہ ناز میں تھی

یہ وہ بجلی تھی قیامت کی تڑپ تھی جس میں
شعلۂ نار عقوبت کی تڑپ تھی جس میں

یہ وہ بجلی تھی جو تیغ شرر افشاں ہو کر   کوندا اٹھی قلعہ چتوڑ میں جولاں ہو کر
یہ وہ بجلی تھی جو سوز غم حسرماں ہو کر   خاک سے لوٹ گئی تیری پشیمان ہو کر

یہ وہ بجلی تھی تجھے جس کے اثر نے پھونکا
رفتہ رفتہ تپش سوز جگر نے پھونکا

آہ! او عشوہ و انداز و ادا کی دیوی   آہ! او ہند کے ناموس وفا کی دیوی
آہ! او پیکر انوار صفا کی دیوی   او زیارت کدہ شرم و حیا کی دیوی

تیری تقدیس کا قائل ہے زمانہ اب تک
تیری عفت کا زباں پر ہے فسانہ اب تک

آفریں ہے تری جاں بازی و ہمت کیلئے   آفریں ہے تیری عفت تیری عصمت کیلئے

کیا مٹائیگا زمانہ تری شہرت کے لئے ، کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کیلئے
نقش اب تک تیری عظمت کا ہے بیٹھا دلمیں
تو وہ دیوی ہے تیرا لگتا ہے میلہ دل میں

سیتا کی گریہ وزاری

ہمراہ اپنے بن کو مجھے ناتھ لے چلو — داسی تمہارے چرنوں کی ہوں ساتھ لے چلو
نازک ہے میرا شیشۂ دل ٹوٹ جائیگا — چھوٹا تمہارا ساتھ تو جی چھوٹ جائیگا
قسمت نے جب کہ باپ کے گھر سے جدا کیا — سوامی! مجھے نہ تم نے نظر سے جدا کیا
پتلی کی طرح آنکھوں میں شام و سحر رہی — پہلو میں بن کے صبر و شکیب جگر رہی
دکھ آجتک سہا نہ غم انتظار کا — مجھ پر کرم رہا ستم روزگار کا
صدمے تمہارے ہجر کے کیونکر اٹھاؤنگی — میں مٹ گئی دکھ جو یہ دم بھر اٹھاؤں گی
گھر میں جو چھوڑ جاؤگے سیتا غریب کو — پاؤگے بن سے آکے نہ جیتا غریب کو
مانا کہ دشت میں غم و آلام ہیں بہت — بن باسیوں کو دکھ سحر و شام ہیں بہت
ایذا اگرچہ آبلہ پائی کی ہے کڑی — دوزخ سے بڑھ کے آگ جدائی کی ہے کڑی
ہے آگ وہ ہے جو دل مضطر کو پھونک کر — بجھتی ہے آرزو کے بھرے گھر کو پھونک کر
وابستہ آہ! تجھ سے ہے سارے جہاں کا عیش — رنج فراق ہو جو تمہیں تو کہاں کے عیش
تاریک تم بغیر ہے عالم مرے لئے — فردوس بھی ہے آہ جہنم مرے لئے
میکے میں باپ ماں کے ہے تسکین روح کو — اور اہل خاندان سے ہے تسکین روح کو
سسرال میں ہے ساس سسر پہ مدار عیش — شوہر بغیر آہ! خزاں ہے بہار عیش
صحرا بھی مجھے چمن ہے رفاقت میں آپکی — دنیا کے سارے عیش ہیں خدمت میں آپ کی
یونہی تمہارے ساتھ پھرونگی میں بن میں خوش — بھونرا کلی کا پہ ہو جیسے چمن میں خوش

پپیہا بہر سمجھ کے درختوں کی چھال کو
آراستہ کروں گی قدِ نونہال کو
سبزہ بنا کے لائیگا بستر مرے لئے
جھولا جھلانے آئے گی صرصر مرے لئے
صورت تمہاری دیکھ کے غم بھول جاؤنگی
صحرا کے سایہ رنج والم بھول جاؤنگی

ستی

اے ستی! اے جلوہ گاہِ شعلۂ تنویرِ حسن
پاک دامانی کا نقشہ ہے تری تصویرِ حسن
یہ تنِ نازک ترا یہ شعلہ ہائے آتشیں
یہ چتا کی آتشِ سوزاں یہ جسمِ نازنین
صاعقہ ہے برق ہے تیرے دلِ مضطر کی آگ
پھونک دیتی ہے تجھے سوزِ غم شوہر کی آگ
خاک ہو کر بھی ترے داغِ جگر بجھتے نہیں
آہ تیری راکھ کے برسوں شرر بجھتے نہیں
ہند کو ہے ناز تیری ہمتِ مردانہ پر
تو چراغِ کشتہ ہے خاکسترِ پروانہ پر
آگ میں ہے تو سپندِ شوق جلنے کے لئے
شمعِ ماتم ہے شبِ غم میں پگھلنے کے لئے
گرمیٔ ہنگامۂ محشر تری محفل میں ہے
سرد جو ہوتی نہیں وہ آگ تیرے دل میں ہے
اف ری شوہر کی چتا پر شعلہ افروزی تری
جلتے جی سوزِ محبت میں جگر سوزی تری

جاں گدازی کی ادا یہ شمع محفل میں کہاں
گرمئ سوز وفا یہ شمع محفل میں کہاں

بلبل و پروانہ

(بلبل پروانے سے)

گرا رہا ہے ترا شوق شمع پر تجھکو — مجھے یہ ڈر ہے نہ پہنچے کہیں ضرر تجھکو
فروغ شعلہ کہاں اور کہاں تجلی حسن — ہزار حیف کہ اتنی نہیں خبر تجھ کو
تڑپ تڑپ کے جو بے اختیار گرتا ہے — نہیں ہے آگ کے شعلہ سے آہ ڈر تجھ کو
یہ ننھے ننھے پر و بال یہ بلا کی تپش — ملا ہے آہ قیامت کا کیا جگر تجھ کو
قریب شمع کے آکر جو تھرتھراتا ہے — نہیں ہے جان کے جانیکا غم مگر تجھ کو
ملیگی خاک بھی ڈھونڈی نہ تیری محفل میں — صبا اڑائے پھرے گی دم سحر تجھ کو
سمجھ نہ شمع کو دلسوز عاقبت دشمن — جلا کے آہ رہیگی یہ مشت پر تجھ کو

نہیں ہے تو ابھی سوز و گداز کے قابل
نہیں ہے عشق کے عرض و نیاز کے قابل

تپش یہ بزم میں فانوس پر نہیں اچھی — کہ آگ لاگ کی او بے خبر نہیں اچھی
تڑپ تڑپ کے نہ دیوانہ وار شمع پہ گر — کہ آہ یہ تپش بال و پر نہیں اچھی
یہ جاں گدازی سوز و فا سر محفل — کہیں نہ ہو ترے جی کا ضرر نہیں اچھی
لڑا نہ شمع سے آنکھیں کہ ہر طرح تیری — تری نگاہ محبت اثر نہیں اچھی
یہ ننھے ننھے پروں کی تڑپ یہ بیتابی — حریف شوخی برق اثر نہیں اچھی
ہوائے شوق میں فانوس پہ ترا گرنا — یہ بیخودی اے شوریدہ سر نہیں اچھی

چمن میں چل کہ دکھاؤں ادائے شاہدِ گل
ہیں وہ فریب عجب خندہ ہائے شاہدِ گل

پروانہ

یہ بوالہوس نہیں سمجھا ہی تو نے کیا مجھکو
پسند شاہدِ گل کی نہیں ادا مجھ کو
بنوں نہیں کہ ہو سودائے گل چمن میں مجھے
سمجھ نہ اپنی طرح آہ بیوفا مجھ کو
فراقِ گل میں میں چیخوں تری طرح اے وائے
یہ داغ سوزِ جدائی نہ دے خدا مجھ کو
دل گداختہ لیکر ازل سے آیا ہوں
جلایا بزم میں ہے سوزِ آشنا مجھ کو
تڑپ تڑپ کے مروں کیوں نہ شمعِ محفل پہ
فنا کے سوزِ محبت میں ہے بقا مجھ کو
جلے وہ بزم میں چپ چاپ اور میں نہ جلوں
بعید عشق سے ہے ہو غمِ فنا مجھ کو
تری نگاہ میں جانسوز ہی جو اے بلبل
وہ آہ آگ کا شعلہ ہے جانفزا مجھ کو

شعور لیکر تجھے امتیازِ عشق کہاں
کہاں تو اور یہ سوز و گدازِ عشق کہاں

گنگا

اے آبِ رودِ گنگا! اف تیری صفائی
یہ تیرا حسنِ دلکش! یہ طرزِ دلربائی
تیری تجلیاں ہیں جلوہ فروشِ معنی
تنویر میں ہے تیری اک شانِ کبریائی
جمنا تری سہیلی۔ گو ساتھ کی ہے کھیلی
اس میں مگر کہاں ہے تیری سی جانفزائی
بے لوث تیرا دامن ہے داغِ معصیت سے
موجوں نے تیرے قد پہ ملبوسِ پارسائی

دلبند ہم ہیں تیرے لختِ جگر ہیں تیرے
نخلِ مراد ہے تو اور ہم ثمر ہیں تیرے
مینو سواد تجھ سے ہیں وادیاں ہماری
اور کشت آرزو ہے رشک جناں ہماری
وہ دن بھی ہوگا۔ ہونگے جب ہم غریق رحمت
اور تیری نذر ہونگی یہ ہڈیاں ہماری
گنگا میں پھینک آنا بعد فنا اٹھا کر
برباد ہو نہ مٹی او آسماں ہماری
یارب نہ دفن کرکے احباب بھول جائیں
لیکہ ہمارے خوش خوش گنگا کو پھول جائیں
او پاک نازنین! او پھولوں کے گہنے والی
سرسبز وادیوں کے دامن میں بہنے والی
او نازآفریں! او صدق و صفا کی دیوی
او عفت مجسم! بہ بت کی رہنے والی
صلِ علےٰ! یہ تیری موجوں کا گنگنانا
وحدت کا یہ ترانہ او چپ نہ رہنے والی
حسن غیور تیرا ہے بے نیاز ہستی
تو بحر معرفت ہے او پاکباز ہستی
ہاں تجھ کو جستجو ہے کس بحر بیکراں کی
ہم پر تو کچھ حقیقت کھلتی نہیں جہاں کی
اے پردہ سوز امکاں! اے جلوہ ریز عرفاں
تو شمع انجمن ہے کس بزم دلستاں کی
کیوں جادۂ طلب میں پھرتی کشاں کشاں ہے

تجھ کو تلاش ہے کس گم گشتہ کارواں کی
جاتی ہے تو کہاں کو! آتی ہے تو کہاں سے
وابستگی ہے تجھ کو کس بحر بے نشاں سے

آئی نظر تجلی جب شاہدِ ازل کی
ذروں میں جا کے چمکی پھولوں میں جا کے جھلکی
ہندوستان ہے اک دریائے حسن قدرت
اور اس میں پنکھڑی ہے تو خوشنما کنول کی

نکلی ہمالیہ سے محو خروش ہو کر
تو آہ تشنہ لب تھی وہ جلوۂ ازل کی
کرتی ہوئی زمین پہ ہوتی نشاد آئی
درشن کو آہ! ہر کے تو سر دوانہ آئی
یہ جوش سبزۂ گل یہ تیری آبیاری
قدرت کے چپہ چپہ پہ یہ شگوفہ کاری
ہندوستاں کو تو نے جنت نشان بنایا
نہریں کہاں کہاں ہیں تیرے کرم کی جاری

اے آب رود گنگا! موجوں میں تیرے مل کر
موج سراب ہستی ہو بے نشان ہماری
بعد فنا ہمارے پھولوں میں بو ہو تیری
گم ہوں رہ طلب میں تو جستجو ہو تیری
آئے اجل کی زد پہ جب اپنی عمر فانی
اور ختم رفتہ رفتہ ہو سبیل زندگانی
دنیا سے آہ! جب ہو لپٹے سفر کا سامان
بالیں پہ اقربا ہوں سر گرم نوحہ خوانی

جب ہونٹ خشک ہوں اور دشوار ہو تنفس
احباب اپنے منہ میں ٹپکائیں تیرا پانی
ہنستے ہوئے جہاں سے ہم شاد کام جائیں
دنیا سے پی کے تیری الفت کے جام جائیں

جمنا

دھیمی دھیمی بہنے والی ایک نہر دل نشین
آب جو چھوٹی سی اک نازک خرام و نازنین
تشنگی شوق گنگا میں بجھانے کے لیئے
جاری ہے اپنی ہستی کو مٹانے کے لیئے
یہ وہ جمنا ہے کہ دل کش جس کا ہے اندازِ حسن ۱
دیکھتے ہیں آہ عاشق جس کا خواب نازِ حسن
یہ وہ جمنا ہے کہ گاتے ہیں سخنور جس کے گیت
مطربان خوش گلو کی ہیں زبان پر جس کے گیت

یہ وہ جمنا ہے جہاں لے لے کے جلوت کے مزے
لوٹے ہیں عشاق نے برسوں محبت کے مزے
یہ وہ جمنا ہے کہ رادھا سی حسین نے مدتوں
برج کی اک پاک دامن نازنین نے مدتوں
بنسی والے کی جدائی میں اڑا کر سر پہ خاک
اپنے اشکوں سے کیا ہے دامن ساحل کو پاک
یہ وہ جمنا ہے جہاں اک بانوے پردہ نشین

آگرہ میں تجھ آسائش ہے جو زیر زمین
رخ سے آہستہ الٹ کر چادر آب رواں
دیکھتی تھی مسکرا کر منظر آب رواں

آہ! اے مہر لطافت! آہ اے بحر جمال
دل میں ہے پہلو نشین اب تک ترا نقش خیال
گرچہ تجھ میں اب نہیں وہ جلوہ شان کہن
وہ جبین تو ہے کہ اے شمع شبستان کہن
حسن رفتہ میں ہے تیرے اب بھی اک دلکش ادا
تیرے کملائے ہوئے پھولوں میں ہے بوئے وفا
تو وہ دریائے مقدس ہے کہ ہے عصیاں سے پاک
تیرا دامن اب بھی ہے آلائش انساں سے پاک
تیری شوکت کے ہیں شاہد اے دیار کہن
تیرے برجوں اور ترے قلعوں کے آثار کہن
تیرے ساحل سے ٹپکتی اب بھی ہے شان بلند
آسماں فرسا ہیں اب بھی تیرے ایوان بلند
تیرے فرسودہ نشاں ہیں نقش ناز حسن و عشق
تیری موجوں میں نہاں ہے آہ راز حسن و عشق

آہ! اے رنگین ادا! او دلی والی نازنین
او! دو عالم کے حسینوں سے نرالی نازنین
یاد آیا ہے کہ دل کش تھے ترے نقش و نگار
دن مرادوں کے تھے اور جوش جوانی کا ابھار

چڑھ کے جب مینار پر اک لعبتِ ناز آفریں
دیکھتی تھی تیری موجوں کی ادائے دل نشیں
وہ کفِ سیلاب - وہ شورِ تلاطم ہائے ہائے
تیری موجوں کا وہ اندازِ تبسم ہائے ہائے

دھیمی دھیمی وہ تری رفتار بل کھائی ہوئی
وہ نظر جھپتی ہوئی - چتون وہ شرمائی ہوئی
وہ سریلی نغمۂ جوش تلاطم کی صدا
آہ! وہ دل کش ترے سازِ ترنم کی صدا
برج کی او پاک دامن او مقدس نازنین
نقش ہے دل پہ تری اک اک ادائے دلنشیں

اب کہاں جمنا! تری موجوں کی مستانہ وہ چال
اب کہاں پانی کے جھرنے اور وہ لطفِ برشگال
اب کہاں چھوٹا سا وہ رادھا کا کنج خوشگوار
اب کہاں وہ آہ! متھرا! تیرے پھولوں کی بہار
اب کہاں وہ بنسی والے کی ادائے جاں نواز
اب کہاں وہ آہ! مرلی کی صدائے جاں نواز
اب کہاں وہ خلوتِ راز و نیازِ حسن و عشق
بے صدا زیرِ زمیں ہیں آہ! سازِ حسن و عشق

او تلون کیش! او کافر ادا! او رہ دوں شعار
تو نے بدلے رنگ لاکھوں آہ! وضع روزگار

خاک اٹھ کر آہ! سر پہ دامن ساحل اڑا
ٹکڑے ٹکڑے کر جگر کو پارہ ہائے دل اڑا
سوزشِ غم سے پگھل جا آہ! اے دیگِ رواں
ذرّے ذرّے میں ترے تصویرِ عبرت ہے نہاں
اب کہاں وہ گنجِ دلکش اب کہاں داودھا کا عیش
ہے برنگِ خندۂ گل بے بقا دنیا کا عیش
اے خوشا! قسمت تری جمنا! خوشا! تیرے نصیب
واہ وا تیرا مقدر۔ واہ وا تیرے نصیب

تو نے دیکھی ہے بہت دن مرلی والے کی ادا
دونوں عالم کے حسینوں سے نرالے کی ادا
اور سنی بنسی کی ہے برسوں صدائے دل نواز
داستانِ دردِ دل۔ افسانۂ سوز و گداز
محشرستانِ الم کمبخت ہے کر دل کو چاک
چیر پہلو کو کہ نکلیں نالہ ہائے دردناک

تا کجا! یہ سرگذشت داستانِ دردِ و غم
چھیڑ! اے جمنا! کوئی تازہ بیان درد و غم
ہو نہ لیکن آہ! تیرا شور ماتم دل خراش
تیرے نالوں کی صدا یعنی ہو کم کم دل خراش
اے لبِ ساحل! شناسیتوں کی عصمت کہاں
بہ دو افسانہ میں سوز محبت کا بیان
تیرے پہلو میں ہے یہ کس حور وش کی یادگار

جس سے راتوں کو اٹھا کرتے ہیں آہوں کے شرار

آہ! فرسودہ نشانِ عصمت جانبازِ تو
کس پری پیکر کا ہے نقشِ وفائے ناز تو
ہے تری تعمیر میں مضمر وہی شانِ وفا
تیری ہر خشت کہن ہے جوہر کانِ وفا
غل نہ کر آہستہ آہستہ ہوا اے جمنا! رواں
تاجِ عصمت کا یہاں ہے اک دُرِ یکتا نہاں
کون یہ پردہ نشین ہے تیرے دامن میں نہاں
کس کا چہرہ ہے نقابِ زلف بر فن میں نہاں
تیری موجوں میں ہے یہ کس کی صدائے دلفریب
گا رہی ہے کون یہ غارت گر صبر و شکیب

خانۂ دل میں ہے تیرے کون محو رقص ناز
آ رہی ہے کس کی چھاگل کی صدائے جاں نواز
وہ سمن اندام ہے یہ شاہد پردہ نشین
جس کے پھولوں میں ہے اشکِ بوئے فردوسِ بریں
حوریں آکر خلد سے طوفِ مزارِ پاک کو
جھاڑتی پلکوں سے ہیں گرد و خس و خاشاک کو
آہ! اے نقش و نگارِ شوکتِ عہدِ کہن
آہ! اے آئینہ دارِ شوکتِ عہدِ کہن
ہم نے مانا تجھ میں اب وہ شانِ برنائی نہیں
وہ غرورِ حسن۔ وہ تمکین وہ رعنائی نہیں

ہم نے مانا تیرے چہرے کی ضیا جاتی رہی
تیری موجوں کی وہ مستانہ ادا جاتی رہی
منہ پہ گمنامی کا آنچل لے نہ اے پردہ نشین
یونہی سرگرم خرام ناز رہ اے نازنین
سر کو ٹکرایا کرے ساحل سے سیل روزگار
تیری شہرت کے نشاں صدیوں رہیں گے یادگار

لالہ لاجپت رائے

اے شہید ہمت مردانۂ ایثار نفس
اے فنانی القوم! اے پروانۂ ایثار نفس
آہ! اے جرعہ کش پیمانۂ ایثار نفس
تو کہاں ہے اے چراغ خانۂ ایثار نفس

تیرے غم میں آہ! اے جاں دادۂ سوز نہاں
ہیں برنگ برق مضطر۔ تیرے پھولنے تپاں
اے محب قوم! اے سرمایۂ جان وطن
مرحبا! اے نازش اجزائے ارکان وطن

حبذا! اے جلوہ افروز شبستان وطن
آفریں! صد آفریں! اے جوہر کان وطن
ہو کے طوفان میں اسیر حلقۂ گرداب تو
بن کے چمکا تاج شہرت کا دُر نایاب تو

راست گو تھا تو۔ خوشامد تیری عادت میں نہ تھی
صلح کل تھا۔ فتنہ پردازی طبیعت میں نہ تھی
شورش انگیزی ازل سے تیری خلقت میں نہ تھی
آہ! داد جانفروشی تیری قسمت میں نہ تھی

تو وہ بلبل تھا۔ کہ تھا صیاد تیری تاک میں
تو وہ آہو تھا کہ تھی تیری جگہ فتراک میں

منشی مہاراج بہادر برقؔ

سورج مکھی کا پھول

اک چشم اشتیاق ہے سورج مکھی کا پھول
نادیدۂ فراق ہے سورج مکھی کا پھول
ہر وقت دید مہر منور نصیب ہے
آئینہ داری شہ خاور نصیب ہے
یہ رتبہ بلند کنول کو کہاں حصول
منہ دیکھتا ہے چشمہ خورشید میں یہ پھول
یہ چشم شوق بن کے نثار شعاع ہے
اس کی نگاہ بستۂ تارِ شعاع ہے
یہ ذوق دید ہے کہ جھپکتی پلک نہیں
نظارہ سوز تابش مہر فلک نہیں
کرتا ہے کسب نور رُخ آفتاب سے
نزہت نصیب ہے اِسے فیض سحاب سے
رنگینیٔ بہار کا پیکر کہوں اِسے
صہبائے انبساط کا ساغر کہوں اِسے
جوش شگفتگی ہے ہر اک برگ سے عیاں
یہ حسن تازگی گل صد برگ میں کہاں

لالے کے دل میں اس کی لطافت سے داغ ہے
گل یاسمن کا سامنے اس کے چراغ ہے
نیچی ہے آنکھ نرگس بدمست خواب کی
سب سے الگ ہے شان گل آفتاب کی

ہر چیز کی ہے گلشن ہستی میں خو جدا
ہر پھول کا ہے رنگ جدا اور بو جدا
قربان روئے ہمسر منور یہ پھول ہے
اوراق شرح عشق کا دفتر یہ پھول ہے

ظاہر ہے عشق مہر مبین اس کے نام سے
تارے برائے صبح یہ گنتا ہے شام سے
ہر وقت بہر مقدم خورشید کے لئے
رکھتا ہے اپنا حلقہ آغوش وا کئے

مہر مبین سے انس اسے بے حساب ہے
اس کا بھی رخ ادھر ہے جدھر آفتاب ہے
وقت طلوع مہر سے لیکر غروب تک
رہتی ہے اس کی آنکھ لگی جانب فلک

حدت سے آفتاب کی رنگ اس کا زرد ہے
سوز دروں تراوش شبنم سے سرد ہے
یہ پھول گرم و سرد سے نا آشنا نہیں
رنگ بقا جہان میں غیر از فنا نہیں

ہیں تخیل بند دہر کی گل کاریاں عجیب
پھولوں کے رنگ و بو سے ہے فرحت ہمیں نصیب

ہر گل ہے برقؔ اپنی جگہ لاجواب پھول
سورج مکھی کا پھول بھی ہے انتخاب پھول

بسنت رُت

بسنت آئی ہے پھر مشکبار کیا کہنا — بنے ہیں دشت و جبل لالہ زار کیا کہنا
برس رہا ہے سحر لالہ زار کیا کہنا — یہ دُر فشانی ابر بہار کیا کہنا
یہ جوش لالہ و سنبل یہ حسن غنچہ و گل — یہ فرش خاک یہ نقش و نگار کیا کہنا
جلا کے رخت خزاں دم زدن میں خاک کیا — اڑے وہ آتش گل سے شرار کیا کہنا
سمٹ کے غنچۂ تو بن گیا ہے جوش نمو — اس انتشار پہ یہ اختصار کیا کہنا
شگوفہ ریز ہے ہر جنبش نشاط انگیز — یہ رنگ موج نسیم بہار کیا کہنا
کہیں ترانۂ قمری کہیں ہے بانگ ہزار — بنا ہے صحن چمن لالہ زار کیا کہنا
شمیم غنچہ و البتہ فرح بخش دماغ — خجل ہے نافۂ مشک تتار کیا کہنا
سرور اور سرور شراب خندۂ گل — خمار اور خمار بہار کیا کہنا
بسنت رت میں ہیں گل پیرہن بسنتی پوش — گلے کے ہار ہیں پھولوں کا ہار کیا کہنا
نظر فروز ہے وہ رنگ روپ سرسوں کا — ہے جس سے رنگ طلا شرمسار کیا کہنا
گل بنفشہ۔ گل اشرفی۔ گل سر شف — نظر ہے حسن پہ ان کے نثار کیا کہنا
گلال بن کے رخ گل پہ چھائی ہے سرخی — عبیر بن کے اڑا ہے غبار کیا کہنا
فضائے سبزہ سب جو نثار جلوۂ گل — یہ فرش خاک یہ نقش و نگار کیا کہنا

یہ رت بسنت کی۔ اور برقؔ مبتلائے الم
بہار اور دل داغدار کیا کہنا

دیوالی

بزمِ محفلِ انجم ہے چراغاں کی بہار
جلوہ افزا ہے شبِ نوربداماں کی بہار
قابلِ دید ہے ایوان و شبستان کی بہار
برق نظارہ ہے اب عالمِ امکاں کی بہار

معدنِ روشن سے خجل مہر کو حیرانی ہے
شبِ تاریک میں عالم ہمہ نورانی ہے

بقعۂ نورِ تجلی سے ہے ہر ایک مکان
نور ہی نور ہے ہر سمت عیاں تا بہ بیان
موجِ نور میں گم ہو گیا ظلمت کا نشاں
آنکھ اٹھتی ہے جدھر شام اودھ کا ہے سماں

آج بنباس سے واپس شری رام آگئے ہیں
دیپ مالا نہ ہو کیوں، ماہِ تمام آگئے ہیں

شادمانی ہے لنکا کی مسرت کا وفور
آج گھر گھر میں ہے بھارت کے عجب کیف و سرور
ضوفشانی سے چراغوں کی ہے اک تابشِ نور
جنتِ دیدۂ نظارہ ہے چشمِ بد دور

چاندنی رات سے بڑھ کر ہے حسین آج کی رات
صبحِ نوروز سے روشن ہے کہیں آج کی رات

آج ہی لکشمی پوجا کی ہے تقریب سعید
جس کے جلوے سے تجلی پہ تجلی ہے مزید

آج کی ذات سے وابستہ خزانوں کی کلید
رسم تہذیب کی ہر سال ہے تجدید جدید
ڈھل گئے ایک نور کے سانچے میں یہ رات آئی ہے
بزم عالم کی جو تقدیر کو چمکاتی ہے

احتساب زندگی

بتا اے خاک کے پتلے کہ دنیا میں کیا کیا ہے
بتا کتنے دانت ہیں منہ میں ترے کھایا پیا کیا ہے
بتا خیرات کیا کی راہِ مولیٰ میں دیا کیا ہے
یہاں سے عاقبت کے واسطے توشہ لیا کیا ہے
دعائیں لیں کبھی ٹھنڈا کیا دل دردمندوں کا
بھرے حالوں میں تو شامل ہوا محتاج بندوں کا
کبھی گم کردہ راہ کی خضر بن کر رہنمائی کی
کبھی کی ناخنِ تدبیر سے عقدہ کشائی کی
رفعِ مشکل کسی مظلوم کی حاجت روائی کی
کبھی کی دستگیری کی کسی سے کچھ بھلائی کی
کبھی کچھ کام بھی آیا کسی آفت رسیدہ کے
کبھی دامن سے پونچھے تو نے آنسو آبدیدہ کے
شریکِ دردِ غم ہو کر کسی کا دکھ بٹایا ہے
مصیبت میں کسی آفت زدہ کے کام آیا ہے
پرائی آگ میں پڑ کر کبھی دل بھی جلایا ہے
کسی بیکس کی خاطر جان پر صدمہ اٹھایا ہے

کبھی آنسو بہائے ہیں کسی کی بد نصیبی پر
کبھی کھایا ترس کچھ تو نے مفلس کی غریبی پر
کبھی تو نے کسی برگشتہ قسمت کی خبر لی ہے
کسی ماتم زدہ کی تو نے دلجوئی کبھی کی ہے
کسی کے واسطے آفت میں اپنی جان ڈالی ہے
کسی بے خانماں کو وقت مشکل کچھ مدد دی ہے
کبھی کچھ دلنوازی کی ہے تو نے دل شکستہ کی
کبھی کچھ چارہ فرمائی بھی کی زخمی دخستہ کی
کبھی امداد دی تو نے کسی بیکس بچارے کو
سخی بن کر دیا کچھ تو نے مفلس ڈگذارے کو
تسلی دی کبھی تو نے کسی آفت کے مارے کو
کبھی تو نے سہارا بھی دیا ہے بے سہارے کو
حباب آسا قرار زیست ہے دنیائے فانی میں
جو تجھ سے ہو سکے کر لے بھلائی زندگانی میں
نہ دولت ساتھ جائیگی نہ ثروت ساتھ جائیگی
نہ شوکت ساتھ جائیگی نہ رفعت ساتھ جائیگی
پس مردن نہ شاہانہ امارت ساتھ جائے گی
نہ عظمت ساتھ جائیگی نہ صولت ساتھ جائیگی
جو پوچھے جائیں گے محشر میں وہ اعمال ہیں تیرے
اگر کچھ ساتھ جائیں گے وہ نیک افعال ہیں تیرے
مناسب ہے کہ نیک اعمال کر طاعت گذاری کر
پسندیدہ طریقے سیکھ عجز و انکساری کر
بھلائی کر بدی سے باز آ پرہیزگاری کر

جو تجھ سے ہو سکے تو خلق کی خدمتگزاری کر
اگر نیکی کرے گا۔ تو خدا اس کا ثمر دے گا
ترا دامن وہی اُمید کے پھولوں سے بھر دیگا

کرشن اوتار

مٹانے ظلمت ہستی کو جلوہ بار آیا — زمین پر حسن ازل ہو کے بیقرار آیا
جگانے ذروں کی تقدیر بہ تابش رخ سے — ضیا فروز جہاں ۔ مہر تابدار آیا
نظر کو نور ۔ دلوں کو سرور دینے کو — سحاب لطف و کرم برق در کنار آیا
سکھانے پریت کی ریت اور سنانے پریم کے گیت — لیئے وہ بانس کی پوری میں لالہ زار آیا
طلسم ہستی بے بود بے نقاب ہوا — امین راز برائے کشود کار آیا
مٹی جو ظلمت اوہام کھل گئی آنکھیں — کہ منکروں کو حقیقت کا اعتبار آیا
تجلی رخ روشن سے نور پھیل گیا
شراب نور سے کیف سرور پھیل گیا
گوال بن کے بسر کی گوال بالوں میں — رہا بہار جناں بن کے نونہالوں میں
تجلی پاش تھا جھرمٹ میں گوپیونکے وہی — تھا ایک چاند کا جلوہ ہزار ہالوں میں
سرور عشق سے تھا ساقی ازل مسرور — مئے ظہور کا تھا دور حسن والوں میں
اسی کے نور کے پرتو سے تھا فروغ جمال — ضیائے مہر منور تھی مہ جمالوں میں
ہزار رنگ سے جلوہ نمائی کی اس نے — بسا دلوں میں سمایا کبھی خیالوں میں
امان جہاں کو دی کنس کے مظالم سے — حیات نو ہوئی پیدا شکستہ حالوں میں
نچایا کوہ کو انگلی پہ کاہ کی صورت
مٹایا نقش شب تار ماہ کی صورت
نوائے نے سے حقیقت کی ترجمانی کی — کدم کی چھاؤں میں دی داد گلفشانی کی

فضائے دہر کو نغموں سے کر دیا سرشار — نسیم لطف چلی کیف جاوِدانی کی
مٹا کے مارسیہ کالی وہ کو پاک کیا — بڑھائی آبرو آب گہر سے پانی کی
سحاب فیض سے سیراب تشنہ کام ہوے — رواں دواں ہوئی اک لہر شادمانی کی
ہر ایک ذرہ بیجاں میں جان سی آئی — وہ روح پھونک دی احساس زندگانی کی
عمل کے پردہ میں نِشکام کا سبق دیکر — دکھائی منزل مقصود کامرانی کی

ہوا و حرص سے نفسانیت سے پاک کیا
بلند رتبہ آلودگاں خاک کیا

کیا جہاں کو منور ضیائے عرفاں سے — فروغ نور ہوا جلوۂ فراواں سے
بقدر ذوق دیا سب کو لطف جلوۂ دید — نظر نوازی خورشید روئے تاباں سے
انھیں بھی بارشِ انوار سے کیا شاداب — جلے تھے خرمن ہستی جو برق عصیاں سے
جہاں تیرہ کو "گیتا" سے جلوہ زار کیا — مٹائی تیرگی جہل بزم امکان سے
وراٹ روپ میں ارجن کو جب دئے درشن — کیا حجاب خودی دور چشم حیراں سے
بنایا محرم اسرار ناشناسوں کو — علیم راز کیا وصل جان وجاناں سے

نہفتہ راز حیات و ممات کھول دیئے
تمام عقدۂ بند و نجات کھول دیئے

مہرشی دیانند

اے مہرشی! چراغ ضیا بار معرفت
آئینہ دار جلوۂ انوار معرفت
تازہ مشام جاں ہوئے تیری شمیم سے
اے حسن تازگی، گل گلزار معرفت

سرشارِ ساغرِ مئے وحدت کیا ، ہمیں
مست الست خانۂ خمّار معرفت

پرکاش تیرے دم سے ہوا نور وید کا
عقدہ کشائے معنیِ دشوار معرفت

آئینہ تو نے از سرِ نو کر دیئے تمام
تھے پردۂ خفا میں جو اسرار معرفت

ہر لفظ گوشوارۂ اہلِ یقین ہوا
دنیا کو تو نے لٹائے وہ دُرِ شہوار معرفت

نقش بر آب دعوئے اوہام ہو گئے
تجھ سے ہوئی وہ گرمیٔ بازار معرفت

ٹھہرا یا شستر سے نہ ڈرا شاستراتھ سے
تو سر بکف رہا پئے اظہار معرفت

رکھ دی جنھوں نے کفر کی بخیہ ادھیڑ کر
تجھ کو ملے تھے وہ لبِ گفتار معرفت

سنگِ نشاں بتائے گم کردہ راہ کو
خضرِ طریق منزلِ دشوار معرفت

اوصاف جو کہ رشیوں کے ہیں کائنات میں
ہیں جمع تیری ذات ستودہ صفات میں

آئین وید پاک کا تجھ سے عمل ہوا
شنکر کا تو جہاں میں نعم البدل ہوا

تو نے حجاب روئے حقیقت اٹھا دیا
تجھ سے ظہور جلوۂ حسنِ ازل ہوا

تشریح اوہم کی تری فہم بلند نے
ناخن سے تیرے عقدۂ توحید حل ہوا
کالنقش فی الحجر ہوا تیرا سخن سخن
ہر حرف راستی ترا ضرب المثل ہوا
صدق و صفا کا تو نے بجایا جو سنکھ ناد
حیرت سے فاسقوں کے سکوں میں خلل ہوا
بنیاد کفر ہل گئی وحدت کے رعب سے
صد پاش مشرکوں کا ہوائی محل ہوا
قائم رہا نہ دور تسلسل فریب کا
برسوں کا ختم آن میں طول امل ہوا
کھینچی خفیف ہو کے جو تیغ انتقام کو
ہیبت سے تیری بازوئے سفاک شل ہوا
فرمان شاستر کا تھا جو بات تو نے کی
سرزد جو فعل تجھ سے ہوا جو محل ہوا
امرت سمجھ کے ساغر زہر آپ پی لیا
قربان ہو کے دھرم پہ نذر اجل ہوا
اعجاز مرنے میں بھی تو نے دکھا دیا
منکر کے دل سے نقش دوئی کا مٹا دیا

مہارانا پرتاپ اور باوفا چیتک

پرتاپ ہلدی گھاٹ سے جو سر بکف چلا
اک شیر تھا کہ توڑ نے مغلوں کی صف چلا

زخموں سے چور چور تن شہسوار تھا
دن بھر کے معرکے سے چیتک بھی نزار تھا
مجروح جسم زار تھا پرتاپ کی طرح
گھوڑا بھی بے قرار تھا سیماب کی طرح
اس پر بھی بھر رہا تھا طرار سے ہوا کے ساتھ
صحرا کی راہ گرد تھی ہر نقش پا کے ساتھ
سرعت سے پاؤں ٹکتے نہ تھے رہگزار پر
احساس تھا کہ وقت کڑا ہے سوار پر
پہچان کے لباس سے رانا کو دو مغل
حملہ کناں عقب میں چلے صورت اجل
گھوڑے اڑائے گرم تگ و تاز ہو گئے
دیکھا جو خستہ جان پس جانباز ہو گئے
تھے گرم راہ جو دو سپہ حریفاں چیتک کے ساتھ
شعلوں کا تھا مقابلہ برق فلک کے ساتھ
کوشش جو دشمنوں نے پئے انتقام کی
کوسوں کی راہ چشم زدن میں تمام کی
نالا جو ایک آگیا رستے میں سامنے
اک بار جست کی فرس تیز گام نے
دونوں حریف رہ گئے پیچھے مثال گرد
لیکن وہ تازہ دم تھا ہوا حوصلہ نہ سرد
نالے کو پار کر کے تعاقب کناں چلے
پہلے سے ہو کے صورت سیل رواں چلے
دیکھا سکت نے دور سے رانا پہ وقت تنگ

گھوڑے کو ایڑ دے کے چلا صورت خدنگ

بھائی کو دلفگار جو دیکھا نہ رہ سکا
گھایا ہونے چوٹ یہ صدمہ نہ سہہ سکا

دم بند دشمنوں کا دم جنگ کر دیا
دونوں کو ایک ہاتھ میں چورنگ کر دیا

رانا کا آڑے وقت سکٹ نے دیا جو ساتھ
دونوں گلے ملے دیئے باہم بڑھا کے ہاتھ

لیکن زمین پہ گر کے چیتک سرد ہو گیا
پرتاپ رنج سے ہمہ تن زرد ہو گیا

تازہ لگایہ زخم تو طاقت بدل گئی
گویا زمین پاؤں تلے سے نکل گئی

جو شیر دل نہ پست ہوا رزم گاہ میں
تاریک تھا جہان اب اس کی نگاہ میں

پرتاپ کو چیتک تھا دل و جان سے عزیز
انسان و جانور کی نہ باقی رہی تمیز

بنوائی اک سمادھ چیتک کے لئے وہاں
توڑا تھا دم فرس نے تڑپتے ہوئے جہاں

رانا پہ جان دے کے ملی یہ وفا کی داد
صدیوں کے بعد زندہ ہے اب بھی چیتک کی یاد

اشوک بن میں

طرب انگیز ہے اشوک بن کی شام نورانی
صبائے روح پرور کر رہی ہے عطر افشانی
مزین دامن صحرا ہے خود رو بیل بوٹوں سے
تن کہسار کی زینت ہے سبزے کی قبا دھانی
برستا ہے فلک سے نور فرش خاک روشن ہے
زمیں کو بخش دی ہے ماہ نے اپنی درخشانی
چراغ صبح ہیں روشن ستارے اوج گردوں پر
مہِ تاباں کے آگے بھر رہے ہیں شام سے پانی
کہیں محو تماشا ہے قمر سرخاب صحرا میں
کہیں رم خوردہ آہوئے بیاباں گرم جولانی
جو گل مرجھا چلے تھے حدت خورشید رخشاں سے
وہ ٹھنڈی روشنی میں ہو گئے پھر خندہ پیشانی
بھری ہیں کوٹ کر رنگینیاں پھولوں کے دامن میں
دیا ہے صانع قدرت نے سب کو حسن لاثانی
وہ ہر ہر برگ پر گل کاریاں ہیں کلک قدرت کی
کہ ہے غواص بحر فکر جن سے فہم انسانی
پلٹتی ہیں نگاہیں دامن نظارہ بھر بھر کر
گل و غنچے سے ہے پیدا وہ پنہاں شان یزدانی
زبان حال سے شاہد ہے شادابی درختوں کی
ہوا ہے فصل گل میں عام فیض ابر نیسانی

قیامت ہے بیرِ صحرا بکھرنا زلفِ سنبل کا
اماں گیسوئے پیچاں میں یہ اندازِ پریشانی
گل خنداں ہیں محوِ خوابِ راحت شاخِ گلبن پر
ملی بادِ صبا کو خدمتِ گہوارہ جنبانی
کسی کے چاند سے چہرے کا آئینہ میں پرتو ہے
کہ جیسے آبِ مصفا میں یہ عکسِ ماہِ نورانی
فضائے دشت ہے رنگیں مرقعِ حسنِ قدرت کا
سرور افزا سماں ہے قاطعِ آلامِ روحانی
یہ دل کش سین ہے اور یہ سہانا وقت ہے لیکن
سکوتِ شب میں سرگرمِ فغاں ہے ایک زندانی

سراپا یاس کی صورت مجسم نقشِ حیرانی
کھڑی ہیں سرنگوں، زیرِ شجر سیتا مہارانی
پریشاں تا کمر ہیں موئے سر بیگانۂ تزئین
لباس جو گیا ہے، پردہ دارِ جسمِ نورانی
برستا ہے ملالِ دل نشیں مغموم چہرے سے
نگاہِ مضطرب ہے ترجمانِ دردِ پنہانی
ہجومِ غم میں پنہاں ہو جیسے شعلۂ آتش
نہاں الجھے ہوئے بالوں میں ہے یوں نورِ پیشانی
قدِ موزوں جو تھا بوٹا سا، اعضا کے تناسب سے
نظر آتا ہے اب کا ہیدگی سے سرو طولانی
ہوئی ہے نذرِ اشکِ غم، چمک ہمہ نور آنکھوں کی
نگاہوں سے عیاں ہے دیدہ نرگس کی حیرانی

خلش افزا ہے نوکِ خارِ حسرت قلبِ نازک میں
جگر پر نیشتر زن ہے خیالِ خانہ ویرانی
ہوئی ہے تیرہ بختی سے یہ حالت قیدلون میں
گہن میں جس طرح ہو چودھویں کا چاند نورانی

تھپیڑے کھا کے موجوں کے کنول بدروپ ہو جیسے
ہوئی تاراج غم یوں رخِ روشن کی درخشانی
ستم ہے گردشِ قسمت نے یوں ڈالا ہے چکر میں
پڑے ہے گرداب میں جیسے کوئی کشتی طوفانی

ہجومِ بیکسی ہے ہم قفس کنجِ اسیری میں
شریکِ قید تنہائی ہے، انبوہِ پریشانی
پرندہ پر بھی مارے پر کسی صورت نہیں ممکن
درِ زنداں پہ صد ہا راکھشس کرتے ہیں دربانی

خیالِ رام لیکن لطف فرما ہے اسیری میں
یہی کرتا ہے زنداں میں نوازش ہائے پنہانی
بسی رہتی ہے ہر دم رام کی تصویر آنکھوں میں
انہی کے نور سے آنکھیں ہیں سیتا جی کی نورانی

وہ بس بیتاب ہیں قیدِ گراں میں دردِ فرقت سے
لبِ فریاد سے یوں کر رہی ہیں گوہر افشانی
یہ کیا نیرنگ ہے، اے انقلابِ عالمِ فانی
کہ آزادِ ازل ہے گردشِ دوراں سے زندانی

جو پھولوں میں تلیں اُف یوں گھسیٹے جائیں کانٹوں میں
سبکدوشوں کے حق میں بارِ خاطر ہو گراں جانی
یہ کن کرموں کا بدلہ لے رہا ہے او فلک مجھ سے

یہ کس پاپوں کے کا دن ہوں گرفتارِ پریشانی
پڑی افتاد کیا ایسی بُرے دن آئے ہیں جس سے
ہوئی ہے نقش باطل کیوں مری تحریرِ پیشانی
خیال و خواب میں بھی تو نہیں چھوڑا ستی پن کو
کبھی میں نے نہیں کی بھول کر بھی کوئی نادانی
غضب ڈھایا اکیلا پا کے مجھ کو دُشٹ راون نے
دیا دھوکا خلاف رسمِ آئینِ جہانبانی
پتی برت دھرم سے لیکن گرا سکتا نہیں مجھکو
میں ستونتی ہوں میں کہہ کے رہوں گی اپنی من مانی
زمین و آسمان زیر و زبر ہو جائیں ممکن ہے
مگر یہ غیر ممکن ہے بنوں لنکا کی پٹ رانی
مرا قابو میں لانا اس نے کوئی کھیل سمجھا ہے
مجھے مکار نے جانا ہے کیا مندودری ثانی
میں ہوں عصمت کی دیوی مجھ سے کیا نسبت ہے راون کو
نہیں یکجا بہم ہو سکتے ہرگز آگ اور پانی
سری رگھوناتھ جی ہیں پرتی اور میں انکی چھایا ہوں
ازل کے دن سے ہے میرا تعلق جسمی و جانی
لگا دو ناتھ بیڑا پار مجھ چرنوں کی داسی کا
پڑی منجدھار میں ہے اب مری کشتی طوفانی
تمہاری ذات سے وابستہ امید کشایش ہے
تمہیں پر منحصر ہے عقدۂ مشکل کی آسانی
چھما کیجئے مرے اپرادھ، درشن دیجئے مجھ کو
کہ تم مریادا پرشوتم ہو میں سیتا ستی رانی

وہ دن آئیگا جب دن تجھکو سونیکی گھڑی ہوگی
کہ پھر ہم دونوں دیکھیں گے لودھی کی شام نورانی

گورو گوبند سنگھ کی شان میں

عیاں تھا شان درویشی میں تیور کجکلاہی کا
رہے گا تا قیامت نام دسویں پادشاہی کا
گورو گوبند سنگھ نے روح وہ سنگت میں پھونکی تھی
کلیجہ ہاتھ بھر کا اب بھی ہے ہر سکھ سپاہی کا

کرم ویر سیواجی اور گورو گوبند سنگھ

جب بلائے جان تھا جذبہ دل نگاروں کے لیئے
زندگی دشوار تھی زنار داروں کے لیئے
جب سزائے دار تھی طاعت گزاروں کے لیئے
امن کا گوشہ نہ تھا آفت کے ماروں کے لیئے
ٹوٹتی تھیں بجلیاں جب خاطر مایوس پر
لگ رہی تھی مہر خاموشی لب ناقوس پر

جب صنم خانوں کے گُل بادِ ستم سے تھے چراغ
مٹ رہا تھا جورِ بیجا سے حقیقت کا سراغ
جب دورِ ظلم سے مظلوموں کے دل تھے داغ داغ
ہند کے جبر و تشدد سے نہ تھا حاصل فراغ
جب نہ قشقہ بر جبیں گھر سے نکلتا تھا کوئی
جادۂ حق پر کھلے بندوں نہ چلتا تھا کوئی
مطلعِ تاریک پر اس دم ہوا تیرا ظہور
غیب سے ظلمت میں پیدا ہو گئی اک موجِ نور
دم زدن میں مچ گیا شہرہ تیرا نزدیک و دور
جھک گئے قدموں پہ تیرے تاجِ شاہانِ غیور
کانپ اُٹھے دشمن تیری شمشیرِ عالم گیر سے
کر لیا قبضہ دلوں پر جوہرِ تسخیر سے
تو نے ڈالی زورِ بازو سے بنائے سلطنت
تو برادر کش نہ تھا تیغ آزمائے سلطنت
پرچمِ انصاف نے باندھی ہوائے سلطنت
تیری ہستی ایک رحمت تھی برائے سلطنت
تیری چشمِ عدل میں ہندو مسلمان ایک تھے
بد ترے اقبال سے لرزاں تھے امین نیک تھے
دشمنِ ایمان و دیں تھا اور نہ تو سفاک تھا
تیرا دامن داغِ خونِ بے کساں سے پاک تھا
حامیٔ جمہور ہمدردِ دلِ غم ناک تھا
سرکشوں کا تیری سرکوبی سے سینہ چاک تھا
تجھ کو رہزن کہنے والے دشمنِ انصاف تھے

رہبروں کے جو ہیں جوہر تجھ میں وہ اوصاف تھے
تو مرہٹوں کے لیے اک رحمتِ غفار تھا
جب ہم در پیش آئی پیشوائے کار تھا
قومی آزادی کا تو پہلا علم بردار تھا
رہنمائے حریت سردار خود مختار تھا
تیرے ساکھے ویسے پوچھے کوئی خاص و عام کے
ڈنکے بجتے ہیں دکن میں اب بھی تیرے نام کے
مرد میدان شجاعت، ماہر آئینِ جنگ
تجھ کو حملہ میں تامل تھا نہ شب خوں میں درنگ
ٹوٹ پڑتا تھا کہیں گر سے کبھی مثلِ پلنگ
قافیہ ہر رنگ سے دشمن کا تو کرتا تھا تنگ
وا نہ ہوتا تھا جو عقدہ زورِ شمشیر سے
کھول دیتا تھا اسے تو ناخنِ تدبیر سے
سر بکف لڑتا رہا تو دھرم رکھشا کے لیے
تیغ اعدا کش علم کی دیش سیوا کے لیے
تو سگِ دنیا نہ تھا، مرتا جو دنیا کے لیے
تاج رکھ کر نیکیاں کیں جمع عقبیٰ کے لیے
ملک گیری کی ہوس تھی خلق کی خدمت کیساتھ
زیر دستوں کی مدد کا دھیان تھا عظمت کیساتھ
تھے گرو گوبند سنگھ اوتار اور تو کرم ویر
تو تدبر کا تھا پتلا اور وہ روشن ضمیر
وہ دلوں پر حکمران تو تاجدار ملک گیر
تو دکن کا ماہ وہ پنجاب کے مہر منیر

نام روشن دیش کا دونوں دلاور کر گئے
دھرم کی ویدی پہ تن من دھن نچھاور کر گئے

سر شیخ محمد اقبال

ہمالیہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے
امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اول فلک جس کا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر
تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تیری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیال ہے
دامنِ موجِ ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے

اے ہمالہ! کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی
جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی

یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اس کی خامشی
دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی
سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تیری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا
دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا

وہ خموشی شام کی جس پہ تکلم ہو فدا
وہ درختوں پر تفکر کا سماں چھایا ہوا
کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پہ

خوشنما لگتا ہے یہ غازہ تیرے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا
ہاں دکھا دے اے تصور پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو
شورش سے بھاگتا ہوں دِل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فِدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اِک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دِن گذاروں
دُنیا کے غم کا دِل سے کانٹا نکِل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
ہو ہاتھ کا سرہانا سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو
صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو
ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو
آغوش میں زمین کے سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو
پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو
مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو
راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو
بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سو بادل گھرا ہوا ہو
پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اس کا ہم نوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احسان
روزن ہی جھونپڑی کا مجھ کو سحر نما ہو
پھولوں کو آئے شبنم جس دم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو نالہ مری دعا ہو
دل کھول کر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو

سرسبز جن کی نم سے بوٹا امید کا ہو
اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو
ہر دردمند دل کو رونا مرا رلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

گورو نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لئے ہندوستان غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بت کدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

سری رام چندر

لبریز ہے شرابِ حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطۂ مغرب کے رامِ ہند
یہ ہندیوں کی فکرِ فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بامِ ہند
اس دیش میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانہ میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
داماں آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

من اور تن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن اپنا تو بن
من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن
من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج
من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات + تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

غزل

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی مگر نیا خار زار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جسکو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا
نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ، ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سر رہگزار بیٹھا، ستم کش انتظار ہوگا

گنگا سے فریاد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پہ مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں.

تصویر درد

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گل چیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو
وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ! اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذت فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل پہ گامزن محبوبِ فطرت ہے

ہندوستاں ہمارا

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا
اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

منشی سورج نرائن مہر

حبّ وطن

دیکھا ہے ہم میں نے قدرت کا کارخانہ
سیر و سفر کیا ہے چھانا ہے سب زمانہ
اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانہ
خارِ وطن کو گل سے خوش تر ہے سب نے مانا

اہلِ وطن سے پوچھو تم خوبیاں وطن کی
بلبل ہی جانتی ہے آزادیاں چمن کی
کھاؤ ہوا وطن کی کچھ اور ہی مزا ہے
پانی پیو وطن کا امرت سے بھی سوا ہے

خاکِ وطن نہ کہئے، اکسیر و کیمیا ہے
رتبہ یہی زمیں کا کچھ اے وطن جدا ہے
جو شے غرض یہاں ہے دنیا سے ہی نرالی
نام وطن نے اس میں تازہ ہے جان ڈالی

باغوں میں پھر کے دیکھو کچھ اور ہی ہو نزہت
کھیتوں سے یاں کے آتی ہے آنکھ میں طراوت
رکھتے ہیں یاں کے دریا کچھ اور ہی لطافت
یاں کے پہاڑ میں ہے عرشِ بریں کی رفعت
دنیا میں پھر کے دیکھا ہرگز کہیں نہیں ہے

باغ بہشت کہیے یہاں کی زمین نہیں ہے

ہے دھوپ میں وطن کی کچھ اور نورِ تاباں
اور چاندنی یہاں کی چاندی سی ہے درخشاں
انوار کی تجلّی بجلی سے ہے نمایاں
رحمت کی وہ جھڑی ہے کہیے نہ اس کو باراں
مثل ضمیر روشن مطلع کی ہے صفائی
دل میں اٹھیں امنگیں جدھر گھٹا گھر آئی

دیکھے یہاں کے انسان اکثر فرشتہ خو ہیں
سب عورتیں حسین ہیں سب مرد خوبرو ہیں
رکھتے یہاں کے حیواں کچھ اور خو و بو ہیں
اور طائروں کو دیکھو تو کیا ہی خوش گلو ہیں
انسان اور حیوان یوں تو ہیں دیکھے بھالے
لیکن یہاں ہیں سب کے انداز کچھ نرالے

ہر قطعۂ زمیں سے وابستہ ہے کہانی
کہتا ہے چپہ چپہ روداد پاستانی
ملتی جگہ جگہ ہے طفلی کی یاں نشانی
منظر بہت ہیں ایسے گزری جہاں جوانی
کیونکر جگہ وطن کی دل میں نہ ہو ہمارے
جو دن ہمیں تھے پیارے گزرے یہاں وہ سارے

جوہر وطن میں آکر کھلتا ہے آدمی کا
جب تھا وطن سے باہر بیشک وہ آدمی تھا
یاں آدمی نہیں وہ ہے باپ یا کہ بیٹا
کہتا ہے کوئی بھائی کوئی اسے بھتیجا

ہاں گوش زد ہیں ہر سو الفت بھری صدائیں
باہر وطن سے ہرگز جو کان میں نہ آئیں
ہے ہم کو جان و دل سے اپنا وطن پیارا
اچھا وہ دن ہے اس کی خدمت میں جو گذارا
کہتے ہیں ہم وطن کو آنکھوں کا اپنی تارا
وہ جان ہے ہماری ایمان ہے ہمارا
ہاں قمرؔ یہ سخن ہے دنیا میں سب نے مانا
اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانا

تدبیر و تقدیر

جہاں میں آدمی ملتے ہیں دو طرح کے قمرؔ
وہ کون قائل تدبیر و قائل تقدیر
مقولہ ایک کا یہ ہے ہر ایک فرد بشر
خدا نے خلق کیا محض بستۂ زنجیر
مشیت ازلی میں جو ہو چکا مرقوم
مجال کس کی ہے جو کرسکے اسے تغیر
اگر ارادہ انسان پہ حصر کام کا ہو
تو حرف آتا ہے بر قدرت خدائے قدیر
اسی سبب سے ہے کل سعی سعئ لاحاصل
کبھی جبیں کے مٹائے نہیں مٹی تحریر

فریقِ ثانیہ کو اتفاق اس سے نہیں!
وہ مانتے ہیں کہ ہے مایۂ ظفر تدبیر
نہ کیجئے سعی تو بے سعی کام کیونکر ہو
بلا دوا نہیں ہوتا مرض علاج پذیر
نہ کامیاب ہو انسان اگر ارادے میں
تو یوں سمجھ لو کہ کوتاہ اس کی تھی تدبیر
کھلی ہے راہ ترقی جہاں میں چار طرف
کوئی نہ اس پہ چلے تو اسی کی ہے تقصیر
خدا نے ہم کو دیا اختیار و آزادی
کیا نہ خلق ہمیں مثلِ مجرمانِ اسیر

جو مجھ سے پوچھو تو نیکی کا راستہ ہے وسط
نہ ذاتی بہرہ ہے یہ اور نہ اس کی ہیچ تقریر
کچھ ایسے کام ہیں وابستہ ہیں مقدر سے
کچھ ایسے ہیں کہ ہیں محتاج ناخنِ تدبیر
سبب جو پوچھو تو فکرِ معاش و فکرِ معاد
جہاں میں ہوتے ہیں دو آدمی کے دامنگیر
زبسکہ فکر ہیں دو چاہیں علاج بھی دو
علاج ایک ہے تدبیر دوسرا تقدیر
معاش کا جو تفکر ہے چھوڑ دو اس کو نہ
معاش چیز ہی کیا ہے کہ ہو قلیل و کثیر
جو دیکھو کھود کے شاہ و گدا کی قبروں کو
سوائے خاک نہ دیکھے گی خاک چشمِ بصیر

غرض تفکرِ دنیا و فکرِ مال و منال
بغیر فکر کے کر دو حوالۂ تقدیر

یہی معاد سو یہ چیز چارہ دانی ہے
بجا ہے اس میں جو ہو صرف ہمتِ تدبیر

یہاں ہے کام جو تدبیر کا ہے کام کہیں
یہاں ہے چارۂ تدبیر نسخۂ اکسیر

منشی ونائک پرشاد طالب

سرورِ قناعت

اگر شاہ ملکِ ارم کا مکیں ہے
بھرے گھر میں گنجش سے خالی نہیں ہے
ہماری طرح وہ بھی اندوہگیں ہے
اسے فکرِ دنیا ہمیں فکرِ دیں ہے
وہ اپنے الم میں ہم اپنے الم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

بظاہر سرِ شاہ پر تاج زر ہے
مگر باطناً روز و شب خوف سر ہے
وہاں قلب مجروح، زخمی جگر ہے
یہاں تیغ کا ڈر نہ فکرِ سپر ہے
ہم آرام میں شاہ رنج و ستم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں

وہاں خوانِ نعمت مگر اشتہا کم
یہاں اشتہا پر سوالِ غذا کم
نہیں ہم کو اصلا خیالِ سدا کم
قناعت ہمارا خزانہ ہے کیا کم
ہم آسودہ دل شاہ حرص و نعم میں

یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
وہاں چاپلوسی - تملق - خوشامد
خوشامد برآمد ہے بنتا سرآمد
دورنگی دل دوستاں کی شدآمد
وفا کی جدا مد - جفا کی جدا مد
نہ خوش مدح میں ہم نہ مغموم ذم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
اگر شاہ کے ہاتھ میں جام جم ہے
یہاں ایک اپنا جو ہے کس سے کم ہے
اگر شاہ پل جائے ناز و نعم ہے
دل اپنا غنی ہے غنیمت یہ دم ہے
جو ہم میں نہیں وہ شاہ والا حشم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں
وہ بد خواب ہیں نرم شب کھو رہے ہیں
مگر پاؤں پھیلائے ہم سو رہے ہیں
وہاں دیدہ شاہ خوں رو رہے ہیں
یہاں اپنے آنسو گہر ہو رہے ہیں
ہم آزاد غم سے وہ پابند غم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
کوئی شاہ بادل بلادے تو جانیں
کوئی برق و باراں گرادے تو جانیں
کوئی حرف قسمت بڑھادے تو جانیں
مقدر کا لکھا مٹادے تو جانیں

نہ ہم میں یہ قدرت نہ اس کی ہمت میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں
وہاں جو فروش اور قدم نما ہیں
جو اعیان دولت ہیں زرآشنا ہیں
یہاں جتنے دم ساز ہیں بے ریا ہیں
نہ اہل غرض ہیں نہ اہل دغا ہیں
ہم اہل کرم ہیں۔ وہ اہل ستم ہیں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
وہاں غلبہ حرص۔ کشور کشائی
یہاں ملک تسلیم کی بادشاہی
وہاں فرش سندس بساط غنائی
یہاں بوریا مسند بے ریائی
ہم آزاد وہ فکر دام و درم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
وہاں جاہ وہاں رشک جاہ و حشم ہے
حضوری میں ہے مدح غیبت میں ذم ہے
یہاں ایک ساں حالت بیش و کم ہے
نہ آنے کی شادی نہ جانے کا غم ہے
کھلے بند ہم شاہ قید خدم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
وفور دول میں مسرت نہیں ہے
وہ مسرور ہے جو قناعت گزیں ہے
جسے فرش سنجاب سطح زمین ہے

اسی کا دل پاک عرش بریں ہے
ہم اور شاہ یکساں ہوئے جب شکم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں
یہاں نیت نیک تاج ہما ہے
یہاں عرش دل سلطنت الٰہی ہے
یہاں قلب فارغ مسرت فزا ہے
جگر دولت عافیت سے بھرا ہے
ہم آلام داخل سمجھتے ہیں سم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
ہمیں گنج عرفان و ادراک بس ہے
کہ اللہ بس اور باقی ہوس ہے
ہوا و ہوس سے عذاب نفس ہے
نہ ذوق جہاں ہے نہ شوق قفس ہے
ہمارے قدم ہیں تلاش قلم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
ثمر ہم شجر ہیں۔ صدف میں گہر ہیں
چمن میں اگر ہیں۔ تو مثل ثمر ہیں
اگر آہ و نالے میں ہیں تو اثر ہیں
نہاں نیشکر میں مثال شکر ہیں
کسی حال میں ہم نہیں رنج و غم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
وہی نزع ہے اللہ ہی جانتی ہے
ولادت وہی ہے وہی مردنی ہے

جو ہم پہ گزری جان شہ پہ بھی ہے
فقط شاہ میں کبریائی رہی ہے
ہم آہ و فغاں میں وہ طبل و علم میں
یہی فرق ہے شاہ میں اور ہم میں
مگر کوئی مخلوق ہو یا کہ غالب
سیہ بخت یا کامیاب صاحب
جدا ہو گیا روح سے جبکہ قالب
برابر ہوئے دونوں مطلوب و طالب
بآخر گئے دونوں یکساں عدم میں
رہا فرق کیا شاہ میں اور ہم میں

آنی جانی

عدم سے بشر آئے گا ایک دن
زمانہ کہے گا اسے نیک دن
لڑکپن کے دن ہوں گے شاہی کے دن
محبت کے دن بے گناہی کے دن
خوشی ان دنوں تو برسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی
پھر آئے گا مدہوش کرتے شباب
رہے گا خیال شراب و کباب
کبھی جوشش مستی کبھی نوشش خواب
نہ فکر ثواب و نہ خوف عذاب

گھٹا دل پہ پندار کی چھائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

سپاہی جواں مرد کہلائے گا
لڑائی میں زخم گہراں پائے گا
غش آئے گا بیہوش ہو جائے گا
کراہے گا۔ تڑپے گا۔ چلائے گا
قضا بوند پانی کو ترسائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

زمانہ کرے گا۔ جواں کو ادھیڑ
توانائی اسکا ہو گا پژمردہ پیڑ
لگائے گا اسپ جوانی کو ایڑ
نقاہت کرے گی توانوں سے چھیڑ
طبیعت اس آفت سے گھبرائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

بڑھاپے کا ہو گا بڑا انقلاب
نہ ہو گی دلیری نہ ہو گا شباب
ضعیفی کرے گی کل اعضا خراب
یہاں تک کہ جینا بھی ہو گا عذاب
اجل چیل سی سر پہ منڈلائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

مرض موت کا جب اٹھائے گا سر
تدارک سے ہاریں گے کل چارہ گر
بگڑ جائے گا کھیل یہ سر بسر

بن آئے گی بیمار کی جان پر
بڑی سختیاں نزع دکھلائے گی
مگر یہ گھڑی بھی گزر جائے گی

چودھری جگت موہن لال رواں

لاوارث بچہ

آہ اے نووارد بزم تباہ روزگار
آہ اے تازہ اسیر گردش لیل و نہار
آہ اے دیباچہ شرح کتاب درد دل
آہ اے عنوان باب اضطراب جاگسل

آہ اے تعبیر خواب مست ایام شباب
آہ اے تفسیر کیف بادۂ جام شباب
آہ اے زنجیر پائے نازک وہم و گمان
آہ اے تصویر احساسات و جذبات نہاں

سچ بتا بچے نہ لاوارث ترا والی ہے کون
پھول ہے تو کس چمن کا اور ترا مالی ہے کون
زینت آغوش ہے تو جس کا وہ مادر ہے کون
نور ہے جس گھر کا تو بچے بتا وہ گھر ہے کون

اختصار طول آزار نہانی سچ بتا
اے خمار بادۂ جوش جوانی سچ بتا
کیا اڑا لائی کسی گلزار سے تجھ کو ہوا
پھول ہوتے ہیں جہاں ایسے ہی پیدا خوشنما

یا عناصر میں ہوئی ترتیب پیدا اس قدر
خود مرکب ہو گئے اور بن گئے شکلِ بشر
تو کوئی اسرارِ پنہانی کا دفتر تو نہیں
تو کسی میخانۂ معنی کا ساغر تو نہیں

آہ یہ تیری ادائیں تجھ پہ فدا رہنا
دل کش لطفِ تبسم آہ یہ رونا ترا
یوں نہ کرتی ورنہ ماں اپنا نثارِ آرزو
یوں بناتی خود نہ ماں اپنا مزارِ آرزو
حسن کا برباد ہو جانا ہمیں بھاتا نہیں
میرے مولا یہ سمجھ میں راز کچھ آتا نہیں

شاعری

مرحبا، مشاطۂ زلفِ مضامینِ بلند
رہبرِ راہِ خدا ہادیِ جانِ دردمند
رازدارِ ضبطِ دل بے پردہ دارِ رازِ نفس
کاشفِ اسرارِ باطن عکسِ سوز و سازِ نفس

اے بہارِ بے خزاں اے آفتابِ لازوال
کر نہیں سکتا تجھے جورِ زمانہ پائمال
اے نشانِ زندگاں اے رنگِ خونابِ جگر
نورِ قلبِ باصفا تعبیرِ جذبِ پُر اثر

جس پہ سو جاں سے ہو دل صدقے ترا وہ نانہ ہے
جس نے عالم کو کیا بسمل ترا انداز ہے
اے انیس گوشۂ عزلت گزینان الم
اے شریک حال زار صاحبان درد و غم
اے زبان غیب اے نیچر کی سچی ترجمان
نیرّ افلاک شہرت، یادگار جاوداں
کب تیری معراج کے ہمسر ہے معراج شہی
تیرے قدموں پر نچھاور سینکڑوں تاج شہی

بستر بیمار

یوں تو ہو جاتا ہے مایوسی میں ہر دل بے قرار
ہے مریض غم کا لیکن سخت ابتر حال زار
ضعف سے بیکار سب اعضا سراسر ہو گئے
لاغری سے ہے تن محزوں کی رگ رگ آشکار
جسم میں اب فرط غم سے خون اتنا بھی نہیں
جس کو کر دے قلب مضطر نذر چشم اشکبار
منظر عالم سے ساری خوبیاں جاتی رہیں
اب کہاں لطف ہوائے باغ و سیر کوہسار
بار ہے آنکھوں کی پلکوں کا اٹھانا ضعف سے
ایک دفتر ہے نگاہ لاغر بیمار زار
اب کہاں ہیں آرزوئے دل کی وہ بے باکیاں

اب کہاں ہے شوق کا وہ جذبۂ بے اختیار
جسمِ لاغر اور تنِ مخزوں کا جب یہ حال ہو
کیا بیاں ہو کیا رقم ہو اس کے دل کا اضطرار
ایک محشر ہے بپا اس کے تخیل میں مگر
کشمکش میں ہے مریضِ مضطرب کی جانِ زار
اک طرف مستغنیٔ عالم ہے جانِ دردمند
اک طرف دامن کشاں بچوں کا اخلاص اور پیار
اک طرف مایوسیٔ دل مقتضائے ترکِ حرص
اک طرف ہے خوفِ بربادیٔ جملہ کاروبار
جانِ بیمارِ حزیں کو چین آئے کس طرح
مبتلا ہے سخت حیرانی میں عقلِ سادہ کار
رفتہ رفتہ پھر تخیل اس سے جاتا ہے گذر
دل پہ چھا جاتا ہے یادِ عمرِ رفتہ کا غبار
پھرتا ہے نظروں میں اس کی پھر لڑکپن کا سماں
پھرتی ہے آنکھوں میں اسکی پھر جوانی کی بہار
دیکھتا ہے ہر طرف حسرت بھرے انداز سے
یاد آتے ہیں اسے سب ہم نشین و غمگسار
یاد آتے ہیں اسے پھر اپنے اعمالِ قبیح
دل ہی دل میں اپنے ہوتا ہے نہایت شرمسار
غور کرتا ہے کرے ان کی تلافی کچھ مگر
یہ خیال آتا ہے آخر ہے حیات مستعار
دل ہی دل میں ہوتا ہے اپنے پشیمان وہ مریض
بازگشتِ عمر کی کرتا ہے خواہش بار بار

پھر اسی حالت میں ہو جاتا ہے غالب ضعف قلب
اور ہو جاتا ہے آنکھوں میں جہاں تیرہ و تار

سرودِ عشقِ ربانی

جب صبح گلابی ہونٹوں سے پیغام نور سناتی ہے
جب شب کی سیاہی دن کی ضیا سے آ کے گلے مل جاتی ہے
جب مہر درخشاں کی کرنوں سے دنیا ہوتی ہے نورانی
جب جانیں چلتی پھرتی ہیں مٹ جاتی ہے سب ویرانی
جب دھوپ کی کثرت تابش سے دنیا کی زمیں گرماتی ہے
مہر خورشید درخشاں سے جس وقت ہوا تھراتی ہے
جب دنیا سب تھک جاتی ہے جب نور کا دن ڈھلتا ہے
جب شام جہاں کو ڈھکتی ہے جب شب کا اندھیرا آتا ہے
جب رات کا دلکش سناٹا ، دنیا پہ ہوتا ہے طاری
جب سب اعضا سو جاتے ہیں جب ہوتی روح کو بیداری
جب اپنی حالت جاننے والے اپنے سے ڈرتے ہیں
جب اپنے گناہ آتے ہیں نظر جب پچھلے داغ ابھرتے ہیں
کچھ تم کو اس کی خبر بھی ہے ہم یاد تمہاری کرتے ہیں

جب فکروں کی تاریکی سے دل جینے سے گھبراتا ہے
جب رنج کے بادل آتے ہیں جب درد سے جی اکتاتا ہے
جب کوشش ضائع جاتی ہے جب اپنی قسمت بگڑتی ہے
جب وصل کی راحت مٹتی ہے جب ہجر کی بجلی گرتی ہے
جب عزلت کی تکلیفوں میں جانکاہ صدائیں آتی ہیں
جب خلوت کی بشاشی سے دل کی کلیاں کھل جاتی ہیں
جب اپنے پرائے صدموں سے ہوتا ہے دل پہ غم طاری
جب درد الم سے ہوتی ہے خود زیست ہمیں اپنی بھاری
جب ہوتا ہے مئے الفت سے لبریز یہ دل کا پیمانہ
جب نامعلوم طریقوں سے بنتا ہے یگانہ بیگانہ
جب بنتے کام بگڑتے ہیں جب بگڑے کام سنورتے ہیں
جب روح کو راحت ہوتی ہے جب جی پہ رنج گزرتے ہیں
کچھ تم کو اس کی خبر بھی ہے ہم یاد تمہاری کرتے ہیں
جب بادِ نسیم کے جھونکوں سے گلشن میں شجر لہراتے ہیں
جب پتی پتی ہنستی ہے جب غنچے تان لگاتے ہیں
جب مستی میں مرغانِ چمن ہوتے ہیں گرم غزل خوانی
جب شبنم کے دانوں پہ صبا کرتی ہے سبحہ گردانی
جب میکدہ گلشن میں رواں پھولوں کے ساغر ہوتے ہیں
جب مست مئے پندار خودی چلتے سے باہر ہوتے ہیں
جب ہر سو سے گلشن پہ طرب کا عالم ہوتا ہے
جب اشکِ ندامت موتی کا ہر قطرۂ شبنم ہوتا ہے
جب شاخیں سجدے کرتی ہیں جب فصلِ بہاری آتی ہے
جب بادِ خزاں کی گرمی سے سبزی و تری جل جاتی ہے

جب بادل جوشِ مسرت سے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہیں
جب کالی گھٹائیں آتی ہیں دِل کے جذبات ابھرتے ہیں
کچھ تم کو اس کی خبر بھی ہے۔ ہم یاد تمہاری کرتے ہیں

چوہدری خوشی محمد ناظر

جوگی

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعۂ نور ہوا
سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا
مستانہ ہوائے گلشن تھی، جانانہ ادائے گلبن تھی
ہر وادی وادیٔ ایمن تھی۔ ہر کوہ پہ جلوۂ طور ہوا
جب بادِ صبا مضراب بنی ہر شاخِ نہال رباب بنی
شمشاد و چنار ستار بنے ہر سرو و سمن طنبور ہوا
سب طائر مل کر گانے لگے عرفان کی "تانیں" اڑانے لگے
اشجار بھی وجد میں آنے لگے۔ دل کش وہ سماع طیور ہوا
سبزے نے بساط بچھائی تھی۔ اور بزم سرور سجائی تھی
بن میں، گلشن میں، آنگن میں فرش سنجاب و سمور ہوا
تھا دل کش منظر دشت و جبل اور چال صبا کی مستانہ
اس حال میں ایک پہاڑی پر جا نکلا ناظر دیوانہ

چیلوں نے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے کہرے نے "قنات" لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے چاندی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی

یاں قلہ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ، جٹوں میں جوگی کے اور رنگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر۔ اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر۔ جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ اور مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی متانہ۔ آنکھوں میں مستی چھائی تھی
جوگی سے آنکھیں چار ہوئیں۔ اور جھک کر میں نے سلام کیا
تب آنکھ اٹھا کر ناظر سے یوں بن باسی نے کلام کیا

کیوں بابا ناحق جوگی کو تم کس لئے آ کے ستاتے ہو
ہم پنکھ پکھیرو بن باسی تم جال میں آن پھنساتے ہو
کوئی جھگڑا دال چپاتی کا کوئی دعوے گھوڑے ہاتھی کا
کوئی شکوہ سنگی ساتھی کا۔ تم ہم کو آن سناتے ہو
ہم حرص و ہوا کو چھوڑ چکے اس نگری سے منہ موڑ چکے
ہم جو زنجیریں توڑ چکے۔ تم لا کے وہی پہناتے ہو
تم پوجا کرتے ہو دھن کی۔ ہم سیوا کرتے ہیں ساجن کی
ہم جوت جگاتے ہیں من کی۔ تم اس کو آ کے بجھاتے ہو
سنسار سے یاں مکھ پھیرا ہے۔ من میں ساجن کا ڈیرا ہے
یاں آنکھ لگی ہے پیتم سے۔ تم کس سے آنکھ ملاتے ہو

اس مست قلندر جوگی نے۔ جب ناظر سے یہ عتاب کیا
کچھ دیر تو ہم خاموش رہے۔ پھر جوگی سے یہ خطاب کیا

ہیں ہم پردیسی سیلانی۔ مت ناحق طیش میں آ جوگی
ہم آئے تھے تیرے درشن کو۔ چتون پر میل نہ لا جوگی
آبادی سے منھ پھیرا کیوں؟ پربت میں کیا ہے ڈیرا کیوں
ہر محفل میں ہر منزل میں ہر دل میں ہے نورِ خدا جوگی
کیا مسجد میں کیا مندر میں۔ سب جلوہ ہے وجہ اللہ کا
پربت میں نگر میں۔ ساگر میں۔ ہر ترا ہے ہر جا جوگی
جی شہر میں خوب بہلتا ہے۔ واں حسن پہ عشق مچلتا ہے
واں پریم کا ساغر چلتا ہے۔ چل دل کی پیاس بجھا جوگی
واں دل کا غنچہ کھلتا ہے۔ ہر رنگ میں موہن ملتا ہے
چل شہر میں سنکھ بجا جوگی۔ بازار میں دھونی رما جوگی

ان چکنی چپڑی باتوں سے۔ مت جوگی کو پھسلا بابا
جو آگ بجھائی جتنوں سے۔ پھر اس پہ نہ تیل گرا بابا
ہے شہروں میں غل شور بہت۔ اور حرص وہوا کا زور بہت
بستے ہیں نگر میں چور بہت۔ سادھو کی ہے بن میں جا بابا
ہے شہر میں شورش نفسانی۔ جنگل میں ہے جلوہ روحانی
ہے نگری ڈگری کثرت کی۔ بن وحدت کا دریا بابا
ہم جنگل کے پھل کھاتے ہیں۔ چشموں سے پیاس بجھاتے ہیں
راجہ کے نہ دوارے جاتے ہیں۔ پرجا کی نہ ہے پروا بابا
سر پہ آکاش کا منڈل ہے۔ دھرتی پہ سہانی مخمل ہے
دن کو سورج کی محفل ہے۔ شب کو تاروں کی سبھا بابا

جو جھوم کے بادل گھن آتے ہیں۔ مستی کا رنگ جماتے ہیں
چشمے طنبور بجاتے ہیں۔ گاتی ہے ملار ہوا بابا
یاں پنچھی مل کر گاتے ہیں۔ پریتم کے سندیس سناتے ہیں
یاں روپ انوپ دکھاتے ہیں پھل پھول اور برگ گیا بابا
ہے پیٹ کا ہر دم دھیان تمہیں۔ اور یاد نہیں بھگوان تمہیں
سِل پتھر، اینٹ، مکان تمہیں دیتے ہیں سکھ سے چھُڑا بابا
تن من کو دھن میں لگاتے ہو۔ پریتم کو دل سے بھلاتے ہو
ماٹی میں لعل گنواتے ہو۔ تم بندۂ حرص و ہوا بابا
دھن دولت آنی جانی ہے۔ یہ دُنیا رام کہانی ہے
یہ عالم عالمِ فانی ہے۔ باقی ہے ذاتِ خدا بابا

منشی شبیر حسین خان جوشؔ

چاندنی رات

رات چھٹکاتی ہے تارے صبح برساتی ہے نور
موسمِ باراں بچھا دیتا ہے سبزہ دور دور
چاندنی شب بھر دکھاتی ہے ضیائے روئے حور
ذرہ ذرہ صبح کو کہتا ہے میں ہوں برقِ طور
رات زلفیں کھول دیتی ہے سلانے کے لئے
تاج پہنے صبح آتی ہے جگانے کے لئے

لہریں ہنس ہنس کر عجب نغمے سناتی ہیں مجھے
ڈالیاں پھولوں کی جھک جھک کر بلاتی ہیں مجھے
شاخیں اپنے سائے میں پہروں بٹھاتی ہیں مجھے
ندیاں اپنے کناروں پر سلاتی ہیں مجھے
کوئی مجھ کو رنج ان احباب میں زحمت نہیں
اور اس خدمت کی قیمت بھی کوئی لیتا نہیں

دیکھتے ہیں مجھ کو پہروں خندہ پیشانی سے پھول
کس قدر مانوس ہیں آئینِ مہمانی سے پھول
ٹوٹ کر دامن میں آجاتے ہیں آسانی سے پھول
کرتے ہیں مسرور مجھ کو اپنی قربانی سے پھول

پھول سے کے مانند انسانو! تمہارا دِل نہیں
میری خاطر جان بھی دینا انہیں مشکل نہیں
گونجتی ہے کوہ و صحرا میں پپیہے کی صدا
اودی اودی آسمانوں پر جب آتی ہے گھٹا
روح کو بیدار کرتی ہے بیاباں کی ہوا
دور ہوتی ہے خودی۔ سینے میں آتا ہے خُدا
کام رہتا ہے نہ دولت سے نہ خالی جاہ سے
لو لگا کر بیٹھ جاتا ہوں فقط اللہ سے
صاف دل ہو جانے مجھے تعلیم یہ دیتی ہے نہر
ندیوں کے پیچ و خم سے خون میں آتی ہے لہر
دشت ہنستے ہیں کہ آبادی پہ کیوں نازاں ہیں شہر
آبِ حیواں جس کو سمجھے ہیں وہ ہے اک موجِ زہر
سوز دیتا ہے بھری برسات کا دریا مجھے
عقل دیتا ہے گھنے جنگل کا سناٹا مجھے
نقرئی چادر بچھاتا ہے مہِ سیمیں بدن
چومتی ہے آ کے پیشانی مری زرّیں کرن
دیکھ کر شاداب ہوتا ہے مجھے صحنِ چمن
کس قدر خوش ہوں کہ جنگل ہے مرا پیارا وطن

روز صحرا کی طرف جانا مرا دستور ہے
بستیوں میں ہوں مگر میری قرابت دور ہے

منشی تلوک چند محروم

یہ کس کے جلوے ہیں سارے

فلک پہ مہر و مہ پر ضیا کے جلوے ہیں
زمیں پہ لالہ و گل کی ادا کے جلوے ہیں
بتانِ مہر وش و مہ لقا کے جلوے ہیں
قسم خدا کی! غضب کے بلا کے جلوے ہیں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

بتائے مہر منوّر ہیں نور کس کا ہے
میانِ انجمِ تاباں ظہور کس کا ہے
یہ تجھ میں اے دلِ شاعر سرور کس کا ہے
دماغِ فلسفی! تجھ میں شعور کس کا ہے
یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

نجومِ شب میں بلند اختری اسی کی ہے
جو چاندنی میں ہے جاں پروری اسی کی ہے
ضیا ہر ایک کرہ میں بھری اسی کی ہے
اسی کا نور ہے جلوہ گری اسی کی ہے
یہ سارے جلوے ہیں کس کے خدا کے جلوے ہیں

وہی ہے رعد میں، بجلی میں اور بادل میں
اسی کے دم سے ہے منگل ہر ایک جنگل میں

اُسی کی بو ہے گلوں میں اُسی کا رس پھلوں میں
اسی کی نکہت ہے صبا کے آنچل میں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں
ہر ایک برگِ چمن اس کا ہے پتا دیتا
جو گل سے پوچھو، تو وہ بھی ہے مسکرا دیتا
ہر ایک سرو جو اُنگلی ہے وہ اُٹھا دیتا
نشان اسی کا ہمیں ہے یہ برملا دیتا
یہ سارے جلوے ہیں کس کے! خدا کے جلوے ہیں
اُسی کا داغ ہے لالے کے دل میں دیکھو تو
وہی ہے دیدۂ نرگس کے تل میں دیکھو تو
وہی تو پھولوں کی ہے آب و گل میں دیکھو تو
لکھا ہے ہر ورق متصل میں دیکھو تو
یہ سارے جلوے کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں
چمن میں دشت میں وادی میں کوہ و صحرا میں
گہر میں وہ ہیں، شبنم میں ابر و دریا میں
شرر میں شعلے میں، آتش میں، برق بینا میں
شمیم گل میں نسیم مسرت افزا میں
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں
اُسی کے جلوے ہیں سارے جو چشم بینا ہو
تمام ذرے ہیں تارے جو چشم بینا ہو
وہ پردہ پردہ ہے پیارے جو چشم بینا ہو
بشر زباں سے پکارے جو چشم بینا ہو
یہ سارے جلوے ہیں کس کے؟ خدا کے جلوے ہیں

خطا کس کی ہے

غنچۂ گل میں ذرا دیکھ ادا کس کی ہے
سبزۂ تر میں مہک کس کی؟ فضا کس کی ہے
سرو ریحاں میں بھلا نشو و نما کس کی ہے
گہری سبزی جو ہے پتوں میں بتا کس کی ہے
جلوہ فرمائی یہ سب اس کے سوا کس کی ہے
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل، تو خطا کس کی ہے

گل شاداب کا شیدا ہے بہت تو اے دل
ہنسنے والوں کی تجھے بھائی ہے خو اے دل
جانفزا تیرے لئے رنگ ہے اور بو اے دل
روز و شب جوش بہاراں ہے ہر اک سو اے دل
کہیں شبو فرخنداں، کہیں شبو اے دل
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے

ہے نظر پرور عشاق جلال جاناں
جاں لیتا نہیں، دیتا ہے ملال جاناں
سرسری سا تجھے رہتا ہے خیال جاناں
ورنہ مشکل نہیں اتنا تو وصال جاناں
ذرّے ذرّے میں چمکتا ہے جمال جاناں
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے

چہچہاتے ہیں پرندے چمنستانوں میں
مائل رقص ہیں طاؤس خیابانوں میں

وحش ہیں جو کڑیاں بھرتے ہیں بیابانوں میں
وہ بھی دلشاد ہیں جو رہتے ہیں ویرانوں میں
تجھ کو اللہ نے پیدا کیا انسانوں میں
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل، تو خطا کس کی ہے

آبشاروں کا ترنم ترے بہلانے کو
لالہ زاروں کا تبسم ترے بہلانے کو
دن کو ہنگامۂ مردم ترے بہلانے کو
رات کو محفل انجم ترے بہلانے کو
مجھ کو دی تابِ تکلم ترے بہلانے کو
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے

چاندنی تیرے لئے اس نے بہائی کیسی
خاک کے فرش پہ چادر یہ بچھائی کیسی
چرخ پر ماہ کی ہے جلوہ نمائی کیسی
رُخِ پُر نور میں اس کے ہے صفائی کیسی
دیکھ صانع نے یہ صنعت ہے دکھائی کیسی
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے

اور ایسے ہی ہزاروں ہیں نظارے دل کش
جاں فزا ایک سے اک بڑھتے ہیں سارے دل کش
آتشِ حسن کے آ دیکھ شرارے دل کش
ہیں سر ارض و سما پھول ستارے دل کش
کتنے دلچسپ ہیں، کیسے ہیں یہ پیارے دل کش
اب بھی شاداں نہ ہوا اے دل تو خطا کس کی ہے

روز محروم یہی درس پڑھاتا ہے تجھے

سیکھنے کی ہیں جو باتیں وہ سکھاتا ہے تجھے
لے کے ہر روز جو ویرانے میں جاتا ہے تجھے
مرحلے راہ حقیقت کے دکھاتا ہے تجھے
بات جو غیب سے سنتا ہے، سناتا ہے تجھے
اب بھی شاداں نہ ہوا ے دل! تو خطا کس کی ہے

شہنشاہ بابر اور گورو نانک کا مکالمہ

بابر

ہماری بزم عشرت میں جو لے آیا خدا بابا
تو بسم اللہ! جام بادہ احمر چڑھا بابا
جہاں میں آب رنز سے کونسا ہو پاک تر پانی
کہ دھل جاتا ہے جس سے دفتر باد نما بابا
نہ میخانہ کو دیکھا چاہیے چشم حقارت سے
کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا بابا
نہ یوں ہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
پہونچتی ہے نظر ان کی سر فوق السما بابا
صدائے حق کی سنتے ہیں سدا وہ شیشۂ مے سے
اسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا بابا
صراحی کھولتی ہے رازِ دل جب بانگ قلقل سے
فلک سے ہیں پکار اٹھتے ملائک مرحبا بابا
نہ ہو گر بانگ مستوں کی تو دنیا بزم ماتم ہے.

ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دار الفنا!
غنیمت جان کر صحبت کو اک دو جام پیتا جا
مبارک محفل رنداں، ذرا دُرد آشام پیتا جا

گورو نانک دیو

مبارک ہو مئے احمر تجھے، صاحبقراں تیری
رہے بس سُرخرو تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
دلِ فرخندہ تیرا، واقفِ رمزِ حقیقت ہے
اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
مگر جب کیفیت دل میں ہو کیفِ مے کی حاجت کیا
غرض محفل سے کیا؟ خلوت ہو جب شبستاں تیری
مئے انگور پی کر کوئی متوالا ہوا تو کیا
رہا بے کیفِ دل، مشغولِ مے و مینا ہوا تو کیا
وہ مے اپنی ہے جس سے بن پیے مخمور رہتے ہیں
خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں چور رہتے ہیں
وہ میکش ہم، کہ مہر و ماہ اپنے جام و ساغر ہیں
جو صہبائے عروق سے سدا بھرپور رہتے ہیں
ہمارا دورِ مے ہر ہر نفس کے ساتھ چلتا ہے
اسی سے ہر نفس، ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائشِ دنیا سے آتی ہے
شرابِ ظاہری سے اہلِ باطن دور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنھوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں کے

کہاں وہ طالبِ افسردۂ انگور رہتے ہیں
مناسب ہے یہی، ترکِ مئے انگور کرشاہا
ہمارے جام سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا

مہاتما بُدھ

ایوانِ شاہی میں آخری رات

اے زمینِ خاک بر سر! یوں نہ ہو اندوہ گیں
میں شریکِ غم ہوں تیرا ہوں تری خاطر حزیں
تیری خاطر اور ترے بچوں کی خاطر اے زمیں
مضطرب ہوں میں مرے دل کو قرار اصلا نہیں
نیم بسمل میں بھی ہوں، تو ہے اگر نخچیرِ غم
لے لیا اپنے جگر پر میں نے تیرا تیرِ غم
ماتمی صورت ہے تیری اے سیہ پوشِ آسماں
تو گھٹا ہے سوزِ غم کی یا ہے آہوں کا دھُواں
اشکِ خوں دامن پہ ٹپکا ہیں شفق کی سرخیاں
داغ تاباں ہیں مہ و خورشید سینے میں عیاں
تو ہے محزوں اہلِ عالم کی مصائب دیکھ کر
شامِ غم، صبحِ قیامت ہیں مرے شام و سحر
اے ستارو! تم سراپا ہو گئے چشمِ انتظار
دیکھتے ہو میری جانب صورتِ اُمیدوار
لو اب آیا میں اب آیا، تم پہ ہونے کو نثار

کب سے ہوں آوارگی آرزو میں بے قرار
آہ میں جکڑا ہوا سونے کی زنجیروں میں ہوں
ہر گھڑی آزاد ہو جانے کی تدبیروں میں ہوں
عشرت ایام آغاز جوانی! الوداع
الوداع اے ذوق وشوق عیش فانی! الوداع
الوداع اے تاج وتخت مرزبانی! الوداع
الفراق اے خرمی، اے شادمانی! الوداع
الوداع اے حسرت لیل و نہار آرزو
اے دل غم نہ بن جا تو مزار آرزو
آہ! پر تیری جدائی آہ! او آرام جاں
اُف تڑپتا ہے، مچلتا ہے دل ناشادماں
تجھ کو سوتا چھوڑ جاؤں سنگدل ایسا کہاں
آئینہ رو! تیری فرقت مجھ پہ ہے کوہ گراں
عزم راسخ ہے مگر منہ تجھ سے موڑوں کس طرح
رشتۂ عہد وفا کو آہ توڑوں کس طرح
تیری فرقت اور پھر اس گوہر شہوار کی
اپنی تابش سے ہے جو تزئین تاج خسروی
جس کو نیسان محبت نے عطا کی زندگی
آب و تاب زیست بڑھ جائے گی جس سے واقعی
شمع دل افروز ہوگا خانۂ جاں کے لئے
مایۂ نور بصارت چشم حیراں کے لئے
اے فریب الفت فانی نہ بھٹکا تو مجھے

آہ اے جھوٹی محبّت اڑ نہ اب دھوکا مجھے
دیتی ہے روئے گل، پر اس سے مطلب کیا مجھے
گھر نظر آتا رہا ہیں دہر کا نٹوں کا مجھے
یہ کشاکش ہائے بیجا ہیں سلاسل کی طرح
توڑ دوں ان کو طلسم نقش باطل کی طرح

رخصت اے ماں باپ! بھیک رخصت اے اہلِ دیار
دیکھنا میری جدائی پر نہ ہونا اشک بار
کی تمہارے ہی لیے میں نے یہ فرقت اختیار
دیکھئے کیا کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار
المدد! اے جستجوئے صادق راہِ نجات
کونسی خلوت میں ہے اے شمع رازِ کائنات

نور جہاں کا مزار

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورِ جہاں ہے
مدّت ہوئی، وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے
جلووں سے جہاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز! کہاں ہیں وہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے؟ کس عرش کے تارے

کیا بن گئے اب کہ یک شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
پا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دل گیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لئے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سبز فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالم بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام، یہیں شب بسری ہے
ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہو مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

تعویذ لحد ہے زبر و زیر یہ اندھیر
دورِ زمانہ کے الٹ پھیر، یہ اندھیر
آنگن میں پڑے گرد کے ہیں ڈھیر، یہ اندھیر
اے گردشِ ایام یہ اندھیر، یہ اندھیر
ماہ فلکِ حسن کو یہ برج ملا ہے
اے چرخ ترے حسنِ نوازش کا گلا ہے

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار سے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اٹھتے ہیں شرر آہ شرربار سے کیا کیا
یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لئے ہو کا نظارا

چو بلتے جو گھبراتے تھے گرمی سے زاکثر
آرام کیا کرتے ہیں اس روضے میں آکر
اب شام کو باقی ہے نہ لذت ہے نہ شجر
اُلّو اڑ کے لگاتے ہیں در و بام پہ چکر
معمور رہے یوں محفل جانانہ کسی کی
آباد رہے گور غریبانہ کسی کی

آراستہ جن کے لئے گلزار و چمن تھے
جو نازکی میں داغ دہ برگ سمن تھے
جو گل رُخ و گل پیرہن و غنچہ دہن تھے
شاداب گل تر سے کہیں جن کے بدن تھے
پژمردہ وہ گل دب کے ہوئے خاک کے نیچے
خوابیدہ ہیں خار و خس و خاشاک کے نیچے

رہتے تھے لئے دیدہ و دل جن کے نظارے
جو پیکر ہستی کے لئے روح رواں تھے
محبوب دل خلق تھے، جان بخش جہاں تھے
تھے یوسف ثانی کہ مسیحائے زماں تھے
جو کچھ تھے، کبھی تھے مگر اب کچھ بھی نہیں ہیں
ٹوٹے ہوئے پنجر سے پڑے زیر زمیں ہیں

دُنیا کا یہ انجام ہی دیکھ لے اے دل ناداں
ہاں بھول نہ جائے تجھے یہ مدفن ویراں
باقی ہیں نہ وہ باغ، نہ وہ قصر نہ ایوان
آرام کے اسباب نہ عیش کے سامان

ٹوٹا ہوا اک ساحلِ راوی پہ مکاں ہے
دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے

مہاتما گاندھی

حامیٔ امن و اماں تھا پیکرِ ایثار تھا
ہند کی چشمِ عظمت کا علم بردار تھا
گو فقیرِ بے نوا تھا عالمِ اسباب میں
سینہ تانے روبروئے سطوتِ اغیار تھا
جھک گئی انگریز کی شوکت بھی اسکے سامنے
تھا اگر زیبہ کوئی پیکار سے بے آزار تھا
بہترین انسانِ دنیا کا تہ دل مانا گیا
مظہرِ شانِ آدمیت سرورِ ابرار تھا
عالمی گیتا کروڑوں میں نہیں اس سا کوئی
ترکِ دنیا پر بھی دنیا کا وہ خدمتگار تھا
حق پسند و حق شعار و حق شناس و حق گزار
عمر کے ہر مرحلے پر حق سے اس کو پیار تھا
بے نوائی قوم کی درماندگی میں اس کی
خود سپاری سے شناسائے رہِ دشوار تھا
منزلِ مقصود آزادی پہ پہنچایا اسے
طبقۂ مجبور کا وہ کاروان سالار تھا

کیوں نہ جاگے پھوٹی تری تقدیر اے ہندوستان
بجا تیرا راہ بر اک مردِ شب بیدار تھا
رہبروں کو روشنی ملتی تھی اس کی ذات سے
ہند میں گاندھی منارہ جلوۂ انوار تھا
وہ اہنسا کا پیمبر شانتی کا دیوتا
یا مسیح اس دور کا، گوتم کا یا اوتار تھا
مار کر اس کو کسی کے ہاتھ آخر کیا لگا
قوم کے ماتھے پہ کالا داغ ہنسا کا لگا

عبدالمجید خاں صاحب

کونج کی جدائی

(١)

اک سارسوں کا قافلہ　شوقِ وطن دل میں لئے
آزاد سب افکار سے　اٹکھیلیاں کرتا ہوا
واپس تھا گھر کو جا رہا　قسمت کا کرنا دیکھنا
کوئی شکاری آگیا　اس نے دیا گھوڑا چڑھا
اک گونج سی پیدا ہوئی　آواز تھی بندوق کی
گویا کہیں بجلی گری　سارس ہراساں ہو گئے
بچے شکاری سے مگر　دو پر ہی قسمت میں لکھے
سارس گئے پروانہ کر

(٢)

[illegible] نے ان کو کہا　اے سارسو یہ کیا ہوا؟
سب بھاگ گئے سب نے کہا　پھر ایک بدلی آفت مری"
دو [illegible] اسی کے سنگ بچھڑے　دیکھا جو ایسا ماجرا
سردار نے اس سمت کہا　اے جانِ من۔ آرامِ جاں
راحت کا دل نعمت کی جاں　کیا کر چلی بے خانماں
کچھ تو بیاں تو حال کر

(۳)

اک آہ کی اور یوں کہا بازو مرا زخمی ذرا
جانم خدا، قربان گئی قسمت کی آری چل گئی
لینا مجھے وہ ہو گری حالت مری ابتر ہو گئی
اچھا نہ میرا غم کرو مجھ کو خدا پر چھوڑ دو
بچوں کی ہاں لینا خبر

(۴)

اب آہ حارس نے کہا تجھ سے الگ جینا ہوں
کی عمر تو باہم بسر اب کیا اکیلا چھوڑ دوں
فرقت کی آتش میں جلوں صدمے جدائی کے سہوں
مجھ سے تو یہ ہوتا نہیں بے دل بھی بہت جیتا کہیں
تجھے سنبھالے گا خدا مجھ سے نہ یوں دامن چھڑا
بہر خدا حال ناں جا جاؤں کہاں تو ہی بتا
تجھ کو اکیلا چھوڑ کر

(۵)

تجھ کو بھی اپنے ساتھ لوں بولی نہ ہو گا یہ کبھی
ہونی جو تھی وہ ہو چکی تھرے گئے کب ملی
پھر مفت تم کیوں جان دو قربان جاؤں ہاں لو
تم کو مرے سر کی قسم آپس کی الفت کی قسم
تم جاؤ گھر کو لوٹ کر مجھ کو خدا پر چھوڑ دو
لازم ہے بچوں کی خبر

(۶)

اتنا کہا اور گر پڑی — بے پر کی جیسے تیتری
مرجھائی سی یا اک کلی — یا پھول کہو کوئی پری
راندی ہوئی دربار کی — پر نوچ کر چھینی گئی
یا جیسے شب کو چاندنی — چپکے زمیں پر آ پڑے
ہمت نہ اٹھنے کی رہے — آخر دنیا کی ہو رہے
بیٹھے ہی وہ سارس کی جاں — اک مشت پر یا استخواں
خاموش سب آہ و فغاں — اتری نہ جانے تھی کہاں
گو وہ تھا اک جوگی کا گھر

---

(۷)

جوگی وہ ہر چننے لگا — دیکھا جو کچھ گرتے ہوئے
پھر دل بڑھا آگے بڑھا — آئی نظر یہ نیم جاں
رویا کہ اُف شانِ خدا — چھوٹا ہے اس سے کارواں
یا گم گیا ہے آشیاں — لیکن ہے میری مہماں
سینے لگا کر یوں کہا — سب کو خدا کا آسرا
لیکن یہ رشتہ چاہ کا — انسان ہو یا جانور
رکھتا ہے جادو کا اثر

---

(۸)

کی لاکھ جوگی نے دوا — لیکن نہ ٹوٹا پر بنا
آخر سہارا صبر کا — اس کے سوا چارہ نہ تھا
ہے دل کو دل سے واسطہ — آپس میں الفت ہو گئی

جوگی کے گھر رہنے کی اڑنے سے گو مایوس تھی
لیکن تھی اک تسکیں ابھی شاید پھر آنا ہوتا ظلہ
موسم میں آئے لوٹ کر

---

(۹)

گو عیش تھا آرام تھا کھانے کو سب کچھ عام تھا
دنیا دکا بچہ ڈر نہ تھا پر کونج کے دل کی کلی
مرجھا گئی کمہلا گئی آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی
اس کے سدا جاری رہی ظاہر میں گو خاموش تھی
دل میں مگر کہتی رہی اے خالق ہر دو جہاں
اے الکسو کون و مکاں ہوگی بسر کیسے یہاں
تو تا حر سے ! مولا مرے یا پنکھ یا دل ہمتے
وہ دن مرے بھی پھر کے وہ شادیاں وہ مشغلے
پھر جاؤں گھر کو لوٹ کر

---

(۱۰)

ایسے ہی مدت ہو گئی رُت بھی بدلنے کو ہوئی
بیٹھی رہی، وہ جان کی کمبخت وہ جیتی رہی
تنہا اُڑی کیسا آس تھی جب بھی پہاڑی جانور
اس کو کہیں آتا نظر فوراً یہ کہتی چیخ کر
اتنے اونچے اُڑنے طائرو تم خوش بسو جیتے رہو
اسے جانے والے سارے جو نام خدا مجھ سے کہو
کچھ تو مرے گھر کی خبر

(۱۱)

اک روز پھر اک قافلہ دیکھا کہیں جاتا ہوا
بھاگ کے دی اس نے صدا ایسے کہ ہل جائے زمیں
اے کاروان خوش نگیں تم میں کوئی میرا دل نہیں
یا تم نے دیکھا ہو کہیں مدت سے ہوں میں منتظر
دیکھا نہیں کوئی خبر کہنا کہیں پاؤ اگر
وہ خستہ تن وہ نیم جاں جس کے ہر دل میں تم نہاں
پامال ہے مثل خزاں روتی ہے شب سے تا سحر
بیٹھی ہے تیری منتظر

---

(۱۲)

یہ سنتے ہی وہ قافلہ کچھ دیر ہنسنے لگا
ان میں سے اک سارس اٹھا پہلے رہا کچھ سوچتا
پھر جانے آئی دل میں کیا اُڑتا ہوا گرتا ہوا
قدموں پہ اس کے آگرا بولا مری قسمت پھری
مجھ سے مری دلبر ملی یہ کہہ کے آپس میں ملے
ایسے ملے ایسے ملے گویا یہ دونوں ایک تھے
بچھڑے تھے جیسے بہت سے پتھر کے ہیں کوئی بنے
تصویر مانی کی طرح خاموش تھے دونوں کھڑے
گھنٹوں یہی حالت رہی حرکت نہ تھی جنبش نہ تھی
جوگی کھڑا حیران تھا ان کو الگ کرنے لگا
دیکھا تو تھا اک لاش پر

منشی شیام موہن لال جگر

برسات

آئی برسات پھر جگر آئی — دیدہ و دل نے تازگی پائی
تیرہ و تار ابر چھایا ہے — کیا دھواں دھار ابر چھایا ہے
نیلگوں آسمان پہ بادل — ایسے پھیلے ہیں جس طرح کاجل
جھومتے فیل مست آتے ہیں — جوش مستی سے بڑھتے جاتے ہیں
لغزشیں چال میں ہیں مستانہ — کئے دیتی ہیں دل کو دیوانہ
دور سے یا کسی کے گیسو ہیں — خم بہ خم مشک بیز و دلجو ہیں
کبھی کھا کھا کے بل اُلجھتے ہیں — آپ ہی آپ پھر سلجھتے ہیں
پیچ در پیچ اُڑتے پھرتے ہیں — تہ بہ تہ آسماں پہ گھرتے ہیں
مست و مخمور ہو رہی ہے نظر — نشہ سا چھا رہا ہے نظر
ولولے بھر گئے رگ و پے میں — یہ کہاں بات نشۂ مے میں
برق ہے بے قرار دل کی — آفت ہے الفت ہوا دل کی
ڈھونڈھے لطف کہاں پائے — دل کو سمجھا سکے اب کہاں جائیں
ابر کہتا ہے ساقیا چل پھر سے — آسماں سے لگا دنیا کا پھیرا
ہیں کہ مجبور ہوں کہاں جاؤں — کھول دے غم جو ہے دل کو بہلا دے

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں — جھولا اشجار کو جھلاتی ہیں
جسم سے لگ کے رنگ لاتی ہیں — سر پہ بن کے گھٹا چھاتی ہیں

ڈار بگلوں کی اُڑتی پھرتی ہے	جھیل پر گاہ جا کے پڑتی ہے
ہے گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ کبھی	جیسے گیسو میں موتیوں کی لڑی
ہیں پھواریں کہیں کہیں جھالے	ندیاں ہیں کہیں کہیں نالے
کہیں بارش کی لگ رہی ہے جھڑی	کہیں کالی گھٹائیں سر پہ کھڑی
کہیں رم جھم کی لے سہانی ہے	کچھ عجب لوچ ہے روانی ہے
ہلکی ہلکی پھوار گرتی ہے	پاس ہے خوش گوار لگتی ہے
بڑھ رہا ہے سرور آنکھوں میں	شوق کا ہے ظہور آنکھوں میں
اُف رے اضطراب کا عالم	دل ہے یا ایک لرزش پیہم

موسلا دھار ہے کہیں پانی	جس سے برپا ہے ایک طغیانی
لگے اس پر ہوا نے زور کیا	رعد نے اور گرج کے شور کیا
کیسا ہیجان ہو گیا برپا	ایک طوفان ہو گیا برپا
یک بیک آسماں پہ تڑپی	خیر یا رب کہیں گری بجلی

لیے پھرتی ہے بادلوں کو ہوا	جیسے انساں کو خواہشِ دنیا
کبھی اُتر سے اُمڈ کے آتے ہیں	کبھی دکھن میں جا کے چھاتے ہیں
کبھی پورب میں شکل دکھلائی	کبھی پچھم میں چھاؤنی چھائی
ایک دم ایک جا قرار نہیں	ابر تیرا کچھ اعتبار نہیں

آسماں کا عجب نقشا ہے	رنگ ہر دم نیا بدلتا ہے
ہے ابھی تو کدورتوں سے صاف	ایک دریا ہے نیلگوں شفاف
وہ گھٹا آئی ابر گیا اُودا	وہ ہوا آئی سُرمہ پھیل گیا
صبح کو اور شام کو کچھ اور	کچھ عجب رنگ ہیں چرخ کے طور

شام کو چھائی جب شفق کی بہار — ہوگیا سارا آسمان گلنار
کیسا رنگیں فلک کا دامن ہے — آئینہ دار صحن گلشن ہے

پھوٹ نکلا حسن کوہ و صحرا میں — جھیل تالاب اور دریا میں
تر و تازہ ہرا بھرا سبزہ — لہلہاتا ہے جا بجا سبزہ
کس قدر دل ربا ہے ہریالی — ہے دلہن یا درخت کی ڈالی
کشش حسن سبزہ کا یہ اثر — جم گئی ہے نگاہ سبزے پر

بیل بوٹے نکھر گئے سارے — پھول ہیں یا ہیں کہ یا تارے
پھول شاخوں پہ جو رنگے ہیں — نیلے پیلے سے تو رنگ کے ہیں
تتلیاں اڑ رہی ہیں گلشن میں — رنگ کیا کیا ہے ان کے دامن میں
زرد ہے کوئی، کوئی عنابی — ہے سنہری کوئی، کوئی آبی
سینکڑوں رنگ ہیں کسی کے پر — جن پہ بکھرا ہوا ہے سودۂ زر
نرم و خوش رنگ تتلیاں ہیں یہ — یا گل تر کی پتیاں ہیں یہ
یا ادائیں ہیں مہ جبینوں کی — یا تمنا ہیں نازنینوں کی
ناچتی پھر رہی فضا میں ہیں — نہیں معلوم کس ہوا میں ہیں

ہر طرف ہیں سرور کے ساماں — شاد ہیں وحش و طیر و انس و جاں
کیسی کیفیتوں کا عالم ہے — حاصل زندگی یہ موسم ہے
جنگلوں میں جھنکار رہے ہیں مور — آہ کس کو پکارتے ہیں مور
دیکھ کر آسمان پر بادل — جھومتے ہیں فرط شوق سے بیکل
عاشقی کی ہوائیں پھرتی ہیں — مست ہو ہو کے رقص کرتے ہیں
نہیں آزاد ہوتے غیرت سے — ناچتے ہیں مگر محبت سے

کس غضب کی تڑپ صدا میں ہے　　درد سا بھر گیا فضا میں ہے
کتنی میٹھی ہے کوک کوئل کی　　قند ہے یا نبات کی ہے ڈلی
ڈالی ڈالی پہ شور کرتی ہے　　کیا حلاوت فضا میں بھرتی ہے
اُف پپیہے نے پی کہاں کہہ کر　　رگ جاں پر چلا دیا نشتر
جسم دل بن کے ایک زخم بنا　　ٹیس رگ رگ میں ہو گئی پیدا
جو لگاوٹیں تھیں آفتیں ہیں اب　　رنج و حرماں کی کثرتیں ہیں اب
تم ہو یا ایک سوزِ غم کا ساز　　ہر رگ و پے سے آ رہی ہے آواز

اے زندگی کہاں ہے تو؟　　میں بھی پہنچوں کہیں جہاں ہے تو
تجھ میں دل اور دل میں تو ہے پھر　　پھر بھی آنکھوں سے کیوں نہاں ہے تو
دور سے چاہتا ہے اپنی بہار　　فصلِ گل آگ وہاں جہاں ہے تو
ہے کبھی مدتوں کا پردہ دار　　آسماں آسماں کہاں ہے تو
پھر بھی آتا نہیں قرار مجھے　　دل میں ہر چند اک جہاں ہے تو
کتنے مرحلے جھیلا دیا تو نے　　کچھ عجیب چیز ہی کہاں ہے تو

ضبط کر ضبط کیوں بہکتا ہے
ہوش میں آ جگر کہاں ہے تو

پھاگن کا پہلا دن

نیلگوں ہے آسماں نکھرے ہوئے ہیں مرغزار
دل پہ چھائی جاتی ہے سرسوں کے پھولوں کی بہار
کھیت میں پھولی ہے السی یا رواں ہے جوئبار
کھل گیا ٹیسو تو جنگل ہو گیا لالہ نگار
حور جنت کی ہیں آنکھیں یا مٹر کے پھول ہیں

جو تماشائے بہار ہند میں مشغول ہیں

کس ادا سے ناز سے رک رک کے چلتی ہے نسیم
ہر قدم پر کیا ہی شوخی سے مچلتی ہے نسیم
عطر میں بس کر گلستاں سے نکلتی ہے نسیم
جاکے کھیتوں میں بنا پہلو بدلتی ہے نسیم
لہلہاتے ہیں اگر گل جھومتی ہیں بالیاں
پاس کے پھولوں کو جھک کر چومتی ہیں بالیاں

اجلی اجلی دھوپ ہے کرتی ہیں آنکھیں کسب نور
کیا طرب افزا درختوں میں ہے کلیوں کا ظہور
چہچہاتے ناچتے پھرتے ہیں شاخوں پہ طیور
گیت گاتی ہے فضا موج ہوا موج سرور
ذرہ ذرہ جوشش ہستی سے اف معمور ہے
نشۂ صہبائے دل سے مست ہے مخمور ہے

بور آیا آم میں کوئل بھی آئی لوٹ کر
پھر رہی ہے کوکتی اس شاخ سے اس شاخ پر
پی کہاں کہہ کر پپیہے نے وہ چھیڑا پر اثر
شوق سے بیتاب ہیں کیا آدمی کیا جانور
پیکر فریاد بن کر بولتا ہے کاگ یہ
یا فضا میں چھڑ گیا ہے درد دل کا راگ یہ

پپیہا اور پی کہاں

سامنے پیپل کی ٹہنی پر یہ بیٹھا آکے کون

دیتا ہے آواز کس کو دور سے چلا کے کون
نالہ کش ہے فرقت دلبر کا صدمہ پا کے کون
"پی کہاں" رٹتا ہے تنہائی سے یوں گھبرا کے کون
کون خار دشت وحشت ہے بے دامان ہوش
کس کی یہ آواز ہے غارت گر سامان ہوش
کس نے دل کی ٹیس کو اک آن میں چمکا دیا
کس نے اک دم آتش خاموش کو بھڑکا دیا
دفعتاً کس نے دل پر درد کو گرما دیا
کس نے کہہ کر "پی کہاں" اک بانگی تڑپا دیا
تو پپیہے! کیا ہے؟ اک درس فنا آموز ہے
پی کہاں تیری شرار برق ہستی سوز ہے
آمد فصل بہاری کی خبر دیتا ہے تو
مژدۂ ایام عشرت دم بدم دیتا ہے تو
سر کو سودائے جنوں سے مست کر دیتا ہے تو
جام دل کو بادۂ مستی سے بھر دیتا ہے تو
تیرے نغمے سے ہوا معلوم آغاز بسنت
پی کہاں سے آ رہی ہے صاف آواز بسنت
پی کہاں نے تو نے دامان ہوا کو بھر دیا
اک سرور روح پرور سے فضا کو بھر دیا
نشۂ صہبا سے ہر سو نشاط و صدا کو بھر دیا
کیف نے سے عرصۂ ارض و سما کو بھر دیا
اے پپیہے! ساقی خمخانۂ مستی ہے تو
پی کہاں کی لے سے سازِ نغمۂ ہستی ہے تو

صفحۂ ہستی پہ رنج و غم کی تو تحریر ہے
کاشفِ اسرارِ جانبازی تری تقریر ہے
تیری آوازِ فغاں اک نالۂ شبگیر ہے
اے پپیہے! تو سراپا درد کی تصویر ہے
قطرۂ اشکِ تمنا خونِ صد ارماں ہے تو
شہدِ امید و حسرت کشتۂ حرماں ہے تو

اپنے جسمِ ناتواں پر تجھ کو رحم آتا نہیں
دکھ سہے جب جان و دل لیکن تو گھبراتا نہیں
فصلِ گل میں اک نفس آرام تو پاتا نہیں
تجھ سے بے فریاد و بے شیون رہا جاتا نہیں
مشتِ پر ہستی تری اور اس پہ سوزِ فراق
پھونک دے تجھ کو نہ تپ سے گرمیِ سوزِ فراق

دوپہر ہو شام ہو یا رات ہو یا ہو سحر
چاہے وہ کوئی گھڑی ہو چین دے کوئی پہر
تیز آتش ہو کہ بارش سے ہوا ہو تیز تر
تجھ کو بادل کی گرج کا ڈر نہ بجلی کا خطر
نغمہ گفتار رہتا ہے تیرا پی کہاں کے واسطے
دل رہا ہے تجھ کو فریاد و فغاں کے واسطے

ہے زبانِ سوزِ دردِ دل کی ترجمانی کے لئے
چشمِ پُرنم سیلِ گریہ کی روانی کے لئے
سینۂ بریاں تپش ہائے نہانی کے لئے
زندگی تیری ہے سوزِ جاودانی کے لئے
بے قراری سے نگاہِ دیدۂ بسمل ہے تو

اضطراب اعضا میں ہے گویا خود اپنا دل ہے تو

کتنا حسرت خیز ہے ظالم ترا انداز درد
چسکیاں لیتی ہے رہ رہ کر تری آواز درد
مردہ دل کو ہے دم عیسیٰ ترا اعجاز درد
ہر نفس ہے صد صدا اور ہر صدا دمساز درد
نالۂ جاں سوز ہے آہ دل ناشاد ہے
تو پپیہے! شمع خلوت خانۂ فریاد ہے

سوختوں کی رہنما ہے تیری آواز فغاں
دردمندوں نے کیا ہے تجھ سے انداز فغاں
کاش اپنا یہ بھی کھل جائے ترا راز فغاں
نعرہ جو کھینچ کر نکالا ہے اعجاز فغاں
اے پپیہے! تو ہے خضر منزل دیوانگی
تجھ سے ہے پر نور شمع محفل دیوانگی

پی کہاں کی وہ صدائے دلکش اب آتی نہیں
تجھ سے میری روح اب اپنی غذا پاتی نہیں
تو ہے چپ تو کیا طبیعت تیری گھبراتی نہیں
پی کی یاد اب کیوں ترے دل پر ستم ڈھاتی نہیں
تیری فریاد و فغاں کی لے ہوا میں مل گئی
اک صدائے سوز تھی ساز فنا میں مل گئی

تنگ آ غیرت سے کے زیر زمیں نہیں آتا ہے تو
ہوک اٹھتی ہے تجھے دل میں تو جلاتا ہے تو
سوز پنہاں سے جگر میں آگ بھڑکاتا ہے تو
خود ہی اپنی آتش دل سے جلا جاتا ہے تو

دردِ دل تیرا نہیں منت پذیرِ احساں ضبط
پھونک ڈالا آہِ آتش بار نے سامانِ ضبط

پھر گھٹائیں اودی اودی آسماں پر چھا گئیں
پھر ترے سر پر بلائیں کالی کالی چھا گئیں
آ کے پھر بے چینیاں تیرے جگر کو کھا گئیں
اُڑ کے پھر ہوئیں دلِ مضطر ترا برما گئیں

پھر وہی رت ہے تری غارت گرِ سامانِ جاں
پی کہاں "پھر" پی کہاں "پھر پی کہاں" "پھر" پی کہاں

خوش نما ہے ابر و برق جلوہ بارِ آسماں
دل کشا ہیں آسماں پر نیلی نیلی بدلیاں
ہے بہت فرحت فزا کوئل کی یہ کو کو بھی ہاں
روح سب میں پھونکتا ہے تو یہ کہہ کر "پی کہاں"

کیفِ مستی بن کے ابر و باد میں شامل ہے تو
تو عروسِ فصلِ بارش کا پپیہے! دل ہے تو

ہو گئی کوئل بھی ہم آہنگ تیرے ساز سے
پتی پتی رقص کرتی ہے تری آواز سے
مست ہے خلقت تری دعوت نوا پرداز سے
بس یہ کیفیت نہیں طاری ترے اعجاز سے

کر رہے ہیں وجد دونوں کیا زمیں کیا آسماں
اُن فضائے جا پپیہے نغمہ سازِ فضا ہاں

آم کے باغات باغوں میں ہے تو بھولا نہیں
ابرِ غم میں گھر کے یار دتی سب کوئی تازہ نہیں
سننے والوں کے دلوں پر برچھیاں سی بن گئیں

ہو گئی بیزار قید جسم سے جانِ حزیں
کوک پرمانی ہے دل کو وہ آوازِ فغاں
جان کو سے جان سے [illegible] ڈھونڈتی ہے پی کہاں
رو رہا ہے آہ پھر پھر کر کسی کی یاد میں
درد ہے نالوں میں تیرے سوز ہے فریاد میں
جو ترا الفت بھر گیا ہے دلِ ناشاد میں
تو ہے اک عشق مجسم عالمِ ایجاد میں
اے پپیہے! مایۂ نازِ غمِ ہستی ہے تو
"پی کہاں" سے نغمۂ سازِ غمِ ہستی ہے تو
کس کے دردِ ہجر سے دل کو ستاتا ہے تو
کس کی [illegible] کی شدت آگ برساتا ہے تو
کس کے آزارِ محبت میں گھٹا جاتا ہے تو
کس کے غم میں ہر گھڑی خونِ جگر کھاتا ہے تو
تو پپیہے آہ کس کا کشتۂ بیداد ہے
[illegible] ہمہ تن نالہ و فریاد ہے
[illegible] تیرا سوز و گدازِ عشق ہے
کون وہ معشوق ہے جس سے نیازِ عشق ہے
کیا [illegible] فصلِ گل [illegible] سازِ عشق ہے
[illegible] دل نوازِ عشق ہے
جلوہ دکھلا کر [illegible] سے خدا [illegible] نہیں
[illegible] نہیں

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

بسنت کی بہار

دشت بنے ہیں گلستاں　　کھیت ہیں کشتِ زعفراں
دیکھئے آنکھ جس طرف　　خلد نگاہ ہے سماں
آج ہوئی ہے کائنات　　فیضِ بہار سے جواں
گل ہے کھلاتی کیا بسنت
زر ہے لٹاتی کیا بسنت

باغ نیا ہے بن نیا　　گل کا ہے پیرہن نیا
پتیوں کی پھبن نئی　　پھولوں کا بانکپن نیا
ہر کہیں ہے فضا نئی　　ہے گلِ کہن نیا
کیسی ہے جاں فزا بسنت
کیسی ہے دلربا بسنت

نشو و نما کا ذکر کیا　　ہو گیا ہر شجر نیا
برگ نئے ہیں گل نئے　　رنگ ہے سب بدل گیا
چہرۂ مہر پہ ہے　　نکلا ہے خطِ استوا
شان سے آئی ہے بسنت
دہر پہ چھائی ہے بسنت

پھول ہیں ساغرِ شراب　　غنچہ ہے قطرۂ حباب
روئے زمیں پہ ہر کہیں　　لٹتی ہے مزے کی شراب
حسن ہے اور فروغِ حسن　　کون و مکاں پہ ہے شباب

ماہ ناز ہے بسنت
حسن نواز ہے بسنت

دامن دشت و کوہسار — سونے سے بھر گئی بہار
کیوں نہ دوں رنگ چمن نے — غازۂ گل کا یہ نکھار
ہوگیا غنچہ ذرہ آج — غیرت نافۂ تتار

طرۂ حور ہے بسنت
رنگ گل طور ہے بسنت

لو وہ بسنت آگئی — قدرت حق دکھا گئی
آنکھوں میں بس گئی بسنت — دل کی کلی کھلا گئی
داغ کو باغ، باغ کو — رشک ارم بنا گئی

چار سو اور ہے کی بسنت
کیسی ہری بھری بسنت

طلوع سحر

قافلہ وہ ایک منزل آ بھی لشکر سحر
ہر پینگ شب نے بجانب کے دنیا کردی جبر
تبسم کے قاصد آئے غبار دل میں بیٹھو کر
ان سے صبا نے سن کے خبر کی وہ مخبر
ہر گوشیاں تھیں غنچوں میں سب رکھا کا انتظار
جو راست شوق ہوا مشرق سے آ نکلا نہ
آکر جو کی نسیم نے شوخی سے گدگدی
تو ہر کلی کی آنکھ دل جوش سے کھل گئی

بلبل کی جانب اس سے لطف نگاہ کی
کچھ دیکھ کر ادھر ادھر اک بار ہنس پڑی
تھی تاک میں نسیم وہیں پر کھڑی ہوئی
اس کی بدولت اس کی چمن میں ہنسی اڑی

چپکے سے کیا نسیم سحر نے سنا دیا
غنچوں کے دل کو فرط طرب سے کھلا دیا
باد سحر نے معجزہ اپنا دکھا دیا
شبنم کے چھینٹے دے کے چمن کو جگا دیا
غنچے بھی کھل کھلا کے گلستاں میں ہنس پڑے
انگڑائی لے کے سرو دو زانو ہوئے کھڑے

رنگ شفق سے تھا جو افق ملک زرنگار
یکمشت گل نے کیسہ زر کر دیا نثار
دلکش عروس باغ کا تھا حسن اور نکھار
صدقے ہزار جان سے تھی عندلیب زار
منہ شاہدان گل کے جو شبنم نے دھو دیے
سنبل کے بال بال میں موتی پرو دیے

چھایا ہوا تھا دہر پہ اک نور کا سماں
دھویا ہوا تھا آب رخ حور سے جہاں
انجم کا آسمان سے تھکا تھا کارواں
مہتاب کے بھی منہ پہ اڑی تھیں ہوائیاں
شب زندہ دار چرخ کا بھی رنگ فق ہوا
غالب ہر ایک رنگ پہ رنگ شفق ہوا

نکلا جو خیمہ سے لیے تیغ سلطان صبح

حاضر ہے سلام سے افسرانِ فوج
فوجِ شعاع ہے کہ جلودار ہے صبح
لہرا رہا تھا جبلِ فلک پر نشانِ صبح
ڈنکا ہوا طیورِ چمن کی صفیر کا
اک غل تھا آمدِ شہِ گردوں سریر کا
فوجِ شعاع کی ہوئی آمد کی جب دھوم
تو ہو گیا فلک سے ہوا لشکرِ نجوم
مشرق میں یوں ہوا جو شہِ خاور کا جب قدوم
آنکھوں پہ بڑھ کے سب نے قدم اس کے چوم چوم
اک دم میں شب کی تیرگی کافور ہو گئی
دنیا چمک کے اک کرۂ نور ہو گئی

لالہ پیارے لال شاکر میرٹھی

جنگل کی برسات

یہ نظر فریب منظر یہ فضائے برشگالی یہ نسیم روح پرور یہ گھٹا [illegible]
لب جو بہشت والی

یہ بہار سبزہ و گل یہ ادائے سرو پیچاں یہ صدائے رنگ بلبل یہ طیور زمزمہ [illegible]
یہ ہرے بھرے خیابال

کہیں مینہ کے ہیں جھالے کہیں بادلوں کے ہیں دل کہیں بھر رہے ہیں نالے کہیں [illegible]
کہیں کوکتی ہے کوئل

کہیں قمریوں کی کوکو کہیں موروں کی صدائیں کہیں پپیہا ہے پی کہو [illegible]
کبھی اٹھتی ہیں گھٹائیں

کہیں بگلوں کی قطاریں ہیں ہوائیں اونچی اونچی کہیں مینہ کی پھواریں [illegible]
کہیں بہہ رہی ہے کشتی

جو اچھل رہے ہیں چشمے تو تڑپ رہی ہیں ندیاں جو برس گئے ہیں جھالے [illegible]
ہے زمیں کا سبزہ زار

جو چٹک رہی ہیں کلیاں تو مہک رہا ہے سبزہ جو ہوا ہے عنبر افشاں [illegible]
کہ بہار ہے روح افزا

کنول کا پھول

یہ دلفریب ادائیں یہ شان دلربائی
یہ رنگ و بو یہ نزاکت یہ حسن و رعنائی

سحر کو یہ روح گلگوں پہ غازہ آرائی
فضائے آب میں شب تو طلسم یکتائی
شفق میں رنگ ہے شعلے میں ہے ضیا تیری
نظر فریب ہے ہر رنگ میں ادا تیری
شراب ناب سے گلگوں ہے جام شوق ترا
زمانہ طالب مشرب مدام شوق ترا
ہر ایک غنچۂ دل میں ہے تلاطم شوق ترا
لب نسیم سحر پہ پیام شوق ترا
بہار حسن کا چھوٹا سا اگر چمن ہے تو
نہیں ہے گل کوئی پھولوں کی انجمن ہے تو
تو وہ چراغ ہے جس کو فروغ آب میں ہے
غضب کا سحر تری چشم نیم خواب میں ہے
عجب بہار ترے حسن لاجواب میں ہے
نہ یاسمن میں نزاکت نہ یہ گلاب میں ہے
ہر ایک پھول سے انداز ہے جدا تیرا
کہ دل نشیں ہے عجب رنگ پر فضا تیرا
بہار عشوۂ فردوس تو ہے پانی میں
طلسم جلوۂ صد رنگ تو ہے پانی میں
فروغ رنگ سے شعلہ تو ہے پانی میں
ہر ایک پھول کی تو آبرو ہے پانی میں
چمن میں لالہ و گل کو ہے آرزو تیری
یہ شبنم تر کو ہے جستجو تیری

عجب نشاط فزا ہے شراب ناب تیری
بلائیں لیتا ہے ہر صبح آفتاب تیری
کلید حسن ہے رعنائی شباب تیری
کتاب عشق کا شیرازہ ہے کتاب تیری
مئے نشاط سے گلگوں ہے ہر ورق تیرا
مگر جریدۂ افسوں ہے ہر ورق تیرا
تجلیاں ہیں تیری زیر آب شعلہ فروش
کہ آفتاب ہے زیر سحاب شعلہ فروش
فروغ مے سے ہے حسن شباب شعلہ فروش
مگر ہے آب میں رنگ شراب شعلہ فروش
ہوا ہیں یا ہے کوئی تو ترانۂ خاموش
فسون ناز کا ہے یا فسانۂ خاموش
لب نسیم سحر پر ہے گفتگو تیری
کشاں کشاں لئے پھرتی ہے جستجو تیری
ہزار دل سے ہے بو نسیم کو آرزو تیری
کہ مست رکھتی ہے صہبائے مشکبو تیری
فضائے آب میں سرمست جام ہے تیرا
شہید لذت شراب مدام ہے تیرا
ترے چراغ پہ پروانہ وار گرتا ہے
دفور شوق سے بے اختیار گرتا ہے
بلائیں لیتا ہے ہو کر نثار گرتا ہے
قریب آکے ترے بار بار گرتا ہے

یہ بیخودی، یہ پروں کی تپش، یہ سرعتِ شوق
ذرا سے کیڑے میں ہے کس بلا کی وسعتِ شوق
یہ دھیمی دھیمی فغاں اور یہ ناشکیبائی
یہ جوشِ دردِ محبت، یہ نالہ فرسائی
یہ آستاں پہ ترے شوق کی جبیں سائی
یہ تیرے کنج میں دن بھر نسیم پیمائی
سوادِ شب میں بھی دُھن ہے ترے شبستاں کی
مگر تلاش کسی کے ہے حسنِ پنہاں کی
خرابِ بادۂ الفت ہے آشنا تیرا
اسیرِ دامِ محبت ہے مبتلا تیرا
رگِ جنوں میں ہے نشترِ خلش فزا تیرا
فدا نما ہے مگر حسنِ خود نما تیرا
جگر کا داغ ہے روشن چراغ سے تیرے
مئے ازل کا ہے طالب ایاغ سے تیرے

تیتری

یہ تیری ادائے دلکش یہ تیرے پروں کی تزئین
تو مگر چمن کی دلہن اری چھوٹی تیتری ہے
یہ تیرا نقابِ گلگوں یہ تیری ردائے رنگیں
تو گلوں کی زیب و زینت تو بہار کی پری ہے

تو چمن میں جو کلی ہے یہ ہزار دل ربائی
کہ ہوا پہ اُڑ رہا ہے کوئی نقش سحر و فسوں
ہے مگر عروس رعنا کوئی مست خود نمائی
یہ ترا پیالہ زریں یہ تری شراب گلگوں

کوئی لعبت پری رو لب جو ہے گل بداماں
کوئی حور رقص شعلہ ہے گلوں کی انجمن میں
زر گل اُڑاتی پھرتی ہے نسیم عنبر افشاں!
ہے مگر شفق کا ٹکڑا کوئی جلوہ گر چمن میں

ترے روئے لالہ گوں سے ہے گلوں کا رنگ تازہ
ترا حسن تماشا سے ہے طلسم خود نمائی
ترے گورے گورے گالوں پہ ہے سرخ سرخ غازہ
ترے ننھے ننھے بازو ہیں فسون دلربائی

نہ فروغ آتش گل نہ بہار رنگ و بو ہے
نہ صدائے ساز ہے تو نہ سرود کا ترانہ
نہ جگر کا داغ ہے تو نہ شرار آرزو ہے
ہے بہار کا مگر تو کوئی منجمد ترانہ

بط سے نے ہے نکالا کوئی دلفریب شہپر
رگ برگ گل سے اُچھلا ہے مگر شرارہ کوئی

کوئی صیدِ زخم خوردہ ہے تڑپ رہا زمیں پر
کہ ہوا میں اڑ رہا ہے دلِ بے قرار کوئی

ترے ننھے ننھے ہونٹوں کو بہار چومتی ہے
ہے ترے پیرہن کی رنگت سے انبساط افزا
جو لچک رہی ہیں شاخیں تو نسیم جھومتی ہے
کہ تری شراب گلگوں ہے عجب نشاط افزا

ہے تری نظر فریبی پہ تری ادائے دلجو
یہ فضائے لالہ و گل یہ بہار سرو و ریحاں
ہے چمن کی شاہزادی اری چمپئی تیتری تو
کہ ہوا میں اڑ رہا ہے ترا طرۂ زرافشاں

برکھا رُت

وہ فصلِ عیش پرستوں کی جو ہے جانِ نشاط
پھر آ رہی ہے لئے ساتھ کاروانِ نشاط
جلو میں ابرِ سیہ کے ہے ہاتھیوں کی قطار
نشانِ برق سے گردوں پہ اٹھ رہے ہیں شرار
ہیں دلفریبیِ قدرت کے کچھ عجب انداز
صدائے ساز ہے گرنائے سبک کی آواز
گھٹائیں دوڑ رہی ہیں ہوا میں مستانہ
ہوا [illegible] ہے گویا جلوسِ شاہانہ

کنول سے سرخ ہیں بادل کہیں شفق آلود
گھٹا فلک پہ کہیں سرمگیں کبود کبود
زمیں پہ جھک کے بڑھتے ہیں بوجھ سے بادل
کہ دوش ناز پہ پانی کی ہے گراں چھاگل
خرام ناز سے یوں چل رہے ہیں جھک جھک کر
رواں چمن میں ہو جیسے نسیم رک رک کر
عجیب نغمۂ دلکش سنا رہی ہے گھٹا
کہ بین قوس قزح کی بجا رہی ہے گھٹا
اور اس پہ برق کا دلکش چڑھا ہوا ہے تار
قریب ہٹ کے گزرتی ہے مینہ کی جو بوچھار
تو اس کے پردے سے دلکش صدا نکلتی ہے
غضب کی بانکی ترنم فشاں نکلتی ہے
چمن میں سبزۂ نوخیز پھوٹ نکلا ہے
زمیں پہ لوح زمرد کا سب کو دھوکا ہے
گلوں سے ہو کے یوں سرخ ہے کنار زمیں
کسی عروس کا آنچل ہو جس طرح رنگیں
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ لطف منظر شام
ہیں سبزہ زار میں طاؤس مست ذوق خرام
بہار ہے یہیں دلوں کو صدائے دلکش سے
زمیں پہ رقص کناں ہیں ادائے دلکش سے
برس گئے ہیں جو صحرا میں مینہ کے جھالے
بھر گئے ہیں کناروں سے دشت کے نالے
عجیب بوقلموں سے فضا نے باندھا پل

ہرا بھرا نظر آتا ہے دور تک جنگل
یہ کالی کالی گھٹائیں یہ شب کی تاریکی
فضائے عرش میں ہے عکسِ غضب کی تاریکی
اُچھالتے اب نہیں گردوں پہ ڈوب کر تارے
فلک پہ اب کہیں آتے نہیں نظر تارے
خروشِ چرخ ہے یہ رعد کے یہ نالوں کا
دھڑک رہا ہے کلیجہ پری جمالوں کا
تلاشِ شہد میں ہیں مکھیاں سبک پرواز
مگر مزاج میں یہ سادگی کے ہیں انداز
کہاں چھپے کہیں کہیں آتے ہیں جب نظر طاؤس
فضائے دشت میں پھیلائے بال و پر طاؤس
ترانے گاتی ہوئی جب لہر سی آتی ہے
کنول کے پھولوں کے دھوکے میں بیٹھ جاتی ہے
رواں ہیں کوہ کے دامن میں خوشنما جھرنے
کہ محوِ رقص ہیں پانی کے جا بجا جھرنے
بہار سبزۂ گل سے جو سبزہ زاروں میں
تو دل فریب کیا قدرت نے کوہساروں میں
غضب کے موج فزا ہیں نسیم کے جھونکے
کہ موجِ آب بناتے ہیں نسیم کے جھونکے
نہا کے مینہ کے قطروں میں جب نکھرتے ہیں
زمیں پہ ابر سے ٹکرا کے جب گزرتے ہیں
یہ کیتکی کے درختوں کے پاس تھمتے ہیں
تو جھوم جھوم کے سر شاخ کے ہلاتے ہیں

فضائے دشت کا منظر ہے دید کے قابل
ادائے حسنِ گلِ تر ہے دید کے قابل
کہیں کرم کے درختوں پہ چھا رہی ہے بہار
ہرے ہرے کسی جانب ہیں نیم کے اشجار
شمیمِ گل سے معطر ہوا کے جھونکے ہیں
کہ موجِ بوئے گلِ تر ہوا کے جھونکے ہیں
یہ اودی اودی گھٹائیں یہ جوشِ ابرِ بہار
سکوتِ شام میں قوسِ قزح کے نقش و نگار
کرم کے پھولوں کے دلکش کہیں مناظر ہیں
تو کیتکی کے کہیں دل ربا مظاہر ہیں
عجیب بہار کا عالم ہے انبساط فزا
کہ لب پہ دشت کے ہے خندۂ نشاط فزا
نہ وہ تپش ہے، نہ خورشید کی تمازت ہے
نسیمِ سرو میں جاں بخش اب لطافت ہے

Ro Stol

(1 Librarary (N)

The

J & K University,

Amarsingbagh, Hazratbal,

Srinagar - 6. Kmr.